خیبر پختون خواہ کے پہلے وزیر اعلیٰ کا سنسنی خیز قتل

اُردو ڈائجسٹ

مارچ ۲۰۲۰ء

www.urdudigest.pk

urdudigest.pk

انسان کا کمزور ہوتا مدافعتی نظام

جراثیمی جنگوں کی تاریخ

عالمی کارپوریشنز کا انسانیت سے کھلواڑ

دنیا بھر میں دہشت کی علامت بن جانے والی وبا

ہم جتنا گہرائی میں جاتے ہیں

حقیقت کیا ہے؟

سچائی کو اتنا ہی دور پاتے ہیں

Pakistanipoint

دنیائے اسلام کے بطلِ جلیل

سائنس داں جنہوں نے اہلِ مغرب کا دامن
اپنی دریافتوں سے بھر دیا

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

اُردو ڈائجسٹ

مارچ 2020ء
رجب المرجب 1441ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 3

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر: کاشف شہزاد
کمپوزر: رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707

پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں
بیرون ملک 100 80 امریکی ڈالر اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں

G-III, 325 جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع وناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

یہ یکم دسمبر 2019ء کی بات ہے جب نئے کرونا وائرس سے جنم لینے والی وبا کا پہلا کیس سامنے آیا۔ یہ وبا پھر سرعت سے پھیلی اور خوف ودہشت کی علامت بن گئی۔ اب تک پاکستان سمیت 46 ممالک میں 81 ہزار سے زائد مرد وزن اس نئی وبا میں مبتلا ہو چکے۔ ان میں ڈھائی ہزار سے زیادہ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایران میں قم سے وبا کا آغاز ہوا۔ حفظ ماتقدم سے کام لیتے ہوئے پاکستان نے ایرانی سرحدی شہروں پر ایمرجنسی نافذ کر دی۔ تاہم وہاں سے وائرس وطن عزیز بھی آ پہنچا۔ یہ ضروری ہے کہ وبا کی روک تھام کے لیے تمام اقدامات کیے جائیں۔ خدانخواستہ یہ پھیل گئی تو پاکستان میں تباہی مچا سکتی ہے۔ خصوصاً ماسک اور ادویہ بہ سہولت ملنی چاہئیں۔ خبر ہے کہ ماسک کا 400 روپے والا ڈبا وبا پھیلنے سے 2000 روپے کا ہو گیا۔ یہ عوام سے زیادتی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ کہ طبی سائنس کی تمام تر جدتوں کے باوجود ماہرین یہ دریافت نہیں کر سکے کہ نیا کرونا وائرس کیونکر وجود میں آیا۔ اسی لیے وہ ابھی تک پُراسرار نوعیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ایک امریکی مصنف، ڈین کونٹز کے ناول، ''دی آئیز آف ڈارک نیس'' (The Eyes of Darkness) کی بازگشت بھی سنائی دی۔ یہ ناول 1987ء میں لکھا گیا تھا۔ کہانی کے مطابق چینی شہر، ووہان کی لیبارٹری میں ایک حیاتیاتی ہتھیار تخلیق ہوا جس نے ایک امریکی ماں کے بیٹے کو مار ڈالا۔ مصنف نے تب ہتھیار کو ''گورکی۔400'' کا نام دیا تھا۔ تعجب خیز امر یہ کہ 2008ء میں ناول کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں حیاتیاتی ہتھیار کو ''ووہان۔400'' کا نیا نام مل گیا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے یا مصنف اس حقیقت سے واقف تھا کہ چین اور امریکا کی بائیولوجیکل لیبارٹریوں میں حیاتیاتی ہتھیاروں پر بھی تحقیق جاری ہے؟

کرونا وائرس بہرحال عالمی معیشت پر بم بن کر گرا۔ وجہ یہ ہے کہ تمام بڑے معاشی ممالک تجارت و کاروبار میں چین کے درآمدی و برآمدی سامان پر انحصار کرتے ہیں۔ وبا نے ہزارہا چھوٹے بڑے چینی

کارخانے بند کر دیے۔ وہاں کام ٹھپ ہونے سے عالمی معیشت بھی زوال کا شکار ہوگئی۔ پاکستان میں چینی درآمدات کی بندش سے موبائل و موٹر سائیکل کے آلات، ادرک اور دیگر اشیاء مہنگی ہوگئیں۔

دنیا بھر میں جب کرونا وائرس آفت ڈھا رہا تھا تو بھارت میں ہندو قوم پرستی کے جراثیم مسلمان اقلیت پر حملہ آور ہوگئے۔ اس بار مسلمانان دہلی ہندو غنڈوں کی وحشت اور دیوانگی کا نشانہ بن گئے۔ وہ پچھلے چند ہفتوں سے بڑی دلیری و بہادری کے ساتھ مودی سرکار کے مسلم دشمن قوانین ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس فساد میں پندرہ سے زائد مسلمان شہید ہو چکے۔ 23 فروری کی صبح بی جے پی کے مقامی لیڈر، کپیل مشرا نے دہلی کے علاقے جعفر آباد میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ یہ وہی انتہا پسند لیڈر ہے جس نے دہلی الیکشن کو پاکستان اور بھارت کی جنگ قرار دیا تھا۔ جلسے میں کپیل نے مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کر کے شرکاء کو اکسایا کہ وہ قانون شہریت کے خلاف احتجاج کرتے مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں پر ایسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے کہ 1947ء کے المناک واقعات کی تلخ یادیں تازہ ہوگئیں۔

بھارت میں ہندو مذہبی جماعتیں (سنگھ پریوار) پچھلے چالیس برس سے قوم پرستی کی ترویج کر رہی ہیں۔ لمحہ فکریہ ہے کہ ان کا پروپیگنڈا نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ آج بھارت میں کروڑوں عام ہندوؤں کی نفسیات بدل چکی اور وہ سنگھ پریوار یا باجپا (بی جے پی) کے لیڈروں ہی کو اپنا نجات دہندہ اور مسیحا سمجھنے لگے ہیں۔ وہ اب گاندھی اور نہرو کو اپنا ہیرو نہیں سمجھتے۔ یہ ایک بہت بڑی نظریاتی کایا پلٹ ہے جو بھارت میں ظہور پذیر ہو چکی۔ قوم پرستی متنازع نظریہ عمل ہے۔ دین اسلام میں بھی ایسی قوم پرستی کا کوئی وجود نہیں جو جنگجوئی، قومی احساس تفاخر اور دوسروں سے اعلیٰ و برتر ہونے کے جذبے پر مبنی ہو۔

بھارت میں مگر نریندر مودی، امیت شاہ، کپیل مشرا وغیرہ کی زیر قیادت کروڑوں ہندو اسی قوم پرستی کو اپنا چکے جو جنگجوئی اور شاونیت کی ترویج کرتی ہے۔ یہ قوم پرست لیڈر اپنے ہم مذہبوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے ہیں کہ کانگریسی لیڈر مسلمانوں کو ناجائز مراعات و سہولیات دیتے رہے ہیں۔ اب انھیں اصل مقام پر پہنچانے کا وقت آ پہنچا تاکہ ہندو قوم کو طاقتور اور ترقی یافتہ بنایا جا سکے۔ یہ عیاں ہے کہ بھارت کے حکمران طبقے کی مسلمانوں سے نفرت عروج پر پہنچ چکی۔ اس خطرناک صورتحال میں ضروری ہے کہ اہل پاکستان اپنے فروعی اختلافات پس پشت ڈال کر متحد و یکجا ہو جائیں۔ ہم صرف اسی طرح معاشی و عسکری طور پر اپنے سے کہیں زیادہ قوی دشمن کا بخوبی مقابلہ کر سکیں گے۔

رواں ماہ ہم قرارداد پاکستان کی "80 ویں" سالگرہ منا رہے ہیں جس نے مسلمانان ہند کو ایک آزاد و خودمختار وطن کی نوید سنائی تھی۔ اپنے بزرگوں کی عظیم الشان قربانیوں کے باعث ہی آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ مسلمانان بھارت پر جنونی ہندوؤں کا لرزہ خیز ظلم ہمیں یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ ہمیں اپنے پاکستان کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے۔ ہمارا وطن مسائل کی دلدل میں پھنسا ہے لیکن یکجہتی کی قوت ہمیں تمام مشکلات و مصائب سے نجات دلا سکتی ہے۔ بقول شاعر مشرق:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن درپیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
تقدیر امم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھئے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

مارچ 2020ء

کچھ اپنی زبان میں

شاطر ٹرمپ کا دورۂ بھارت 11

اسلامی زندگی

جن سے گھر میں خیر و برکت... 162
اسوۂ حسنہ کی روشنی میں ضعیفوں سے حُسنِ سلوک

حضرت عمر فاروقؓ کا انصاف... 53
عفو درگزر و ایفائے عہد کا ناقابلِ فراموش واقعہ

خدمتِ خلق کی زندہ جاوید مثال... 13
مرحوم نعمت اللہ خان کی منفرد آپ بیتی

طب و صحت

ساحلوں کا جادوئی پھل... 57
ان گنت بیماریاں کافور کرنے والا آسمانی تحفہ

خصوصی گوشہ

کیا حیاتیاتی ہتھیار نے چین کو نشانہ بنایا؟... 16
دو ہزار سے زائد انسان چل بسے

انسان کا کمزور ہوتا مدافعتی نظام... 30
"سبز" انقلاب سے جنم لیتی تبدیلیاں

حیاتیاتی جنگ و جدل کی تاریخ... 35
لاٹھیوں سے ہونے والی جنگوں کا نیا روپ

دنیا کی بدنام ترین کارپوریشن... 38
مغربی کمپنی نے مسیحائی کو بدنام کر ڈالا

مزاح

بیوی کی ڈوٹی چھوڑ ہڑتال... 64
ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز اُجاگر کرتا قصہ

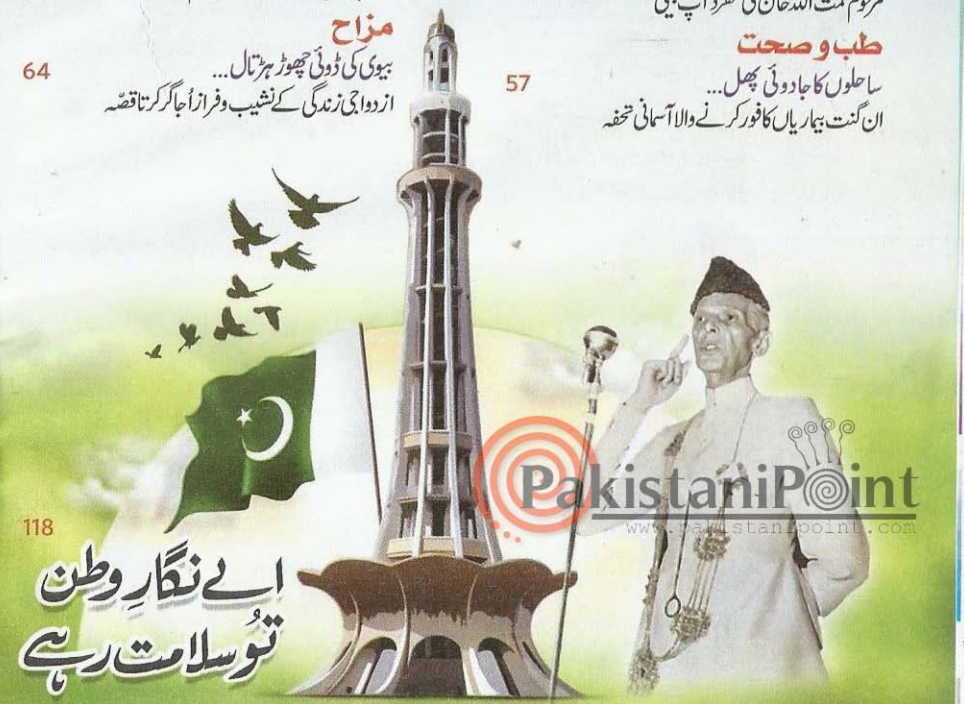

118 اے نگارِ وطن تُو سلامت رہے

PakistaniPoint www.pakistanipoint.com

مرنے کی دعائیں... انتظارِ مرگ میں بیٹھے مرد و زن کے لیے خوش خبریاں 93

کھیل کھلاڑی

ریورس سوئنگ کا موجد... تیز و تند طبیعت سے ہلچل مچا دینے والا کھلاڑی 68

سچے واقعات

شیام اور پُشپا کی عجب کہانی... اس نے دو بچھڑے پنچھیوں کو یکجا کر ڈالا 72

میں خود کو معاف نہیں کرسکتا... موت و حیات کی کشمکش کا ڈراما 167

اسلامی سائنس

دنیائے اسلام کے بطلِ جلیل... نامور مسلم ماہرین کا ذکرِ خیر 80

بدیسی ادب

سوچا تھا کیا... کوتاہی گھر آئی کاشمی کو رفو چکر کرنے کا سبب بن گئی 49

محبت اس کو کہتے ہیں!... عجب مخمصے میں گرفتار ایک شوہر کا دل نواز فسانہ 84

آخری شرط... ایک ذہین وکیل کا عجب فسانہ 106

کیبن نمبر 24 کا مسافر... پولیس سے شاطر چور کا دامن پکڑا نہ جاسکا 122

انکشافات

پیر علی راشدی نے جب جعلی اپوزیشن کا ڈراما رچایا... سیاست کی نیرنگیاں 87

فنون لطیفہ

بالی وڈ کا شریف النفس گلوکار... جو عالمی شہرت یافتہ ہستی بنا 213

فلمیں جن کا اختتام ذہن گھما دے... آخری لمحات تک تجسس و بے چینی 96

جرم و سزا

ڈاکٹر خان صاحب کا قتل... ہنگامہ خیز کیس کی سنسنی خیز داستان 99

ریورس سوئنگ کا موجد 68

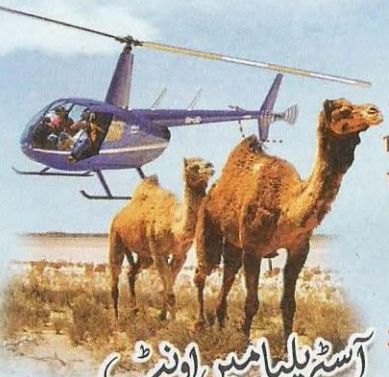

آسٹریلیا میں اونٹ مصیبت بن گئے 45

145

دیوارِ چین

انسانی عزم کا شاہکار

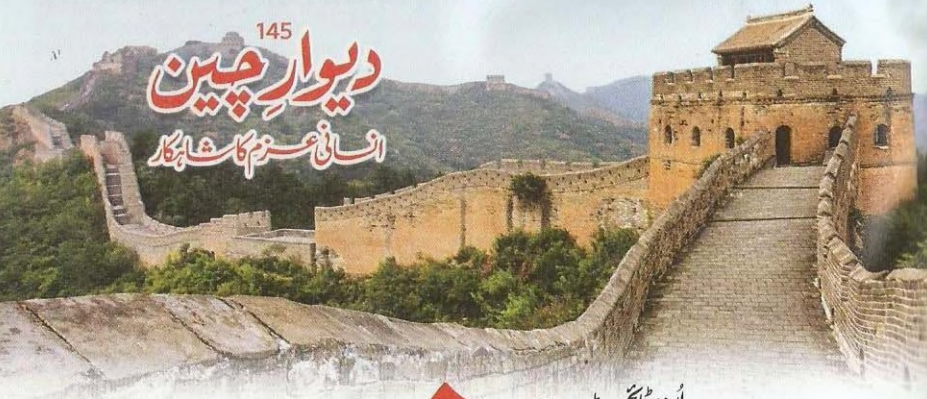

یادِ رفتگاں
قائد کے سچے ترجمان ... 110
منفرد محقق و مورخ کا دلنشیں تذکرہ

یومِ پاکستان
اے نگارِ وطن، تُو سلامت رہے... قراردادِ لاہور کا مفہوم و مقصد 118

تاریخ عالم
جب مٹھی بھر مسلمانوں نے رومی ٹڈی دل کو پچھاڑا... ایک یادگار جنگ 205

قدیم مصر کے عجائبات... 130
جب ایک اوّلین تہذیب پروان چڑھ رہی تھی

سیر و سیاحت
دیوارِ چین انسانی عزم کا شاہکار... چین کا دلچسپ و پُرتاثیر سفرنامہ 145

اُردو ادب
سنہرا ناتا... حیوان سے الفت کی یادگار کہانی 113

جاگتی آنکھوں کا خواب... حسّاس نوجوان کی دل چھو لینے والی کتھا 154

جیدا گاؤں نہیں گیا... ایک جوڑے کی عام ڈگر سے ہٹی دل پذیر کتھا 201

فکاہیہ
میں صرف پتی ہوں... نٹ کھٹ بیگم کا شوخ و شنگ ماجرا 158

شعر و شاعری
بہار آئی تو لوٹ آئے خواب سارے... نو بہ نو موضوعات سے سجا کلام 171

کیرئیر راہنمائی
سی ایس ایس کا امتحان... نوجوانوں کے لیے مفید مشورے 177

معاشرتی کہانیاں
ماتمِ دُنیا... احساسِ ذمہ داری نے اسے نیم دیوانہ بنا چھوڑا تھا 180

دریا میں ڈال... جو ظاہر میں نظر آتا ہے، کبھی کبھی ویسا ہوتا نہیں 140

آپ بیتی
سفارشیوں کے نرغے میں... بوالعجب انسانوں کی کتھا 42

حالاتِ حاضرہ
آسٹریلیا میں اونٹ مصیبت بن گئے... 45
یہ جانور کبھی انسان کا مددگار تھا

انشائیہ
دسترخوان کی مدح میں!... 185
ایک دیرینہ ثقافتی ورثے کی داستان الم

مستقل سلسلے
مایوسی کا علاج ہنسی 179
تبصرہ کتب 192
چمنِ خیال 194

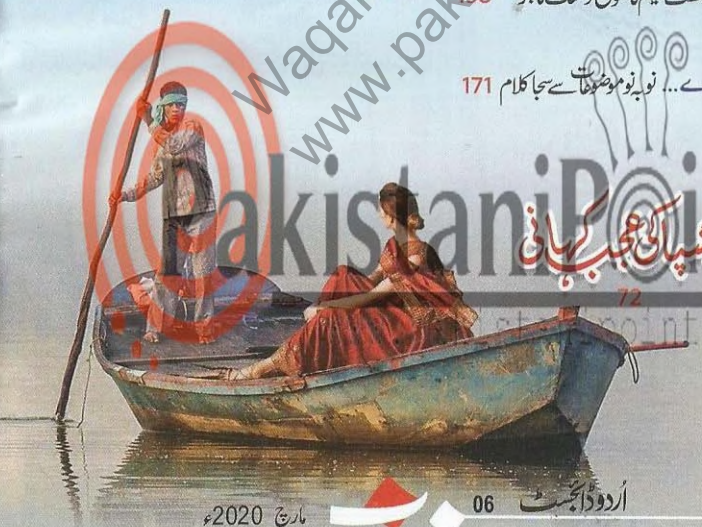

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com
PakistaniPoint

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

خاندان

☆.....(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح مال خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو چاہو خرچ کرو لیکن جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق کو دو یعنی) ماں باپ کو پھر قریب کے رشتے داروں کو پھر یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں کو دو جو بھلائی تم کرو گے، اللہ اس کو جانتا ہے۔ (البقرہ۔215)

☆.....اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں، محتاجوں، رشتے داروں، ہمسائیوں، اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں)، مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں، سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور تکبر کرنے والے اور بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ (النساء۔36)

☆.....اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔ (الفرقان۔54)

☆.....اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے تھے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھی اور کسی پیغمبر کے اختیار کی بات نہ تھی کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی آئے۔ (الرعد۔38)

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان

احسان

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کسی نے میرے امتی کی کوئی حاجت اس کا دل خوش کرنے کے لیے پوری کردی، تو اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا، اس نے میرے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا جو بندہ بے شوہر والی اور بے سہارا کسی عورت اور کسی مسکین حاجت مند کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتا ہے، وہ اجر و ثواب میں اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہو اور اس شب بیدار بندہ کی طرح ہے جو رات بھر نماز پڑھتا ہے اور نہ تھکتا ہو اور اس دائمی روزہ دار کی طرح ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی احسان کی کسی صورت اور کسی قسم کو بھی حقیر نہ سمجھے پس اگر اپنے بھائی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ پائے، تو اتنا ہی کرے کہ شگفتہ روئی کے ساتھ اس سے ملاقات کرے اور جب تم گوشت خریدو یا ہانڈی پکاؤ، تو اس میں شوربا بڑھا دیا کرو پھر چمچہ بھر اس میں سے اپنے پڑوسی کے لیے بھی نکالا کرو۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

شاطر ٹرمپ کا دورۂ بھارت

امریکی صدر جو ایک سیاسی مدبر کے بجائے محض بزنس مینیجر لگتے ہیں، اُن کے دو روزہ دورۂ بھارت نے عجب عجب اچھنبوں، وسوسوں اور اندیشوں کو ہوا دی ہے۔ اُن کے دورے کا پہلا اچھنبا یہ تھا کہ وہ براہِ راست احمد آباد آئے جس کے ساتھ بھارتی مسلمانوں کی انتہائی دردناک یادیں وابستہ ہیں۔ بدقسمتی سے نریندر مودی گجرات کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور اُن کی اعانت سے بی جے پی نے دو ہزار سے زائد مسلمان زندہ جلا دیے تھے۔ اِس پر امریکا نے اُن کے داخلے پر پابندی لگا دی تھی، لیکن اُن کے مزاج سے گہری مشابہت رکھنے والے ڈونلڈ ٹرمپ برسرِ اقتدار آئے اور وہ اُس جلسۂ عام میں بھی شریک ہوئے جس میں امریکی نژاد بھارتیوں سے وزیرِ اعظم نریندر مودی نے خطاب کرنا تھا۔ صدر ٹرمپ نے اُن کی شان میں طویل قصیدہ پڑھتے ہوئے اُنھیں اپنا دوست قرار دیا۔ نریندر مودی کے 'مسلمانوں کے قاتل' کے خطاب کی یاد تازہ رکھنے کے لیے امریکی صدر پہلے احمد آباد لائے گئے۔

۲۴ فروری کو صدر ٹرمپ نے جو جچی تلی تقریر کی، اِس سے بھارت میں وقتی طور پر صفِ ماتم بچھ گئی جبکہ پاکستانیوں کے چہرے خوشی سے کِھل اُٹھے۔ ہمارے وزیرِ خارجہ نے مژدہ سنا دیا کہ پاکستان امریکی تعلقات کی نئی تاریخ طلوع ہو رہی ہے۔ بلاشبہ امریکی صدر نے اپنے ابتدائی کلمات میں ایک سماں باندھ دیا کہ پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے ہیں اور وزیرِ اعظم عمران خاں میرے دوست ہیں۔ وہ یہ بھی اعلان کر رہے تھے کہ پاکستانی قوم اور مسلح افواج نے دہشت گردی کے خلاف زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں جن کی بدولت جنوبی ایشیا میں امن، سلامتی اور استحکام کو فروغ حاصل ہوگا۔ بھارت کی سرزمین سے پاکستان کے حق میں امریکی صدر کی طرف سے تعریف اور توصیف کے یہ کلمات غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئے۔

ہماری قومی قیادت اِن کلمات سے یقیناً فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ چند باتیں اُبھر کر سامنے آ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان کا کردار اِس خطے میں حد درجہ مثبت ہے، دوسرا یہ کہ دہشت گردی کی کمر توڑنے اور مذہبی انتہا پسندی پر قابو پانے میں پوری قوم اور مسلح افواج سنجیدہ ہیں۔ تیسرا یہ کہ مسئلۂ کشمیر جو حلق کا کانٹا بنا ہوا ہے، اُسے حل کرنا ازبس ضروری ہے، چنانچہ امریکی صدر نے ثالثی کی پیشکش کا برملا اعادہ کیا۔ ایک طبقہ اِس نقطۂ نظر کا حامی ہے کہ صدر ٹرمپ نے بھارت کی سرزمین سے پاکستان کی تعریف میں بڑی فنکاری سے کام لیا ہے اور بیک وقت چند فوائد حاصل کرنے کی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کوشش کی ہے۔ ایک یہ کہ بھارت پر دباؤ رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ پاکستان کو خوش کر کے اس کی توجہ اُن اہداف سے ہٹائی جائے جو امریکا اس دورے سے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ تیسرا یہ کہ پاکستان کو یہ توقع رہے کہ امریکا اِس کی معاشی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں اہم کردار اَدا کر سکتا ہے۔

بھارتی دورے کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا، وہ پاکستان کے لیے گہری تشویش کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس میں پاکستان کو آٹھ دس تنظیموں کے خلاف ٹھوس اقدامات پر زور دیا گیا ہے اور اسے اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ اس کی سرزمین سے کسی ملک کے خلاف دہشت گردی کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ مشترکہ اعلامیہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ پاکستان ممبئی اور پٹھان کوٹ حملوں کے ذمے داروں کو انصاف کے کٹہرے میں لائے۔ لفظوں کے چند پھول پیش کرنے کے بعد صدر ٹرمپ نے ایک بھی ایسا اشارہ نہیں دیا جو مقبوضہ کشمیر اور بھارت اور پاکستان کے مابین حالات کو معمول پر لانے میں کارگر ثابت ہو سکتا ہو۔ مقبوضہ کشمیر میں لاک ڈاؤن کو چھے ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ نو لاکھ بھارتی فوج آزادی کے متوالے کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے، بچوں اور عورتوں کو بینائی سے محروم کیے چلے جا رہی ہے۔ صدر امریکا نے وزیرِاعظم مودی سے مقبوضہ کشمیر میں کرفیو اُٹھانے اور وہاں کے لوگوں کو سیاسی آزادیاں فراہم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ اِسی طرح شہریت کے متنازع قانون کے خلاف دہلی میں جو بغاوت کا عالم ہے اور ہر مذہب کے پیروکار اس بنیادی حقوق کے منافی قانون کے خلاف متحد ہیں، اُن پر صدر ٹرمپ کی موجودگی میں پولیس فورس، فسطائی درندے آگ، خون کی ہولی کھیلتے رہے اور اِن اندوہناک مناظر کے بارے میں صدر ٹرمپ نے آواز اُٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا یہ بھارت کا داخلی معاملہ ہے۔

امریکا جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی سیاسی، عسکری اور معاشی پیش قدمی کے سامنے بھارت کے ذریعے بند باندھنا چاہتا ہے، چنانچہ مشترکہ اعلامیے میں دفاعی سکیورٹی اور خلائی میدان میں تعاون کا دائرہ بہت وسیع کر دیا گیا۔ تین ارب ڈالر کی مالیت کا جدید ترین اور خطرناک ترین اسلحہ فراہم کیا جائے گا جس کے بعد بھارت ایک بڑی فوجی قوت بن جائے گا۔ یہ دفاعی طاقت پاکستان اور چین کے خلاف استعمال ہو گی۔ اس کے علاوہ لداخ اور کیرالہ میں دو رَصدگاہیں قائم کی جائیں گی جن کا مقصد چین، وسطی ایشیا اور چین کے جنوبی سمندر کی نگرانی ہو سکتا ہے۔ بھارت کو ایک ایسا ڈیفنس سسٹم فراہم کیا جائے گا جو دشمن کے میزائل کو فضا میں مار گرائے گا۔ شاطر صدر ٹرمپ نے بڑی چالاکی سے پاکستان کو محض خوشنما باغ دکھائے ہیں، جبکہ بھارت کو امکانات کے روشن اُفق عطا کر دیے ہیں۔ پوری قوم کو اپنی بہادر مسلح افواج کے شانہ بہ شانہ کھڑا رہنا اور خوش فہمیوں کے سحر سے آزاد ہو کر سفارت کاری کا ہنر بڑی ہوش مندی سے بروئے کار لانا ہو گا۔

الطاف حسن قریشی

نعمت اللہ خان

خدمتِ خلق کی زندہ جاوید مثال

میں یکم اکتوبر 1930ء کو اجمیر شریف میں پیدا ہوا۔ والد عبدالشکور خان ریلوے میل سروس میں کلرک تھے۔ میرے دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ساتویں جماعت میں تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد انھوں نے اسکول میں بچوں کو پڑھایا اور ہماری پرورش کی۔ میں نے میٹرک کا امتحان 1946ء میں پاس کیا۔ تحریک پاکستان میں بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرتے، نعرے لگاتے اور مسلم لیگ کے ترانے پڑھتے۔ 28 اگست 1947ء کو تنہا پاکستان آیا۔ کراچی میں پہلی رات فٹ پاتھ پر سو کر گزاری۔ کچھ عرصے بعد چھوٹے بھائی بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ لیاری میں جھگی ڈال کر رہنے لگا۔ جب والدہ اور بہنیں بھی آ گئیں تو مزار قائد کے قریب ایک جھگی میں رہائش اختیار کی جہاں پانی دور سے بھر کر لانا پڑتا تھا۔

میں نے طویل عرصے ایک کل وقتی ملازمت اور دو جز وقتی ملازمتیں کیں۔ 1949ء میں انٹر کیا، پھر بی اے اور اسلامیہ کالج سے ایم اے۔ اسی دوران ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا۔ میں سٹریٹ لائٹس میں پڑھا کرتا۔ ملازمتیں جاری رہیں۔ جامعہ کراچی سے صحافت میں ڈپلومہ کیا لیکن عملی صحافت میں قدم نہ رکھ سکا۔ 1958ء میں شعبہ انکم ٹیکس میں وکالت کی پریکٹس شروع کی۔ دفتر بنانے کے لیے ایک دوست سے پانچ ہزار روپے بطور قرض لیے۔ 1960ء میں شادی ہوئی۔ اہلیہ کا نام طاہرہ خان تھا۔ 1967ء میں نارتھ ناظم آباد میں انیس ہزار روپے میں پلاٹ خریدا۔ اس پر مکان بنا کر اہل خانہ کے ساتھ مقیم ہوا۔ کچھ عرصہ قبل مکان فروخت کر کے بچوں اور بچیوں میں وراثت تقسیم کردی۔ اللہ نے سات بیٹے اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔

نارتھ ناظم آباد میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہوا۔ اجتماعی ماحول سے وابستگی اپنے پسندیدہ کام، خدمت خلق انجام دینے کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ لیگل پریکٹس کے دوران یہ سلسلہ قدرے ڈھیلے ڈھالے انداز میں جاری تھا۔ تین چار احباب ساتھ تھے۔ کلائنٹس کو بھی آمادہ کرتا کہ کار خیر میں اپنا حصہ شامل کرو۔ دیکھتا تھا کہ مختلف ضرورت مند جماعت سے رابطہ کرتے۔ ڈاکٹر اطہر قریشی سے کہا، آپ کے پاس شادی بیاہ اور امداد کے سلسلے میں درخواستیں آتی ہیں۔ یہ مجھے دے دیا کریں۔ انکوائری کر کے سامان پہنچا دیا کروں گا۔ وہ بخوشی آمادہ ہوگئے۔

Abdul Azeem
www.pakistanipoint.com

صبح سویرے ایک گھر کے کشادہ کمرے میں بہت سی کرسیاں پڑی ہیں۔ خان صاحب وہاں بیٹھے آنے والوں سے مل رہے ہیں۔ نہ کوئی روایتی ڈرائینگ روم، نہ کوئی اور آرائشی اہتمام۔ کوئی اپنے علاقے کا مسئلہ لیے آیا اور کوئی تنظیمی کام لے کر۔ نعمت اللہ خان کی یہ بیٹھک صبح شام یونہی کھلی رہتی۔ کراچی میں ہنگامہ کھڑا ہوتا تب بھی فقیر کا ڈیرہ مرائح خلائق عام یونہی کھلا رہتا، نہ کوئی چوکی، نہ پہرہ۔ ان کی ہمت قابل دید تھی۔ ان تھک کام کرتے۔ سیکورٹی پہ مامور اہلکار اکثر کہتے، ہم تھک جاتے ہیں، لیکن خان صاحب رات دن کی مصروفیت کے باوجود کبھی تھکے نظر نہ آئے۔ اللہ نے انھیں خدمت خلق کے لیے پیدا کیا تھا، اور وہ ہمیشہ خلق کی بھلائی کے کام کرتے رہے۔ آج جماعت اسلامی کی الخدمت کے امدادی کاموں کا دائرہ کروڑوں افراد تک پھیلا ہوا ہے۔ دنیا الخدمت کی امانت و دیانت کی معترف ہے۔ بجٹ اربوں روپے کا ہے۔ کئی ملکوں میں امدادی سرگرمیاں جاری ہیں۔ یتیم اور بیواؤں کی امداد و پرورش میں اس کا نام بہت آگے ہے۔ الخدمت کا کام کیسے منظم ہوا؟ یہ بھی اس مرد درویش نعمت اللہ خان ہی کا لگایا پودا ہے جو آج برگ و بار لا رہا ہے۔ (عطا محمد تبسم کے مضمون سے اقتباس)

دیکھا دیکھی اہلیہ بھی ان کاموں کی جانب مائل ہوگئی۔ کاموں میں ہاتھ بٹانا، امدادی سامان پیک کرنا، سلیقے سے رکھنا اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ سلسلہ مختصر عرصے میں ایسا مستحکم ہوا کہ جماعت کے دیگر پروگراموں کی نسبت خلق خدا کی خدمت پر مبنی کام طبیعت کو بھانے لگے۔ ڈاکٹر اطہر قریشی نے مجھے شعبہ خدمت خلق کا علاقائی انچارج بنا دیا۔ تب شعبے کے تحت اجتماعی سرگرمیوں اور منصوبوں کا تصور نہیں تھا۔ شادی بیاہ اور انفرادی امداد ہی بنیادی مصروفیت تھی۔ درخواستیں آتی تو انہیں پڑھ کر مختلف ذرائع سے تصدیق کرتا۔ خود بھی معلومات کرتا۔ اطمینان کرنے کے بعد ممکنہ امداد فراہم کرتے۔

ایک بار نیو کراچی کے گھرانے سے شادی کے لیے امداد کی درخواست موصول ہوئی۔ ان کے گھر پہنچا تو عالم یہ تھا، بٹھانے کے لیے ایک جھلنگی چارپائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران پتا چلا، اگلے دن شادی ہے اور بچی کے سر پر رکھنے کے لیے ایک دوپٹہ تک نہیں۔ دل لرز کر رہ گیا۔ کچھ سامان، شادی کا جوڑا، اسٹیل چینی کے برتن، روزمرہ ضروریات کی کچھ چیزیں ساتھ لے گئے تھے۔ وہ حوالے کیا۔ 500 روپے نقد دے کر لوٹ رہا تھا کہ خیال آیا، معاشرے میں اس قدر محرومی ہے۔ کوئی ایسا میکنزم ہونا چاہیے کہ اس سے ضرورت مند بہتر انداز میں استفادہ کرسکیں۔ حکیم صادق امیر کراچی تھے۔ ان کے سامنے گذارشات رکھیں۔ انھوں نے جماعت اسلامی کراچی کا باقاعدہ شعبہ خدمت خلق قائم کر دیا۔ سرگرمیوں کی نوعیت وسیع ہوگئی۔

1974 میں خانہ حرم مکہ اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں جماعت اسلامی کی رکنیت کا حلف اٹھایا۔ یہ حلف پروفیسر غفور احمد نے لیا۔ میں سمجھتا تھا، کراچی کے مڈل کلاس عوام جو ایک جانب خوددار ہیں تو دوسری سمت اپنوں کے ستائے ہوئے ہیں، ان کی فلاح و بہبود کے لیے ایسے منصوبوں کا آغاز ہونا چاہیے جو زندگی کے سفر میں مددگار بن سکیں۔ یہ بات مشاہدے میں تھی کہ غریبوں کی بستی، اورنگی ٹاؤن میں سفید پوش طبقے کے لیے صحت کے حوالے سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ معمولی بیماری پر انہیں طویل سفر کرکے عباسی شہید اسپتال آنا پڑتا۔ 1974ء میں ایک ایکڑ رقبے کا پلاٹ خریدا گیا۔ ارادہ تھا کہ وہاں 200 بستروں کا اسپتال تعمیر کیا جائے۔ لیکن وسائل نہیں تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ راہ اس طرح آسان ہوئی کہ شعبہ خدمت خلق کے انچارج ڈاکٹر عبدالمجید ڈاؤ میڈیکل کالج میں لیکچرار تھے۔ ان کا ایک شاگرد سعودی عرب میں ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے عہدے پر فائز تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے اسپتال کے حوالے سے بات کی تو انہوں نے سعودی حکمران شاہ خالد سے ملاقات کروانے کا وعدہ کیا۔ میں، ڈاکٹر عبدالمجید اور چند افراد سعودی عرب پہنچے۔ افسوس ہمارے پہنچنے سے قبل شاہ خالد کا انتقال ہوگیا۔ نئے حکمران نے انتظامی مشنری کو تبدیل کر دیا۔ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ بھی کہیں آگے پیچھے ہوگئے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نعمت اللہ خان میدان میں اُترے تو چار سال کی مختصر مدت میں بلدیہ کراچی کا بجٹ 6 ارب سے بڑھ کر ریکارڈ 42 ارب تک پہنچ گیا سڑکوں پر پہلی بار 300 کے قریب بڑی گرین بسیں رواں ہوئیں۔ 18 ماڈل پارکوں سمیت 300 پارک اور 300 پلے گراونڈز از سرِ نو تعمیر ہوئے۔ طلبہ کے لیے 32 نئے کالج بنے۔ سرکاری سکولوں کا معیار اس قدر بلند ہوا کہ اے ون اور اے گریڈز کے طلبا کی تعداد 200 سے بڑھ کر 2000 تک پہنچ گئی۔ چھ کالجوں میں بی سی ایس پروگرام شروع ہوا تو طلبہ نہایت معمولی فیس دے کر آئی ٹی گریجویٹ بننے لگے۔ کے ایم ڈی سی فیز ٹو تکمیل کو پہنچا۔ ایف ٹی سی فلائی اوور مکمل ہوا۔ شاہراہ قائدین اور شاہراہ فیصل فلائی اوور کا افتتاح کیا گیا۔ لیاری ایکسپریس وے اور نارتھ بائی پاس جیسے میگا پراجیکٹس پر تیزی سے کام جاری رہا۔ سہراب گوٹھ فلائی اوور، قائد آباد فلائی اوور اور سب سے بڑھ کر کورنگی تک شاہ فیصل، ملیر ریور برج پر تعمیر کراچی پروگرام کے تحت کام کا آغاز ہوا۔ حسن سکوائر فلائی اوور، کارساز فلائی اوور اور غریب آباد انڈر پاس کا سنگ بنیاد رکھا۔ کلفٹن انڈر پاس پر کام کا آغاز ہوا۔ اسی عرصے میں کراچی کو پانی کی فراہمی کا عظیم منصوبہ کے۔ تھری شروع ہوا تو شہریوں کو کروڑوں گیلن پانی میسر آیا۔ بے شمار قلیل مدتی، درمیانی مدت کے اور طویل المدتی منصوبے تھے جو متعلقہ اداروں کو سونپ دیے گئے۔

کراچی کو امراض قلب کا جدید ترین سہولیات کا حامل دوسرا بڑا ہسپتال دیا۔ ورنہ کراچی کی بڑی آبادی کے لیے واحد امراض قلب کا ہسپتال ہی موجود تھا۔ شہری شدید پریشانی اور اذیت میں مبتلا تھے۔ اس ہسپتال کے قیام سے قبل کراچی میں امراض قلب کا شکار 70 فیصد مریض علاج میں تاخیر سے اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔

کراچی شہر میں ترقیاتی کاموں کا سیلاب آیا تو صدر پرویز مشرف نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ تعمیر کراچی پروگرام نعمت اللہ خان کا آئیڈیا ہے۔ اصل ہیرو وہی ہیں۔ حیرت انگیز ترقیاتی کاموں کا کریڈٹ انہی کو جاتا ہے۔ کراچی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو ان کا چرچا دنیا بھر میں ہونے لگا۔ ورلڈ گیزٹ ڈاٹ کام نے 2005 میں بہترین میئر کے مقابلے کے لیے پورے جنوبی ایشیا سے صرف نعمت اللہ خان کو شارٹ لسٹ کیا۔ چمکتا، مہکتا اور دمکتا کراچی ان کا خواب تھا جسے انہوں نے مجسم کر دکھایا۔ وہ تو رخصت ہوئے لیکن لیکن فرزندان شہر انہیں بھلا نہ پائیں گے۔ یہ ان کے کردار کا اجلا پن تھا کہ تاریخ میں پہلی بار ترقیاتی کاموں میں سب فریقین کو بلا امتیاز شریک کیا گیا۔

وفد خالی ہاتھ واپس لوٹ آیا۔ اسپتال کی تعمیر شروع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ وقت گزرتا رہا۔

1994ء میں ڈاکٹر فیاض عالم نے منصوبے کی طرف توجہ دلائی۔ پلاٹ پر الخدمت ایلو پیتھک ڈسپنسری اور جماعت اسلامی ضلع غربی کا دفتر بن چکا تھا۔ باقی حصے پر کئی فٹ گہرے گڑھے اور ان میں پانی بھرا تھا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ایک دم اسپتال کی تعمیر شروع کر دیتی۔ پہلے مرحلے میں صرف چار دیواری تعمیر کی گئی۔ احباب کا مشورہ تھا، ابتداً ڈائیگنوسٹک سینٹر بنایا جائے۔ فنڈز کے لیے باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اس موقع پر بہت سارے مخیر حضرات کے علاوہ حلقہ خواتین نے بہت تعاون کیا۔ برطانیہ کی ''مسلم ایڈ'' سے رابطہ ہوا۔ واسطی صاحب سربراہ تھے۔ انہیں اسپتال کی تعمیر کے متعلق تفصیلات بتائیں تو بخوشی تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ دو برس کے مختصر عرصے میں اسپتال کی عمارت وجود میں آ گئی۔ 1985ء میں غیر جماعتی الیکشن میں سندھ کی صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ اسمبلی میں کراچی کے حقوق کے لیے مسلسل آواز بلند کی۔ دسمبر 1991ء سے جولائی 2001ء تک جماعت اسلامی کراچی کا امیر رہا۔ الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کے صدر اور سرپرست کی حیثیت سے ذمے داریاں انجام دیں۔ اگست 2001ء سے اگست 2005ء تک کراچی کا پہلا سٹی ناظم رہا۔

☆☆

نعمت اللہ خان بلند فشار خون اور ذیابیطس جیسی بیماریوں میں طویل عرصے سے مبتلا تھے لیکن انہوں نے اپنی بیماریوں اور بڑھاپے کو کبھی کام کی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ خدمت خلق کا پیکر، کراچی سے محبت اور اسے بنانے سنوارنے والا عظیم انسان 25 فروری 2020ء کو دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

◆◆◆

www.paksociety.com

سیّد عاصم محمود

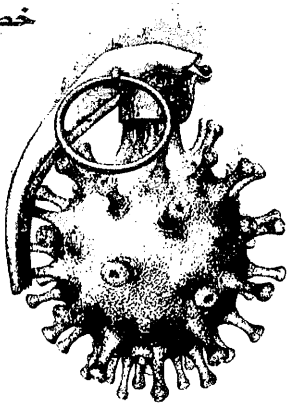

کیا حیاتیاتی ہتھیار نے چین کو نشانہ بنایا؟

Waqar Azeem pakistanipoint.com

دو ہزار سے زائد انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے والے نئے کرونا وائرس سے جڑے نوع بہ نوع نظریات کی دلچسپ و ڈرامائی کہانی

کہتے ہیں، ایک بار چین کے ممتاز فلسفی، کنفیوشس سے پوچھا گیا: "آپ کسی الوہی قوت پہ یقین رکھتے ہیں؟" جہاں دیدہ آدمی مسکرائے اور بولے: "بیٹا، اس قوت کو تو تم ہر جگہ کارفرما دیکھتے ہو۔ دنیا کے نظام قدرت ہی کو لو۔ ایسا نہایت نفیس، بڑھیا اور خوبصورت نظام عظیم ترین ہی تخلیق کرسکتا ہے۔ یہ معمولی کیڑے سے لے کر دیوہیکل جانوروں تک کی حفاظت کرتا ہے۔ صرف احمق ہی قدرتی نظام سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔"

یہ بالکل سچ ہے کہ انسان خلاف فطرت عمل کرے تو کبھی کبھی اس احمقانہ حرکت سے اپنی ہی نہیں دوسروں کی جانیں بھی خطرے

☆ برطانوی جرنیلوں نے ریڈ انڈین قبائل کو ہرانے کی خاطر کس بیماری کے جراثیم پھیلائے؟
☆ دوسری جنگِ عظیم میں امریکا نے کیونکر حیاتیاتی ہتھیار بنانے والا دنیا کا سب سے بڑا منصوبہ بنایا؟
☆ بھارتی سائنس دانوں نے کرونا وائرس کی جینیاتی ساخت میں ''ایڈز'' کی موجودگی کیسے دریافت کی؟
☆ چین کے سائنس دانوں نے کیونکر جانا کہ یہ نیا وائرس چینی شہریوں کو خاص طور پہ نشانہ بناتا ہے؟

میں ڈال دیتا ہے۔ نئے کرونا وائرس سے دنیا بھر میں پھیلی وبا ہی کو لیجیے جس نے ہزارہا انسانوں کو گور کنارے پہنچا دیا اور ان کی زندگیاں تباہ کر ڈالیں۔ اس کو جنم دینے میں جدید انسان کی خلاف فطرت سرگرمیوں کا ضرور حصّہ ہے۔

جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، تب تک ''کوویڈ نئے کرونا وائرس کی پیدائش کے سلسلے میں تین نظریات سامنے آچکے۔ اوّل یہ کہ اسے بعض جانوروں مثلاً چمگادڑ، سانپ یا پینگولین نے جنم دیا۔ دوم یہ کہ یہ ایک حیاتیاتی بم ہے۔ اس کو امریکا کی کسی لیبارٹری میں بنایا گیا۔ سوم یہ کہ یہ حیاتیاتی بم چین کی ایک لیبارٹری میں تیار ہورہا تھا۔ وہاں سے کسی طرح یہ فرار ہو کر شہریوں تک پہنچ گیا۔

شروع میں دوسرے نظریے کی تفصیل پیش خدمت ہے کیونکہ یہ انگریز ہیں جنھوں نے جدید دور میں حیاتیاتی ہتھیاروں کا باقاعدہ استعمال شروع کیا۔ امریکا میں یہ ہتھیار بننے کے دعوی کی بنیاد برطانوی استعمار کی تاریخ میں پوشیدہ ہے۔

جراثیم کا حملہ

یہ فروری 1763ء کی بات ہے، فرانس نے امریکا سے اپنی فوج واپس بلوانے کی ہامی بھر لی۔ اس زمانے میں سرزمین امریکا پر قبضے کے لیے یورپ کی دو بڑی طاقتوں، فرانس اور برطانیہ کے مابین جنگ جاری تھی۔ اس جنگ میں تیسرے فریق امریکا کے حقیقی باشندے، ریڈ انڈین تھے۔ تاہم جدید اسلحہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ یورپی طاقتوں کے لیے خاص خطرہ نہیں رہے۔

برطانوی جرنیل بڑے چالاک اور مکار تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے علاقے، بنگال میں میر جعفر کی صورت غدار ڈھونڈ لیے تھے۔ انھی غداروں کی مدد سے وہ نواب سراج الدولہ کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔ اب امریکا میں بھی انھوں نے ایک چال چلی۔ وہ یہ کہ فرانس کے خلاف ریڈ انڈین قبائل سے اتحاد کر لیا۔ یہ اتحاد کرتے ہوئے، انگریزوں نے ریڈ انڈینز کو یقین دلایا کہ جیسے ہی فرانسیسی فوج کو شکست ہوئی، وہ امریکا سے چلے جائیں گے۔ مقامی امریکی باشندوں نے ان کی بات پر یقین کر لیا۔

اس وقت ریڈ انڈین قبائل فرانسیسی فوج کے مددگار تھے۔ برطانوی جرنیلوں سے معاہدہ دوستی ہونے پر انھوں نے فرانسیسی فوج کی حمایت ترک کر دی۔ اس تبدیلی سے برطانوی فوج نے فائدہ اٹھایا اور فرانسیسی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی۔ فرانسیسی پھر وطن واپس چلے گئے مگر انگریز امریکا چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ انھوں نے تو اپنے طاقتور دشمن سے پیچھا چھڑانے کے لیے ریڈ انڈینز سے دوستی کر کے ایک چال چلی تھی۔

قربانی کا بکرا

جب انگریز بدستور امریکی سرزمین پر براجمان رہے، تو ریڈ انڈینز کو احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ انگریز جرنیلوں نے انھیں قربانی کا بکرا بنا کر اپنا مطلب حاصل کر لیا تھا۔ ان کی وعدہ خلافی سے ریڈ انڈین قبائل طیش میں آ گئے۔ انھوں نے پھر برطانوی فوج کے قلعوں پر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

انگریز ریڈ انڈینوں کو تحائف کی صورت چیچک کے جراثیم دیتے ہوئے

چڑھائی کر دی۔ قبائلی لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے برطانوی جرنیلوں نے ایک اور چال چلی۔ وہ ان سے گفت و شنید کرنے لگے۔ مدعا یہ تھا کہ برطانیہ سے مزید فوج آنے تک جنگ کو ٹالا جا سکے۔ بیچارے معصوم اور شریف ریڈ انڈین انگریزوں کی اس چال کو بھی نہ سمجھ سکے۔

مئی 1763ء میں جب فریقین کے مابین مذاکرات جاری تھے، تو برطانوی جرنیلوں نے ایک اور عیارانہ قدم اٹھا لیا۔ ایک بار قبائلی عمائدین ملنے آئے، تو انھوں نے ان کو دو کمبلوں اور ملبوسات کا تحفہ دیا۔ اس پر ریڈ انڈین سردار بہت ممنون ہوئے۔ ان بیچاروں کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ تحفے نہیں موت کے ہرکارے ہیں۔ ان تحفوں کی صورت وہ اپنے اور قبیلے والوں کے لیے موت کا سامان لے کر جا رہے ہیں۔

وہ کمبل اور ملبوسات دراصل چیچک کے جراثیم سے لت پت تھے۔ یہ انسانی تاریخ میں پہلا دستاویزی واقعہ ہے جب انسان نے دوسرے انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ''حیاتیاتی ہتھیار'' (Biological Weapon) کا استعمال کیا۔ برطانوی جرنیل اس طریق واردات سے ریڈ انڈینز قبائل میں چیچک کی بیماری پھیلانا چاہتے تھے تاکہ ان کی کثیر تعداد لقمہ اجل بن جائے۔

برطانوی جرنیلوں نے جیسا سوچا تھا، وہی انجام پایا۔ جلد ہی ریڈ انڈینز قبائل میں چیچک کی بیماری پھیل گئی۔ اگلے ڈیڑھ سال میں چار سے پانچ لاکھ ریڈ انڈین اس مرض کا نشانہ بن کر چل بسے۔ اتنی زیادہ اموات نے ریڈ انڈین لشکر کی کمر توڑ دی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح برطانوی فوج نے بڑی عیاری سے سرزمین امریکا پر قبضہ کر لیا اور وہاں مغربی استعمار کی بنیاد رکھ دی۔ آج برطانوی خود کو مہذب، انسان دوست اور جمہوریت پسند کہتے ہیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے امریکا میں بڑی دغابازی اور مکاری سے لاکھوں ریڈ انڈینز کا قتل عام کیا اور زبردستی ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

سرزمین امریکا میں انھی انگریزوں کی اولاد آباد ہوئی۔ انھوں نے پہلے تو پورے امریکا پر قبضہ کیا، مقامی باشندوں کو غلام بنا لیا اور پھر اپنے معاشی و تجارتی مفادات پورے کرنے کی خاطر بیرون ممالک پر بھی قبضے کرنے لگے۔ اپنے آپ کو طاقتور اور ناقابل تسخیر بنانے کی خاطر ہی امریکی حکمران طبقے نے حیاتیاتی ہتھیار بنانے کے منصوبے پر بھی کام شروع کر دیا۔

امریکا کا حیاتیاتی منصوبہ

پہلی جنگ عظیم کے دوران اگرچہ برطانوی حکمران طبقہ ہی خطرناک حیاتیاتی ہتھیار بنانے کی خاطر تگ و دو کرتا رہا۔ برطانیہ کی دیکھا دیکھی جرمن، جاپان اور اٹلی کے حکمران بھی اس جنگی شعبے میں کود پڑے۔ لیکن ان کی تحقیق و تجربات کا دائرہ محدود ہی رہا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، تو یہ امریکا ہے جس نے کروڑوں ڈالر کی لاگت سے حیاتیاتی ہتھیار بنانے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ نومبر 1942ء میں امریکی صدر، فرینکلن روزویلیٹ نے یہ منصوبہ شروع کرنے کی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

خصوصی گوشہ

جنوری 2020ء سے نئے کرونا وائرس (SARS-CoV-2) نے دنیا بھر میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ اسی وائرس نے اکیسویں صدی کی ایک مہلک ترین وبا کو بھی جنم دیا۔ سائنسی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک حیاتیاتی ہتھیار ہے جس نے امریکا یا چین کی حیاتیاتی لیبارٹری میں جنم لیا۔ امریکا کا مدعا یہ تھا کہ اپنے طاقتور حریف پر حملہ کر کے اسے ضعف پہنچا سکے۔ اس قسم کا پوشیدہ حملہ ''ففتھ جنریشن وار'' کہلاتا ہے۔ لیکن یہ چین کی حیاتیاتی لیبارٹری سے کسی باعث فرار ہوا تو یہ نہایت سنگین معاملہ ہے۔ یہ اجاگر کرتا ہے کہ حیاتیاتی ہتھیاروں پہ ہونے والی تحقیق و تجربات انتہائی خطرناک ہیں۔ تاہم نیا کرونا وائرس یہ تلخ سچائی بھی عیاں کرتا ہے کہ قدرت کے نظام میں انسانی مداخلت سے بھی نت نئے جراثیم، وائرس اور دیگر غیر مرئی نامیے انسانوں پر حملے کرنے لگے ہیں۔ نئے وائرس کا یہ حملہ جن چشم کشا پہلوؤں کو اجاگر کر گیا، ان پر ہم نے چار مضامین تیار کیے ہیں۔ یہ سبھی تحریریں ممتاز عالمی اخبارات، رسائل اور ویب سائٹس کی کئی تحقیقی و سائنسی رپورٹوں سے کشید کردہ ہیں۔ یہ نئے کرونا وائرس سے پیدا شدہ صورتحال کے مختلف حیران کن اور انقلابی پہلوؤں کا کماحقہ جائزہ پیش کرتی ہیں۔

منظوری دی۔

منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک نئے سرکاری ادارے ''وار ریسرچ سروس'' کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ منصوبہ انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ امریکی حکومت کو خدشہ تھا کہ عوام اُسے غیر انسانی اور غیر اخلاقی قرار دے کر اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ 1943ء کے موسم بہار میں امریکا نے حیاتیاتی ہتھیار بنانے کے لیے ایک لیبارٹری ''یو ایس آرمی بائیولوجیکل وارویئر لیبارٹریز'' قائم کر لی۔

یہ واضح رہے کہ حیاتیاتی ہتھیار ایسے جراثیم، وائرس، کائی، پھپھوندی وغیرہ سے تیار کیے جاتے ہیں جو انسانوں سمیت تمام جانداروں میں بیماری پیدا کرتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کا نشانہ ایک فرد یا پوری آبادی ہو سکتی ہے۔ آج بین الاقوامی قانون کے مطابق کسی بھی وائرس، جرثومے، کائی وغیرہ کو بطور حیاتیاتی ہتھیار استعمال کرنا ''دہشت گردی'' یا ''جنگی جرم'' کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دوران حیاتیاتی ہتھیار جنگ و جدل میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے تھے۔

یو ایس آرمی بائیولوجیکل وارویئر لیبارٹریز حیاتیاتی ہتھیاروں پر تحقیق و تجربات کی غرض سے بنائی گئی۔ اس تحقیق میں جلد ہی امریکی یونیورسٹیوں کے سائنس داں بھی شریک ہو گئے۔ 1943ء کے آخر تک منصوبے کے تحت چار مزید وسیع و عریض عمارات تعمیر کی گئیں۔ ایک عمارت میں حیاتیاتی ہتھیار بننے تھے۔ دوسری عمارت میں بیماریاں پھیلانے والے وائرس، جرثومے وغیرہ تیار کرنے کا بندوبست تھا۔ دیگر دو عمارات میں بننے والے حیاتیاتی ہتھیاروں کا تجربہ کرنا مقصود تھا۔ یوں امریکی حکمران طبقے نے اپنی سپر میسی ثابت کرنے کی خاطر بڑے پیمانے پر حیاتیاتی ہتھیار بنانے کے منصوبے کی بنیاد رکھ دی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

امریکا کی یو ایس آرمی بائیولوجیکل وارفیئر لیبارٹریز

حیاتیاتی ہتھیار جو بنائے گئے

1943ء سے 1969ء تک امریکی سائنس دانوں نے سات ایسے حیاتیاتی ہتھیار بنائے جو حریف کے علاقوں میں آباد لاکھوں انسانوں کو سات مختلف خطرناک بیماریوں میں مبتلا کر سکتے تھے۔ وہ بیماریاں یہ ہیں:

brucellosis, tularemia, anthrax
botulism staphylococcal, VEE, Q-fever
enterotoxin B

درج بالا حیاتیاتی ہتھیاروں کے علاوہ ایسی کئی بیماریوں پر تحقیق کی گئی جن کے وائرس یا جرثومے حیاتیاتی ہتھیار بنانے میں کام آسکتے تھے۔ ان بیماریوں میں چیچک، زرد بخار، طاعون، ڈینگی بخار، ٹائیفائیڈ اور بہت سے دیگر امراض شامل ہیں۔

یہ تمام بیماریاں انسانوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ امریکی سائنس دانوں نے ایسے حیاتیاتی ہتھیاروں پر بھی تحقیق کی جو گندم، چاول، باجرہ کی کھڑی فصلیں اور باغات تباہ کر دیں۔ نیز جانوروں کو موت کا شکار بنانے والے حیاتیاتی ہتھیاروں پر بھی تحقیق جاری رہی۔ غرض امریکی حکمران طبقے نے ہر وہ شعبہ ہائے زندگی ڈھونڈ نکالا جس میں حریفوں پر خطرناک حیاتیاتی حملے کیے جاسکیں۔

ہتھیاروں کا استعمال

مؤرخین لکھتے ہیں کہ امریکا نے 1952ء میں جنگ کوریا کے دوران پہلی بار حیاتیاتی ہتھیار استعمال کیے۔ ان کی وجہ سے چین اور شمالی کوریا میں عجیب بیماریوں کی وبا پھوٹ پڑی جس پر مشکل سے قابو پایا گیا۔ مغربی سائنس دانوں کی اکثریت اسے الزام قرار دیتی ہے۔ لیکن جاپانی ماہرین کی تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ امریکی حکومت نے جنگ کوریا میں حیاتیاتی ہتھیار حریفوں پر پھینکے تھے۔ ان کی وجہ سے ہی شمالی کوریا میں خصوصاً وبا پھیل گئی۔ اس کی لپیٹ میں آکر سیکڑوں کوریائی باشندے چل بسے تھے۔ ویت نام جنگ میں امریکی فوج نے حیاتیاتی ہتھیار نہیں اپنائے مگر حریف سے مقابلہ کرتے ہوئے کیمیائی ہتھیار ضرور برتے۔ خاص طور پر ''ایجنٹ اورنج'' کیمیکل ویت نام کی آبادی پر بے دریغ گرایا گیا جس نے چالیس لاکھ ویت نامیوں کو امراض میں مبتلا کر دیا۔ 1970ء کے بعد انسانی حقوق کی امریکی تنظیموں نے اپنی عوام پر آشکارا کیا کہ ان کی حکومت خفیہ منصوبوں کے تحت حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیار بنا چکی۔ اس انکشاف نے امریکا میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

امریکی حکمران طبقہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنے عوام سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ عوام سے حقائق چھپانے اور ان کو گمراہ کرنے کی ہر توڑ سعی کرتا ہے۔ عام امریکیوں کو جب علم ہوا کہ حکمرانوں نے خفیہ طور پر تباہ کن ہتھیار بنائے ہیں، تو وہ خاصے طیش میں آ گئے۔ انھوں نے پھر مطالبہ کیا کہ حیاتیاتی و کیمیائی ہتھیار بنانے کے منصوبے ختم کر دیے جائیں۔ عوام کے پُرزور اصرار پر امریکی حکومت نے تباہی خیز ہتھیار بنانے والے دونوں منصوبے ختم کر دیے۔ یہ 1970ء تا 1974ء کے عرصے میں ختم کیے گئے۔

امریکی حکمران طبقے پر الزام

امریکا کے مخالف ممالک مثلاً روس، چین، کیوبا وغیرہ کا مگر دعویٰ ہے کہ امریکی لیبارٹریوں میں چوری چھپے آج بھی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

یا تیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری جاری ہے۔ نیز نت نئے ایسے ہتھیار بنانے کی خاطر تحقیق و تجربات بھی ہوتے ہیں۔ حال ہی میں چین کے شہر، ووہان میں نیا کرونا وائرس دریافت ہوا تو خصوصاً کئی روسی ماہرین نے دعویٰ کیا کہ یہ امریکا کا ایجاد کردہ نیا حیاتیاتی ہتھیار ہے۔ رفتہ رفتہ بعض حالات اور واقعات نے اس الزام کو تقویت دے ڈالی۔

کرونا وائرس کی سات اقسام ہیں جو انسانوں میں بخار اور نظام تنفس کے امراض پیدا کرتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ وائرس انسانی جسم میں داخل ہو کر خلیوں سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ تندرست انسانی خلیوں کو بیمار کر کے انسان کو مریض بناتا ہے۔ ماہرین طب وائرس کی لاکھوں اقسام دریافت کر چکے۔ وائرس اور جراثیم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بہت سے جرثومے انسانی صحت کے لیے مفید ہیں۔ مگر تمام وائرس انسان میں بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

بھارتی سائنس دانوں کی تحقیق

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں واقع ہے۔ اس کا شمار بھارت کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ جنوری 2020ء کے آخری ہفتے اسی انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ماہرین جینیات کی ایک ٹیم نے نوول کرونا وائرس کا جینیاتی مطالعہ کیا۔ ان کی تحقیق 31 جنوری کو علم حیاتیات سے متعلق مشہور ویب سائٹ، ''بائیورکسو'' (Bioroxiv) میں شائع ہوئی۔

یہ تحقیق بہت انکشاف انگیز تھی۔ اس نے افشا کیا کہ بھارتی جینیات دانوں، پرشانت پردھان، اشتوش کمار، اکلیش مشرا، پرول گپتا اور دیگر کا خیال ہے کہ نوول کرونا وائرس انسان ساختہ ہے..... یعنی اس کو کسی حیاتیاتی لیبارٹری میں تیار کیا گیا۔ یہ کسی ایک یا دو جانوروں سے ہوتے ہوئے انسان تک نہیں پہنچا جیسا کہ عام خیال ہے۔ اُسے انسان ساختہ سمجھنے کی وجہ بہت اہم ہے۔

ایک برطانوی اخبار کی شہ سرخی

نوول کرونا وائرس کا جینیاتی مطالعہ کرتے ہوئے بھارتی ماہرین نے دریافت کیا کہ اس کے گلائیکو پروٹین میں چار ''انسرشنز'' (Insertions) کی گئی ہیں۔ انسرشن جینیاتی انجینئرنگ کی اصطلاح ہے۔ جب کسی ننھے زندہ وجود میں کوئی بیرونی شے مثلاً نئے جین داخل کیے جائیں، تو اسے انسرشن کہتے ہیں۔ جبکہ گلائیکو پروٹین ہر زندہ شے میں پایا جاتا ہے۔ یہ پروٹین کی ایک قسم ہے جو امائنو تیزابوں سے جڑا ہوتا ہے۔

بھارتی ماہرین کو کرونا وائرس کی بقیہ چھ اقسام میں درج بالا چار انسرشنز نہیں ملیں۔ یہ صرف نوول کرونا وائرس المعروف بہ ووہان وائرس میں پائی گئیں۔ زیادہ خطرناک بات یہ کہ ان چار انسرشنز کے امائنو تیزابوں پر تحقیق کی گئی تو ایک تباہ کن انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ چاروں انسرشنز کے امائنو تیزاب ''ایچ آئی وی-1'' کے امائنو تیزابوں سے مماثلت رکھتے تھے۔

ایچ آئی وی-1 ایک نہایت خطرناک مرض کی پہلی قسم ہے جسے ہم سب ''ایڈز'' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس لا علاج بیماری کی دوسری قسم ایچ آئی وی-2 کہلاتی ہے۔ دونوں اقسام میں ایچ آئی وی-1 ہی زیادہ خوفناک ہے۔ یہ قسم دنیا بھر میں لاکھوں انسانوں کو اپنا شکار بنا چکی۔ پاکستان میں کچھ عرصہ قبل لاڑکانہ میں اس کے کئی مریض سامنے آئے تھے۔

www.pakistanipoint.com

سوال یہ ہے کہ ایچ آئی وی-1 کے امائنو تیزاب نوول کرونا وائرس کے گلائیکو پروٹین میں کیسے داخل ہوئے؟ یہ کام صرف کسی حیاتیاتی لیبارٹری میں ماہرین ہی بذریعہ انسرشن انجام دے سکتے ہیں۔ مغربی میڈیا نے بھارتی ماہرین کی تحقیق کو چھو کر بھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ مودی حکومت کے زبردست دباؤ پر بھارتی ماہرین نے اپنا تحقیقی مقالہ واپس لے لیا۔ تاہم یہ سطور قلمبند ہونے تک ان کی مفصل رپورٹ Biorxiv ویب سائٹ پر موجود ہے۔ رپورٹ کا انگریزی عنوان ہے:

Uncanny Similarity of Unique Inserts in teh 2019- NCov Spike Protein to HIV-1 GP 120 and Gag.

چینی سائنس دانوں کا دعویٰ

جنوری 2019ء کے تیسرے ہفتے ٹونگجی یونیورسٹی، شنگھائی، گوانگ زو میڈیکل یونیورسٹی اور ایک چینی میڈیکل کمپنی، ریجنڈتھراپٹکس کے چھے ماہرین حیاتیات نے نوول کرونا وائرس کے خصوصی حصے، اے سی ای 2 (Angiotensin-converting enzyme 2) پر تحقیق کی تاکہ اس کی خصوصیات جان سکیں۔

اے سی ای 2 اس لحاظ سے نوول کرونا وائرس کا خاص حصہ ہے کہ اسی کی مدد سے وہ انسان کے صحت مند خلیے میں داخل ہوتا ہے۔ تحقیق سے عیاں ہوا کہ نوول کرونا وائرس میں اے سی ای 2 کا حصہ غیر قدرتی طور پر زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ چینی ماہرین کے نزدیک یہ بڑھوتری جینٹک انجینئرنگ کے ذریعے کرنا ہی ممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ اے سی ای 2 کے زیادہ بڑے ہونے سے نوول کرونا وائرس میں کس قسم کی تبدیلی نے جنم لیا؟ وہ تبدیلی یہ ہے کہ یہ نیا کرونا وائرس ایشیائی باشندوں کو زیادہ آسانی سے اپنا شکار بنا لیتا ہے۔ جبکہ سفید فام اور سیاہ فام انسانوں کو کم ہی دبوچتا ہے۔ گویا نوول کرونا وائرس کا اے سی ای 2 جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے اس ڈھب پر بنایا گیا کہ وہ خاص طور پر چینی باشندوں کو اپنا نشانہ بنائے اور انھیں بیمار کر ڈالے۔ براعظم ایشیا کی دیگر اقوام مثلاً پاکستانی، جاپانی، بھارتی، بنگلہ دیشی بھی اس کے نشانے پر ہیں۔

سپر پاورز کے مابین تناؤ

روس اور چین کے کئی ماہرین جینیات نے ان دونوں سائنسی رپورٹوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ نوول کرونا وائرس امریکی لیبارٹری میں تخلیق ہوا۔ اس الزام کی سیاسی و معاشی بنیادیں بھی موجود ہیں۔ پچھلے چار پانچ برس سے امریکا اور چین کے مابین سرد جنگ جنم لے چکی۔ بحیرہ جنوبی چین میں ایندھن کے وسیع عریض ذخائر پہلے پہل یہ نئی سرد جنگ چھڑنے کا سبب بنے۔

جب صدر ٹرمپ برسراقتدار آئے تو انھوں نے چین کے ساتھ تجارتی جنگ چھیڑ دی۔ اس دوران چین کے عظیم الشان منصوبے ''ون بیلٹ ون روڈ'' کو بھی امریکی حکمران طبقہ اپنے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھنے لگا۔ سرد جنگ جاری تھی کہ چین کی موبائل کمپنی ہواوے نے 5G ٹیکنالوجی لانے کا اعلان کر دیا۔ یہ جدید ترین ٹیکنالوجی بھی دنیا کی دونوں سب سے بڑی معاشی و سیاسی طاقتوں کے مابین وجہ نزاع بن گئی۔

امریکا اور چین کی سرد جنگ بڑھانے میں تائیوان اور ہانگ کانگ کے غیر معمولی واقعات نے اپنا کردار ادا کیا۔ اُدھر روس بھی امریکی مفادات کے خلاف متحرک ہے۔ امریکا کو چین اور روس کی قربت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ان کی دوستی نے امریکی حکمران طبقے کو مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ چین معاشی، سیاسی اور عسکری طور پر ایک عالمی قوت بن کر ابھر رہا ہے۔ یہ ابھرتی قوت افریقا سے لے کر ایشیا اور جنوبی امریکا تک امریکی حکومت کے مفادات کو زک پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا چین کو ضرب پہنچانا ضروری سمجھا گیا۔

www.paksociety.com

منصوبے کی تیاری

امریکی حکمران طبقہ مگر چین کو خصوصاً معاشی طور پر ایسے خفیہ سے انداز نقصان پہنچانا چاہتا تھا کہ اس پر کسی صورت الزام نہ آئے۔ ایسی صورت حال میں چین اور امریکا کے مابین کھلم کھلا جنگ چھڑ سکتی تھی۔ امریکی حکمران طبقہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ آخر سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ چین میں وبا پھیلانے والا وائرس چھوڑ دیا جائے۔ حیاتیاتی بم کی تھیوری کے خالقوں کا دعویٰ ہے، یہ منصوبہ نہایت عیاری و مکاری سے تیار کیا گیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے کہ وبائی وائرس پھیلانے کا پلان امریکی حکمران طبقے کا تخلیق کردہ ہے۔ اس سلسلے میں کئی اقدامات اٹھائے گئے۔

سب سے پہلے تو امریکا کی کسی خفیہ حیاتیاتی لیبارٹری میں جینیاتی انجینئرنگ کی مدد سے کرونا وائرس کا نیا ورژن تیار کیا گیا۔ کرونا وائرس کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ چمگادڑوں اور گرم خون والے ریڑھ دار جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہوا۔ اہل چین ایسے جانور رکھاتے ہیں۔ اس لیے یہ پروپیگنڈا آسان ہو جاتا کہ کرونا وائرس کا یہ نیا نمونہ کسی چمگادڑ، پینگولین، سانپ وغیرہ سے انسانوں میں آیا۔ امریکی ماہرین جینیات نے نئے نمونے میں ایڈز کا جینیاتی مادہ بھی ڈال دیا تاکہ اُسے زیادہ خطرناک بنایا جا سکے اور وہ اپنے شکار کو ایک بار دبوچ کر اس کی جان مشکل ہی سے چھوڑے۔

جب یہ نیا نمونہ، نوول کرونا وائرس تیار ہو چکا تو اب اگلا مرحلہ یہ تھا کہ اُسے چین میں کس جگہ اور کب چھوڑا جائے۔ یہ یقینی ہے کہ امریکیوں نے یہ نیا وائرس پچھلے سال بنا لیا تھا۔ غور و فکر کے بعد فیصلہ ہوا کہ اسے ماہ نومبر کے آخری ہفتے چینی شہر، ووہان کی ہوانان سی فوڈ ہول سیل مارکیٹ میں چھوڑ دیا جائے۔

وقت اور جگہ کا انتخاب

ماہ نومبر کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ جنوری 2020ء سے

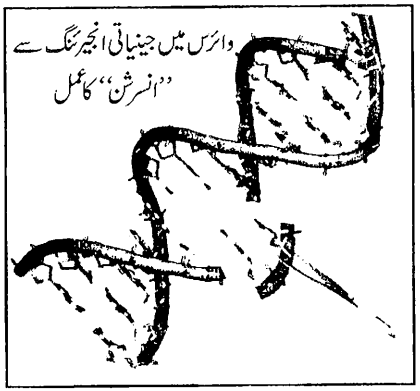

چین میں نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ چین میں نیا سال عوام کی اہم ترین تقریبات میں سے ایک ہے۔ اس ماہ چینی ایک ہفتے کی چھٹیاں مناتے اور خوب سیر و تفریح کرتے ہیں۔ تب شہروں سے کروڑوں چینی چھٹی منانے اپنے اپنے دیس جاتے ہیں۔ امریکی حکمران طبقے کو یقین تھا کہ ووہان سے دوسرے شہر جانے والے چینی نوول کرونا وائرس کو اندرون چین تک بھی پہنچا دیں گے۔ یہ وائرس پھر ہزار ہا چینیوں کو اپنا شکار بنا دیتا۔

ووہان شہر کا انتخاب بھی قابل ذکر ہے۔ یہ چین کے وسط میں آباد علاقے کا سب سے بڑا جبکہ نواں بڑا چینی شہر ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ شہر سڑکوں، ہوائی اڈوں اور ریل پٹڑیوں سے چین کے سبھی علاقوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس شہر میں لاکھوں رہائشی دیگر چینی شہروں سے کام کرنے آتے ہیں۔ جب ان میں نوول کرونا وائرس پھیل جاتا تو وہ نئے سال کی چھٹیاں مناتے جاتے ہوئے وہ یہ وائرس چین کے کونے کونے تک پھیلا دیتے۔

ہوانان سی فوڈ ہول سیل مارکیٹ کو بھی شاطر امریکی منصوبہ سازوں نے سوچ سمجھ کر منتخب کیا۔ یہ وسطی چین کی سب سے بڑی غذائی مارکیٹ تھی جہاں ایک ہزار سے زائد اسٹال لگے تھے۔ ان اسٹالوں پر دنیا کا تقریباً ہر جانور مردہ یا زندہ حالت

Warda Azeem
www.pakistanipoint.com

اجمل
آپ کے دُکھ درد کا ساتھی
معجون ریگ ماہی اجملی
طاقت کی انمول معجون
100 gm
UNANI MEDICINE
MAJUN
RAIG MAHI
AJMALI
Herbal Aphrodisiac
مقوی و محرک دوا ہے۔ اس معجون کا اثر اعصاب و عضلات پر ہوتا ہے
پٹھوں کی کمزوری، بلڈ پریشر کا کم ہونا، اعصابی تھکاوٹ
اور طبیعت میں بے چینی، سستی کو دور کرنے میں مفید ہے۔
دواخانہ حکیم اجمل خان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
155۔ ایم، قائد اعظم انڈسٹریل اسٹیٹ، لاہور، پاکستان
www.ajmal.pk
info@ajmal.pk
042-35123379, 0307-3333238

میں بیچا جاتا۔ ان میں سانپ، چمگادڑ، بندر، کتے، بلی، مگرمچھ، گدھے، لومڑی، چوہے وغیرہ شامل ہیں۔ اگر نوول کرونا وائرس اس مارکیٹ سے پھیلتا تو کسی کے وہم وگمان میں نہیں آنا تھا کہ یہ دراصل امریکا کا تخلیق کردہ حیاتیاتی ہتھیار ہے۔

جب مقام اور وقت کا تعین ہوگیا تو نوول کرونا وائرس کو پھیلانا کوئی کٹھن مسئلہ نہیں تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ سی آئی اے کے ایجنٹوں نے مختلف اسٹالوں پر نئے کرونا وائرس بکھیر دیے۔ وہ ہاتھوں کے ذریعے ناک یا منہ تک پہنچے اور پھر انسانی جسم میں داخل ہوگئے۔ یوں اس وائرس کے پہلے مریضوں نے جنم لیا۔ جب یہ مریض کھاتے یا چھینکیں مارتے، تو وائرس دیگر صحت مند انسانوں میں بھی منتقل ہوگئے۔ مریض کے لعاب دہن یا ناک کی رطوبت میں یہ موجود ہوتے ہیں۔ کھانسی یا چھینک کے ذریعے یہ وائرس چھے فٹ دور تک جاسکتے ہیں۔ جب رطوبت کے بخارات ایک جگہ ٹک جائیں، تو وہاں نوول کرونا وائرس چند دن تک زندہ رہتے ہیں۔ اگر اس مقام پر کوئی صحت مند آدمی انگلیاں مس کرے اور پھر ناک یا کان کھجائے یا منہ میں ڈالے، تو وائرس فوراً اس کے بدن میں بھی داخل ہوجاتا ہے۔

توقع سے بڑھ کر نتائج

ماہرین کا دعویٰ ہے، امریکی حکمران طبقے کے تخلیق کردہ حیاتیاتی ہتھیار نے توقع سے بڑھ کر نتائج دیے۔ نوول کرونا وائرس کی تباہ کاریاں دیکھ کر چین مخالف امریکی، صدر، ڈونالڈ ٹرمپ تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ حکومت چین سے اظہار ہمدردی کرتا رہا۔ سیاست کی ایک بڑی خامی یہی ہے کہ وہ حکمرانوں کو بے حس، مردہ دل اور ظالم بنا دیتی ہے۔ تب حکمران اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر بے گناہ اور معصوم انسانوں کی زندگیوں سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ یہ غیر انسانی اور ظالمانہ کھیل کھیلنے میں امریکی حکمران طبقہ طاق ہوچکا۔

نوول کرونا وائرس کے پہلے مریض اوائل دسمبر میں سامنے آئے۔ ماہ نومبر میں یہ وائرس ووہان شہر میں سیکڑوں افراد کو اپنا نشانہ بنا چکا تھا۔ یہ وائرس پہلے تو دو سے چودہ دن تک انسانی جسم میں خاموش پڑا رہتا ہے۔ پھر اچانک خلیوں پر حملہ آور ہوکر اپنی کاروائی شروع کر دیتا ہے۔ مریض جلد بخار، کھانسی، سانس لینے میں دشواری اور دستوں کا شکار ہوکر بستر سے لگ جاتا ہے۔ چونکہ اس نئے وائرس کی ویکسین موجود نہیں تھی، اسی لیے کمزور مدافعتی نظام (Immune System) رکھنے والے چینی جلد اللہ کو پیارے ہونے لگے۔

چین بل کر رہ گیا

یہ وائرس شہریوں کی نقل وحرکت کے باعث پورے چین میں پھیل گیا۔ چونکہ چینی باشندے کثیر تعداد میں بیرون ممالک کا سفر کرتے ہیں۔ نیز بیرونی ملکوں سے کثیر افراد چین آتے ہیں۔ اس لیے نوول کرونا وائرس دیگر ممالک میں بھی جا پہنچا۔ اب تک اس وائرس کی وجہ سے ہزاروں انسان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ جبکہ دنیا بھر کے ہزاروں انسانوں میں یہ وائرس موجود ہونے کی تصدیق ہوچکی۔ یہ ممکن ہے کہ مزید ہزارہا انسانوں میں یہ وائرس چھپا بیٹھا ہو۔

جیسا کہ بتایا گیا، امریکا کے وضع کردہ حیاتیاتی ہتھیار نے چین کو معاشی، سیاسی اور معاشرتی طور پر توقع سے بڑھ کر

www.pakistanipoint.com

نقصان پہنچایا۔ وائرس پھیلنے سے روکنے کی خاطر حکومت چین نے کئی شہروں میں کارخانے اور دفاتر بند کر دیے۔ پبلک ٹرانسپورٹ بھی روک دی گئی۔ یوں نوول کرونا وائرس نے تمام بڑے چینی شہروں میں معاشی پہیہ جام کر دیا۔ ہر جگہ کام ٹھپ ہو گیا۔ اہم سرکاری کانفرنسیں بھی ملتوی ہو گئیں۔ ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ اس وائرسی حملے سے چین کی معیشت کو زبردست نقصان پہنچا۔ برطانوی تحقیقی ادارے، آکسفم کے مطابق چینی معیشت کو ایک ٹریلین (ایک ہزار ارب) ڈالر کا جھٹکا لگ سکتا ہے۔ نقل وحمل کی بندش سے صرف ایئر لائنز کو 30 ارب ڈالر کا نقصان ہوا۔ یہ بھی خدشہ ہے کہ آنے والے مہینوں میں سیکڑوں چینیوں کی کمپنیاں اور کاروبار دیوالیہ ہو جائیں گے۔

نوول کرونا وائرس نے نہ صرف چین میں نئے سال کی خوشیاں ماند کر ڈالیں بلکہ لوگ عوامی مقامات پر جانے سے گھبرانے لگے۔ جن جگہوں پر کھوے سے کھوا چھلتا تھا، وہاں ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ جن سڑکوں پر پیر دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی، وہاں کتے آوارہ گردی کرنے لگے۔ غرض وائرس کے اس حملے نے چین میں روزمرہ زندگی تہہ وبالا کر ڈالی۔

بدقسمتی سے ووہان کی مقامی حکومت نے شروع میں نوول کرونا وائرس کے حملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مریضوں کے علاج اور وائرس کی روک تھام کرنے کے سلسلے میں سستی برتی۔ یہی وجہ ہے، موذی وائرس بڑی تعداد میں چینی عوام کو شکار کرنے میں کامیاب رہا۔ جب مریضوں کی تعداد بڑھی تو چینی حکام کو ہوش آیا۔ ان کی کوتاہی کو چینی میڈیا نے بھی اجاگر کیا۔ خاص طور پر امریکی و یورپی میڈیا نے اس بات کو خوب اچھالا۔ یوں مغربی میڈیا چین کی عوام میں حکومت مخالف نفرت انگیز جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بعض چینی شہریوں نے مشتعل ہو کر اپنی حکومت پر تنقید کر ڈالی جو ایک غیر معمولی بات تھی۔

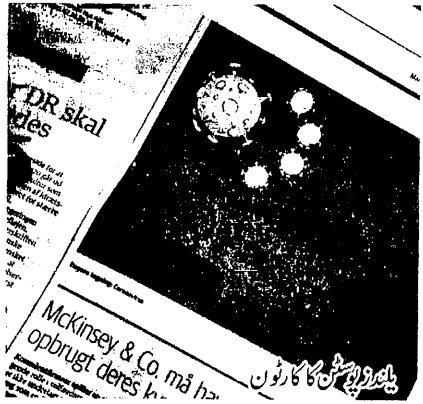

مغربی میڈیا کی منافقت

نوول کرونا وائرس کے حیاتیاتی ہتھیار ہونے کا دعوی کرنے والے یہ پہلو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ جب چین میں اس کے نشانہ بنے مریض سامنے آئے تو مغربی میڈیا نے طوفان کھڑا کر دیا۔ امریکا، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا، بھارت اور سبھی یورپی ممالک کے اخبارات نے شہ سرخیوں میں یہ خبریں شائع کیں کہ چین میں ایک نیا وائرس سامنے آ چکا جو حیوانیات سے انسانوں میں منتقل ہوا ہے۔

دلچسپ اور تعجب خیز بات کہ ستمبر 2019ء سے امریکا میں انفلوئنزا نے شہریوں پر حملہ کر رکھا تھا۔ لیکن خود امریکی میڈیا اس وبا کے بارے میں بہت کم خبریں دے رہا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ وسط فروری 2020ء تک یہ وبا ڈھائی کروڑ امریکی مردوں، عورتوں اور بچوں کو متاثر کر چکی تھی۔ ان میں سے دو لاکھ بیس ہزار اسپتال میں داخل ہوئے۔ جبکہ مریضوں میں سے ''بارہ ہزار مریض'' چل بسے۔

مزید حیرت انگیز بات یہ کہ انفلوئنزا کی یہ نئی وبا بھی ایک نئے وائرس سے ظہور پذیر ہوئی۔ لیکن چند ایک امریکی اخبارات کے علاوہ مرکزی (مین سٹریم) میڈیا نے اس خبر کو پوشیدہ رکھا۔ ظاہر ہے، یہ قدم امریکی حکومت کے کہنے پر اٹھایا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

آیا۔ امریکی حکمران طبقہ یہ خبر دے کر اپنے عوام میں افراتفری اور بے چینی نہیں پھیلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے، بیرون ممالک مثلاً پاکستان کو تو چھوڑیے، خود امریکا میں کروڑوں امریکی اس تلخ حقیقت سے بے خبر رہے کہ ان کے دیس میں انفلوائنزہ وائرس کا ایک نیا نمونہ (ورژن) تباہی مچا رہا ہے۔ یہ اس لیے پھیلنے میں کامیاب رہا کہ نئے وائرس کی ویکسین موجود نہیں تھی۔

نوول کرونا وائرس کو مگر مغربی میڈیا نے ڈراؤنا خواب بنا کر پیش کیا۔ اس کے خلاف زوردار پروپیگنڈہ ہوا اور اُسے خوفناک شے بنا دیا گیا۔ دعوی کیا گیا کہ چین اور چینی عوام کے خلاف یہ زہریلی مہم امریکی حکمران طبقے کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھی۔ اس مہم کے ذریعے وہ چینی شہریوں کو دنیا بھر میں اچھوت بنا کر بدنام کرنا چاہتے تھے۔ اگر امریکیوں کی یہ خفیہ مہم تھی تو وہ خاصی حد تک کامیاب رہی۔

مثال کے طور پر ڈنمارک کے بدنام زمانہ اخبار، یلند زپوسٹن نے ایک کارٹون شائع کیا جس میں چین کا جھنڈا دکھایا گیا۔ اس میں پانچ ستاروں کی جگہ نوول کرونا وائرس فٹ کر دیے گئے۔ یوں چینی قوم کی تحقیر کرنا مقصود تھی۔ اخبار نے حسب معمول اس کارٹون کو ''آزادی رائے'' قرار دے کر فخر کا اظہار کیا۔

جرمن کے ممتاز اخبار، دیر سپیگل نے اپنے سرورق پر ماسک پہنے چینی آدمی کی بڑی سی تصویر چھاپی اور سرخی جمائی: ''کرونا وائرس..... میڈان چائنا'' امریکا کے مشہور اخبار، وال اسٹریٹ جرنل نے تو حد ہی کر دی۔ اخبار نے سرخی جمائی: China is the Real Sick Man of" Asia'' (چین ایشیا کا بیمار آدمی ہے۔)

یہ دیکھیے کہ چین میں کروڑوں لوگ دکھ و کرب سے گزر رہے ہیں۔ کسی کو نہیں علم کہ کب نوول کرونا وائرس اُسے دبوچ کر موت کے منہ میں دھکیل دے۔ چین میں خوف و دہشت کا راج ہے۔ لیکن اس عالم میں مفاد پرست امریکی و یورپی میڈیا چین اور چینی عوام کو بدنام کرنے کی بین الاقوامی مہم چلانے لگا۔ یہ چینی قوم اور حکومت کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف فعل تھا۔ چینی قوم کو دنیا بھر میں اچھوت بنا دینے کی زبردست مغربی میڈیا کی مہم آشکارا کرتی ہے کہ شاید یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہو۔ امریکی حکمران طبقے نے اپنے پالتو میڈیا کو پہلے ہی تیار کر دیا تھا کہ نوول کرونا وائرس کا حیاتیاتی ہتھیار استعمال ہوتے ہی چین کے خلاف زوردار پروپیگنڈا شروع کر دینا ہے۔

مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا کہ تمام ممالک میں لوگ چینی باشندوں سے دور دور رہنے لگے جیسے وہ جذام کے مریض ہوں۔ کئی ملکوں میں انھیں الگ تھلگ علاقوں تک محدود کر دیا گیا۔ غیر ملکی سیاحوں نے بھی چین کا رخ نہیں کیا۔ اس سے چین میں شعبہ سیاحت کو بھاری نقصان پہنچا۔ بہت سے ممالک اپنے شہریوں کو چین سے نکال کر لے گئے۔ اس صورت حال میں پاکستان نے اپنے دیرینہ رفیق کا کافی ساتھ دیا۔ چین میں پاکستانی ڈاکٹر بھی نوول کرونا وائرس کے مریضوں کا علاج کرتے رہے۔ اس بات نے چینی عوام کے دل جیت لیے اور انھوں نے اہل پاکستان کے کردار کو شاندار انداز میں سراہا۔

اگرچہ پاکستان میں وہ والدین متوحش رہے کہ جن کے بچے چین میں زیر تعلیم تھے۔ چینی حکومت نے اعلان کیا کہ انھیں وبا سے بہترین تحفظ دیا جا رہا ہے۔ حکومت چین کا کہنا تھا کہ اگر پاکستانی طالب علم واپس آئے تو ممکن ہے، پاکستان میں کرونا وائرس پھیل جائے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث پاک کا بھی حوالہ دیا گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے، وہ وبا کے علاقے سے نہ نکلیں۔ ادھر ایران میں وبا پھیلنے سے اس خدشے نے جنم لیا کہ وہاں سے وائرس پاکستان منتقل ہو سکتا ہے۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

یہ یاد رہے کہ ووہان کی سی فوڈ ہول سیل مارکیٹ میں صفائی کا معیار زیادہ عمدہ نہیں تھا۔ ماہرین کا کہنا ہے، اس لیے بھی اپنا حیاتیاتی ہتھیار چھوڑنے کے لیے امریکی حکمران طبقے نے ووہان کا انتخاب کیا۔ چین کے دیگر بڑے شہروں مثلاً بیجنگ، شنگھائی وغیرہ میں صفائی کا انتظام بہتر ہے۔ صفائی کے خراب نظام کی وجہ سے بھی نوول کرونا وائرس بڑی تیزی سے چینی شہریوں میں پھیل گیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امریکی شہری بکثرت ووہان آتے جاتے ہیں۔ جب نوول کرونا وائرس کی وبا پھیلی تب بھی وہاں کثیر تعداد میں امریکی موجود تھے۔ لیکن اچانک وہ شہر سے روانہ ہونے لگے۔ لگتا تھا کہ امریکی حکومت نے اپنے تمام شہریوں کو خفیہ طریقے سے یہ خبر پہنچادی کہ وہ ووہان سے نکل جائیں۔ چنانچہ ماہ دسمبر کے اواخر تک تمام امریکی ووہان چھوڑ چکے تھے۔ حالانکہ تب دنیا والے وائرسی وبا سے آگاہ ہو رہے تھے۔

وائرس چینی لیبارٹری سے فرار ہوا؟

امریکا و یورپ کے میڈیا میں اس خبر کا چرچا رہا کہ نیا کرونا وائرس دراصل ووہان میں واقع چین کی حیاتیاتی لیبارٹری میں تخلیق ہوا۔ یہ وائرس پھر کسی طرح لیبارٹری سے نکل کر شہر میں پھیل گیا اور تب ہزارہا چینی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ امریکی میڈیا میں پھیلے اس نظریے کی مکمل داستان درج ذیل ہے۔

یہ 13 جون 2012ء کی بات ہے، سعودی شہر جدہ کے ایک نجی اسپتال میں ایک ساٹھ سالہ مریض لایا گیا۔ وہ شدید بخار میں مبتلا تھا۔ اُسے کھانسی بھی آ رہی تھی۔ اسپتال کے ماہرین نے مختلف طبی ٹیسٹ آزمائے مگر بیماری کی نوعیت نہیں جان سکے۔ اس امر نے سبھی ڈاکٹروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ چند دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد مریض چل بسا۔

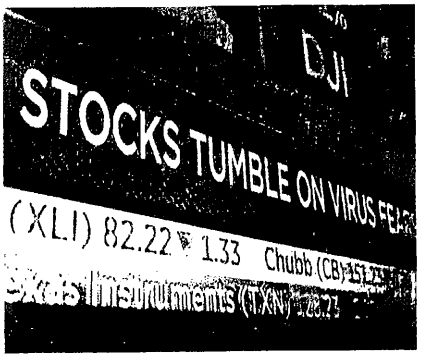

اس اسپتال میں قاہرہ (مصر) سے تعلق رکھنے والا ایک ماہر جرثومات، ڈاکٹر علی محمد ذکی بھی کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی لیبارٹری میں مریض کے پھیپھڑوں سے برآمد ہونے والے مواد کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ آخر اُسے ایک خرد بینی مشکوک نامیہ مل گیا۔ مگر وہ یہ نہیں جان سکا کہ یہ نامیہ کیا شے ہے۔

ڈاکٹر علی محمد نے پھر وہ مواد ہالینڈ کے ماہر جرثومات، رون فوشیر کو بھجوادیا جو اس کا دوست تھا۔ رون فوشیر روٹر ڈیم میں ارائمس میڈیکل سینٹر سے وابستہ تھا۔ اب اس نے جدید ترین آلات کے ذریعے مواد کا معائنہ کیا۔ آخر وہ یہ جاننے میں کامیاب رہا کہ نامعلوم خرد بینی نامیہ دراصل کرونا وائرس کا نیا نمونہ (ورژن) ہے۔ اس نئے کرونا وائرس کو ''مرس'' (مڈل ایسٹ ریسپائٹری سینڈروم) کا نام دیا جاچکا۔

کچھ عرصے بعد ڈاکٹر رون نے نئے وائرس کا ایک نمونہ ڈاکٹر فرینک پلمر کو بھجوادیا۔ ڈاکٹر فرینک کینیڈا میں نیشنل مائکرو بائیولوجی لیبارٹری کا ڈائریکٹر تھا۔ یہ کینیڈا میں انتہائی خطرناک وائرسوں اور جراثیم پر تحقیق کرنے والی الکوٹی لیبارٹری ہے جو جدید ترین آلات سے لیس ہے۔ اس لیبارٹری میں کئی مہلک وائرسوں مثلاً ایبولا، سارس اور دیگر کرونا وائرس کے نمونے محفوظ ہیں۔

www.pakistanipoint.com

مارچ 2019ء میں انکشاف ہوا کہ مائیکرو بائیولوجی لیبارٹری سے وائرسوں کے نمونوں پر مشتمل ایک شپ منٹ چین بجھوائی گئی ہے۔ یہ انکشاف ہوتے ہی مغربی میڈیا میں سوال کیا گیا کہ کینیڈین لیبارٹری سے وائرسوں کے نمونے کیوں بجھوائے گئے؟ بعدازاں انکشاف ہوا کہ اس واقعے کے پیچھے وہ چینی ماہرین جرثومیات ملوث تھے جو مائیکرو بائیولوجی لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔ یہ افشا ہوتے ہی ان ماہرین کو کینیڈا سے واپس چین جلاوطن کردیا گیا۔

جب نوول کرونا وائرس دریافت ہوا تو امریکی میڈیا میں یہ شور مچ گیا کہ ووہان کی حیاتیاتی لیبارٹری میں اس کا جنم ہوا۔ چین میں آٹھ حیاتیاتی لیبارٹریاں سرکاری طور پر کام کر رہی ہیں۔ لیکن وہاں حیاتیاتی ہتھیاروں کی روک تھام کے لیے تحقیق ہوتی ہے۔ تاہم امریکی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ ان لیبارٹریوں میں چینی سائنس داں حیاتیاتی ہتھیار بنانے کی خاطر بھی تحقیق و تجربے کر رہے ہیں۔

ووہان انسٹی ٹیوٹ آف بائیولوجیکل پروڈکشن نامی حیاتیاتی لیبارٹری اس سی فوڈ ہول سیل مارکیٹ کے قریب ہی واقع ہے جہاں سے میڈیا کی رو سے نوول کرونا وائرس پھیلا۔ امریکی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اسی لیبارٹری میں چینی ماہرین نے کرونا وائرس کا نیا نمونہ، کوویڈ19 حیاتیاتی بم کے طور پر تیار کیا۔ دوران تحقیق نیا وائرس کسی محقق سے بداحتیاطی کے باعث چمٹ گیا۔ اسی نے پھر شہر بھر میں نیا وائرس پھیلا ڈالا۔ وہ اپنے اس دعویٰ کے سلسلے میں کچھ شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ 22 فروری کو چین کے محکمہ سائنس و ٹیکنالوجی نے یہ نیا حکم نامہ جاری کیا:

''مملکت کی ان مائکروبیالوجی لیبارٹریوں میں سیکورٹی سخت کردی جائے جن میں نوول کرونا وائرس جیسے وائرسوں پر تحقیق و تجربات جاری ہیں۔''

امریکی و مغربی ماہرین سوال کرتے ہیں کہ یہ حکم نامہ جاری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سے تو لگتا ہے کہ چینی حیاتیاتی لیبارٹریوں میں وائرسوں کے تحفظ کا ڈھیلا ڈھیلا انتظام موجود ہے۔ اسی لیے کرونا وائرس کا نیا نمونہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ چین میں صرف ووہان کی حیاتیاتی لیبارٹری ہی میں کرونا وائرس جیسے وائرسوں پر تجربات جاری ہیں۔

دوسرا ثبوت یہ کہ ماہ جنوری کے آخر میں میجر جنرل چن وی (Chen Wei) ووہان پہنچ گئی تاکہ کوویڈ19 کی مدد کر سکے۔ میجر جنرل چن وی چین کی افواج میں حیاتیاتی جنگ و جدل کی سب سے تجربہ کار اور مشہور ماہر ہے۔ وہ 2003ء سے کرونا وائرس کے مختلف نمونوں پر تحقیق کر رہی ہے۔

امریکی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ میجر جنرل چن وی کو اسی لیے ووہان بجھوایا گیا کیونکہ وہاں کی لیبارٹری سے کوویڈ19 باہر نکل کر وبا پھیلانے کا سبب بن چکا تھا۔ وہ اسی لیے ووہان پہنچی تاکہ وبا کنٹرول کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔

مغربی و امریکی ماہرین یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ چین کی لیبارٹری میں کام کرتے بعض محقق تجربات میں استعمال ہونے والے جانور یا ان کا گوشت مارکیٹوں میں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ووہان کی لیبارٹری سے بھی کوئی ایسا جانور مقامی سی فوڈ مارکیٹ میں جا پہنچا جس کے اندر کوویڈ19 موجود تھا۔ اسی نے پھر پورے چین اور دیگر ممالک میں وبا پھیلادی۔

تاہم امریکا مخالف ماہرین کے نزدیک اس دعویٰ سے یہ بھی عیاں ہے کہ امریکی حکمران طبقے نے اپنا حیاتیاتی بم (نوول کرونا وائرس) چین پر داغنے کی خاطر ووہان کا انتخاب کیوں کیا؟ اُسے علم تھا کہ ووہان میں جدید ترین آلات سے لیس ایک حیاتیاتی لیبارٹری کام کر رہی ہے۔ یوں اپنا دامن بچا کر نئے وائرس کی تخلیق کا الزام چین پر دھر دینا مزید آسان ہوجاتا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رضوان علی

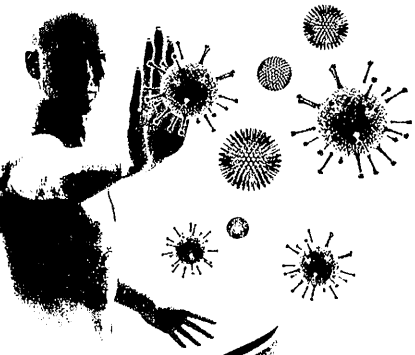

انسان کا کمزور ہوتا مدافعتی نظام

دنیا بھر میں نیا کرونا وائرس تیزی سے پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلے ستر اسی برس میں انسان کا جسمانی مدافعتی نظام ماضی کی نسبت کمزور ہو چکا۔ اسی لیے کئی مرد و زن بہت جلد وائرسوں اور جراثیم کے حملوں کی وجہ سے بیمار پڑ جاتے ہیں۔ مدافعتی نظام کمزور ہونے کی اہم وجہ یہ ہے کہ ہماری غذاؤں میں غذائیت کم ہو چکی۔ ان میں پہلے کی طرح وٹامن، معدنیات اور دیگر غذائی اجزا نہ صرف کم پائے جاتے ہیں بلکہ ان کی کوالٹی بھی گھٹیا ہو گئی۔ اس تباہ کن عمل کو بھی اہل مغرب نے ہی جنم دیا۔ اس عمل نے آج اربوں انسانوں کا مدافعتی نظام ناکارہ کر ڈالا ہے۔

تباہی کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا جب برطانیہ، امریکا، جرمنی، اٹلی وغیرہ میں مغربی سائنس داں کیمیائی مادوں سے کھادیں بنانے لگے۔ انھوں

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

"سبز" انقلاب کے بطن سے جنم لینے والی مضر صحت تبدیلیوں کی چشم کشا داستان

نے زیادہ پیداوار دینے والے بیج (High Yielding Seed) بھی تیار کر لیے۔ اس کے ساتھ ہی کیڑے مار ادویہ بھی وجود میں آ گئیں۔ اس سارے بکھیڑے کا مقصد یہ تھا کہ اجناس، پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل مغرب اپنی کاشتکاری میں زیادہ پیداوار دینے والے بیج، کیمیائی کھادیں اور کیڑے مار ادویہ استعمال کرنے لگے۔ اوائل میں ان انسان ساختہ اشیاء نے واقعی اجناس، پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کافی بڑھا دی۔ ان اشیاء کو بھارت اور پاکستان میں بھی استعمال کیا گیا۔ اس باعث برصغیر میں گندم، چاول اور گنے کی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی۔ اس حیرت انگیز تبدیلی کو ''سبز انقلاب'' کا نام ملا۔

پچاس ساٹھ سال قبل بھارت، پاکستان، میکسیکو، مصر، بنگلہ دیش اور دیگر ترقی پذیر ممالک کی حکومتیں سبز انقلاب کا باعث بننے والے امریکی، برطانوی و یورپی سائنس دانوں کے گن گانے لگیں۔ ان کو غربت دور کرنے والے نجات دہندہ قرار دے کر کئی قومی ایوارڈ عطا کیے گئے۔ حتیٰ کہ بعض امریکی سائنس داں سبز انقلاب لے آنے پر نوبل انعام کے بھی حقدار ٹھہرے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ کے انسانی صحت پر مضر اثرات بھی سامنے آنے لگے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سبز انقلاب کی بدولت گندم اور چاول کی پیداوار بڑھ جانے سے بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش جیسے کئی ترقی پذیر ممالک کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان ممالک کی حکومتیں پیداوار بڑھنے سے اس قابل ہو گئیں کہ بڑھتی آبادی کی غذائی ضروریات پوری کر سکیں۔ ماضی میں ہندوستان اکثر قحط کا نشانہ بنتا تھا۔ قحط میں لاکھوں انسان چل بستے۔ سبز انقلاب آنے سے سنگین قحط قصہ پارینہ بن گئے۔ مگر یہ تبدیلی رفتہ رفتہ اپنے مضر اثرات بھی سامنے لائی۔

مثال کے طور پر کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ کے مسلسل استعمال سے مٹی میں قدرتی زرخیز پن کافور ہو گیا۔ پہلے کیڑے مکوڑوں، جڑی بوٹیوں اور دیگر نباتات کی باقیات مٹی کو زرخیز بناتی تھیں۔ مگر کیمیائی مادوں کے استعمال نے مٹی کو زرخیز بنانے والی قدرتی اشیاء سے محروم کر دیا۔

غذا میں غذائیت کی کمی

دور جدید کے ماہرین غذائیات نے تحقیق و تجربے سے دریافت کیا ہے کہ کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ سے لدی مٹی میں جو غذا اگائی جائے، اس میں وٹامن اور معدنیات کم مقدار میں ہوتے ہیں۔ ضروری امائنو تیزاب، چکنائی کے تیزاب اور پروٹین بھی کم ملتے ہیں۔ البتہ ان میں کاربوہائیڈریٹ (نشاستہ) بکثرت ہوتے ہیں جن کی زیادتی انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

غذاؤں کی غذائیت کم ہونے سے ہی انسان کا مدافعتی نظام بھی کمزور ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے، جب ایسی غذاؤں کا چلن عام ہو گیا، تو انسان پر نت نئے وائرس اور جراثیم حملہ آور ہونے لگے۔ یہی نہیں، حیوانیات میں امراض پیدا کرنے والے وائرسوں کو موقع مل گیا کہ وہ انسانوں کو بھی اپنا شکار بنا سکیں۔ مثال کے طور پر 1980ء کے عشرے میں بندروں سے ایڈز کا وائرس انسانوں میں منتقل ہوا۔

بنی نوع انسان میں نت نئی بیماریاں جنم لینے کا سلسلہ عام ہو رہا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ کے ذریعے اگائی گئی غذاؤں میں غذائیت کم ہوتی ہے۔ چونکہ انسان کی صحت کا دارومدار ہی غذا پر ہے لہٰذا غذاؤں میں غذائیت کم ہونے سے اس کا مدافعتی نظام بھی اب طاقتور نہیں رہا۔

یہ واضح رہے کہ زیادہ پیداوار دینے والے بیج، کیمیائی کھادیں، کیڑے مار ادویہ اور کاشتکاری میں مستعمل سبھی کیمیکل بنانے والی کمپنیاں مغربی ہیں۔ ان کمپنیوں میں امریکی و برطانوی سرمایہ کاروں نے بھاری پیسا لگا رکھا ہے۔ چنانچہ ان کمپنیوں کے اصل مالک امریکی، برطانوی یا یورپی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

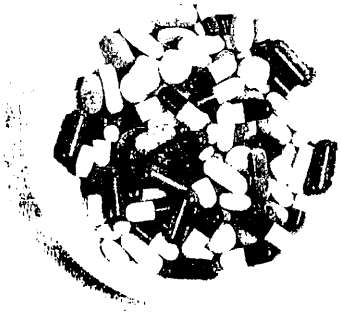

ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق درج بالا زرعی اشیاء کی ''75 تا 80'' تعداد صرف چھے کمپنیاں بناتی ہیں۔ ان میں بائیر، بیسف، ڈاؤ ایگروسائنس، مونسانٹو، ڈیوپونٹ اور سنجینٹا شامل ہیں۔ ان کمپنیوں کو اپنی مصنوعات کی فروخت سے سالانہ 60 ارب ڈالر سے زائد آمدن ہوتی ہے۔

مارک ڈوی (Mark Dowie) امریکا کا ممتاز صحافی ہے۔ 2014ء میں اس کی کتاب امریکین فاؤنڈیشنز: این انویسٹی گیٹو ہسٹری (American foundations: An Investigative History) شائع ہوئی۔ اس میں مارک نے انکشاف کیا کہ امریکا و برطانیہ کو ترقی پذیر ممالک کے غریب باشندوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ انھوں نے وہاں سبز انقلاب اس لیے شروع کیا تاکہ ترقی پذیر ممالک سویت یونین کے دائرہ اثر میں نہ آسکیں۔ گویا حکومتیں ایشیاء اور افریقا کے ممالک کو اس لیے امداد دینے لگیں کہ وہاں کمیونسٹ اثرات جنم نہ لے سکیں۔

پاکستان پہ قرضوں کا بوجھ

یاد رہے، پاکستان کے پہلے وزیراعظم، لیاقت علی خان سویت یونین جانا چاہتے تھے مگر بیوروکریسی اور فوج کے دباؤ پر انھیں امریکا کا دورہ کرنا پڑا۔ امریکا پھر پاکستان کو مالی و عسکری امداد دینے لگا۔ ڈالروں کی بے روک ٹوک آمد نے حکمران طبقے کو ڈالر خرچ کرنے کا چسکا لگا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جلد ہی عالمی مالیاتی اداروں اور بیرون ممالک سے بھی آنے والی پاکستانی حکومتیں ڈالروں میں قرضے لینے لگیں۔ یہ پاکستانی حکومتوں کا چلن بن گیا۔

تازہ اعداد و شمار کے مطابق فی الوقت پاکستان پر اکتالیس ہزار ارب روپے کا مجموعی قرضہ چڑھ چکا۔ گویا ہر پاکستانی شہری لاکھوں روپے کا مقروض ہے۔ قرضوں کے پہاڑ کا نتیجہ ہے کہ حکومت پاکستان کی آدھی سے زائد آمدن قرضے اتارنے اور ان کے سود دینے پر لگ جاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم و صحت کے لیے بہت کم رقم بچتی ہے۔ حکومت مہنگائی کنٹرول کرنے کی خاطر بھی چند ارب روپے ہی خرچ کر پاتی ہے۔ قرضوں کے انبار نے ہی پاکستان کو خوشحال اور ترقی یافتہ مملکت بننے سے روک رکھا ہے۔

مزید قباحتیں

سبز انقلاب سے ایک اور قباحت نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ نت نئے بیج، کھاد یں، کیڑے مار ادویہ اور دیگر زرعی اشیا خریدنے کے لیے خصوصاً بھارت و پاکستان میں لاکھوں کسان بنیوں سے رقم ادھار لینے لگے۔ جب خدانخواستہ کسی قدرتی یا غیر قدرتی طریقے سے ان کی فصل اچھی نہ ہوتی، تو وہ قرضہ واپس نہیں کر پاتے۔ رفتہ رفتہ برصغیر میں لاکھوں کسان بنیوں کے مقروض ہو گئے۔ بھارت میں کئی برس سے ہر سال ہزارہا کسان قرضے واپس نہ کر پانے پر خودکشی کر لیتے ہیں۔ پڑوسی ملک میں تو کسانوں کی خودکشیاں سنگین مسئلہ بن چکا۔

زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں سے اس منفی پہلو نے جنم لیا کہ بہت سے روایتی بیج استعمال نہ ہونے پر ناپید ہو گئے۔ یوں سبز انقلاب نے ''حیاتی تنوع''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

(Biodiversity) کو بھی نقصان پہنچایا۔ ناپید ہونے والے بہت سے بیج موسمیاتی تبدیلیوں کا زیادہ مقابلہ کر سکتے تھے۔ جبکہ زیادہ پیداوار والے بیج خصوصاً پانی کم ہونے سے مطلوبہ پیداوار نہیں دے پاتے۔

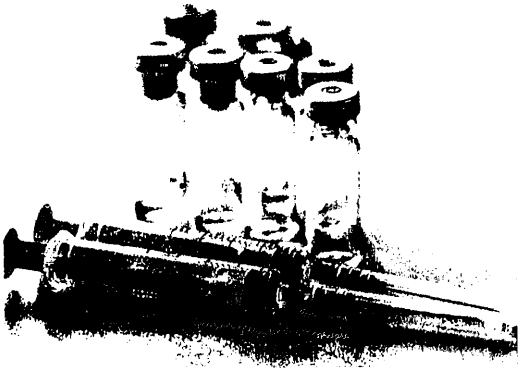

پچھلے چند برس سے بھارت کے کسانوں میں یہ تحریک چل پڑی ہے کہ روایتی بیجوں سے اجناس، پھل اور سبزیاں اگائی جائیں۔ یہ تجربہ جنوبی بھارت کی ریاستوں، تامل ناڈو، کیرالہ اور کرناٹک میں کیا جا رہا ہے۔ ان ریاستوں کے اکثر کسان کیمیائی کھادوں کے بجائے دیسی کھاد استعمال کرتے ہیں۔ اس قدرتی کاشتکاری سے جو جناس پیدا ہوئیں، وہ استعمال کرنے والوں کے نزدیک ذائقے میں بہتر ہیں اور ان سے خوشبو بھی آتی ہے۔ یقیناً ان میں غذائیت بھی زیادہ ہو گی۔ کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ نے تو غذاؤں سے ذائقہ اور خوشبو بھی چھین لی۔

سبز انقلاب کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ کسان نقد آور فصلیں مثلاً گندم، کپاس، گنا، چاول وغیرہ اپنی زمینوں پر اگانے لگے۔ انھوں نے خصوصاً دالوں کی پیداوار کم کر دی۔ ان تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ دالوں کی کم پیداوار سے ان کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ بھارت اور پاکستان میں کروڑوں غریبوں کا من بھاتا کھاجا دالیں تھیں۔ مگر دالیں مہنگی ہونے سے ان پر مالی بوجھ پڑ گیا اور یوں معاشرے میں بے چینی و انتشار نے جنم لیا۔

جدید طب اب دریافت کر رہی ہے کہ کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار ادویہ سے لدی پھندی غذاؤں کا مسلسل استعمال انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ غذائیں جگر، گردوں اور دل کو خراب کرتی ہیں۔ نیز ان کی وجہ سے کینسر بھی ماضی کی نسبت زیادہ تعداد میں انسانوں کو دبوچ رہا ہے۔ وجہ یہی کہ اب کمزور انسانی مدافعتی نظام کینسری خلیوں کو افزائش سے نہیں روک پاتا۔

سبز انقلاب کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ کیمیائی کھادوں وغیرہ پر نشوونما پانے والی اجناس بہت زیادہ پانی پیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے، کئی ممالک میں پانی کی کمی جنم لے چکی کیونکہ وہاں زراعت میں بہت زیادہ یہ قدرتی تحفہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان ہی کو لیجیے۔ وطن عزیز میں دریاؤں اور نہروں کا 90 فیصد پانی زراعت میں خرچ ہوتا ہے۔

پاکستان کے 63 فیصد قابل کاشت رقبے پر گندم، چاول، کپاس، گنا اور مکئی بوئی جاتی ہے۔ یہ سبھی فصلیں وافر پانی ہی میں پلتی بڑھتی ہیں۔ ایک عام انسان کو روزانہ ضروریات کی خاطر 50 لیٹر پانی درکار ہوتا ہے۔ مگر ماہرین کے مطابق ایک انسان کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے روزانہ زرعی شعبے کو 2600 سے 5300 لیٹر پانی درکار ہے۔ گویا گھریلو مقاصد سے پچاس سے ستر گنا زیادہ پانی زراعت میں استعمال ہوتا ہے۔

وطن عزیز کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہر سال آبادی میں لاکھوں افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان نئے ہم وطنوں کو غذا چاہیے اور پانی بھی مگر ان دونوں قدرتی وسائل کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پاکستان میں قلت جنم لے چکی۔ لالچی ذخیرہ اندوزوں اور اسمگلروں کے باعث یہ قلت اکثر بڑھ جاتی ہے جیسا کہ کچھ عرصہ قبل گندم اور چینی کی کمی نے پورے ملک میں بحران پیدا کر دیا تھا۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کی لاٹری

اب تک بیان کیے گئے حقائق سے عیاں ہے کہ مغربی ممالک نے غذاؤں کی پیداوار بڑھانے کی خاطر کیمیائی کھادیں، بیج اور کیڑے مار ادویہ ایجاد کیں۔ ان ایجادات سے غذائی پیداوار ضرور بڑھ گئی مگر غذاؤں میں غذائیت کم ہونے لگی۔ ناقص غذاؤں نے انسان کے مدافعتی نظام کو کمزور کرڈالا۔ یوں وہ آسانی سے امراض کا نشانہ بننے لگا۔ نت نئے وائرس، جراثیم اور دیگر خردبینی نامیات اس پر حملہ آور ہو گئے۔

اس سارے چکر کا ایک زبردست منفی پہلو یہ ہے کہ بیماریاں پھیلنے سے ادویہ بنانے والی کمپنیوں کی گویا لاٹری کھل گئی۔ آج یہ کمپنیاں ہزارہا اقسام کی دوائیاں، اینٹی بائیوٹک ادویہ، ویکسینیں وغیرہ بیچ کر ہر سال اربوں ڈالر کماتی ہیں۔ حیران کن امر یہ کہ دنیا کی بیشتر بڑی ادویہ ساز کمپنیاں مغربی ممالک سے تعلق رکھتی ہیں۔

گویا مغربی زرعی سائنس ہی نے نت نئی بیماریوں کو جنم دیا اور مغرب کی ادویہ ساز کمپنیاں ہی ان بیماریوں کا علاج کرنے والی دوائیں بنا رہی ہیں۔ زمانہ جدید میں تو ایسی کمپنیاں بھی جنم لے چکیں جن کا ایک شعبہ (یا ڈویژن) تو کیمیائی کھادیں یا زرعی ادویہ بناتا ہے تو دوسرے شعبے میں امراض دور کرنے والی دوائیں تیار ہوتی ہیں۔ گویا یہ کمپنیاں مضرصحت اشیا تیار کرتی ہیں۔ ساتھ ساتھ علاج کرنے والی ادویہ بنانے کا کام بھی جاری رہتا ہے۔

اسی دوران اینٹی بائیوٹکس اور ویکسینوں کی ایک بہت بڑی خامی بھی نمایاں ہو چکی۔ وہ یہ کہ ہر اینٹی بائیوٹک تمام جراثیم نہیں مار پاتی۔ جو جراثیم زندہ بچ جائیں، وہ رفتہ رفتہ اپنے اندر اینٹی بائیوٹک دوا سے مدافعت کی قوت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس طرح نئی قسم کا جرثومہ جنم لیتا ہے۔ ادویہ ساز کمپنیوں کو پھر یہ نیا جرثومہ ختم کرنے کی خاطر نئی اینٹی بائیوٹک بنانا پڑتی ہے۔ یوں ان کا کاروبار پھل پھول رہا ہے کیونکہ ہر عشرے بعد کوئی نہ کوئی اینٹی بائیوٹک دوا بے اثر اور ناکارہ ہو جاتی ہے۔

ویکسین کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے جو وائرس یا جرثومے ختم کرنے کی خاطر بنتی ہے۔ رفتہ رفتہ کسی بیماری کا وائرس یا جرثومہ ویکسین کا مقابلہ کرنے کی خاطر اپنے میں مدافعت پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ جلد یا بدیر مروجہ ویکسین اُسے ختم نہیں کر پاتی۔ واضح رہے، ویکسین میں متعلقہ جرثومے یا وائرس کے اجزا بھی شامل ہوتے ہیں۔ تاہم ہر ادویہ ساز کمپنی ویکسین کے اجزا خفیہ رکھتی ہے۔ وہ انھیں ''ٹریڈ سیکرٹ'' قرار دے کر افشا نہیں کرتی۔

مغرب و مشرق کے بعض طبی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ ویکسینوں کی تیاری میں مضرصحت اشیا بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا مزید دعویٰ ہے کہ یہ مضرصحت اشیا انسان کے گردے اور جگر خراب کر سکتی ہیں۔ نیز جسمانی اعصاب کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ جو مرد و عورتیں ویکسینیں اور اینٹی بائیوٹک ادویہ زیادہ استعمال کریں، وہ قوت تولید سے محروم ہو سکتے ہیں۔ گویا ادویہ ساز کمپنیاں امراض سے محفوظ رکھنے والی جو ویکسینیں اور اینٹی بائیوٹک بنا رہی ہیں، وہ انسانوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔

نئے کرونا وائرس سے پھیلتی وبا ویکسینیں تیار کرنے والی مغربی کمپنیوں کے لیے خوشخبری تھی۔ مشہور امریکی ٹی وی نیٹ ورک، سی این بی سی نے ۱۸ فروری کو خبر دی کہ ایسی کمپنیوں کے حصص کی مالیت اسٹاک مارکیٹ میں راتوں رات بڑھ گئی۔ سرمایہ کار دھڑا دھڑ حصص خرید رہے ہیں کیونکہ انھیں اُمید ہے، نوول کرونا وائرس کی ویکسین چین اور دیگر میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حیاتیاتی جنگ و جدل کی تاریخ

لاٹھیوں اور تلواروں سے شروع ہونے والی جنگوں کے بدلتے عجیب و غریب رنگ و روپ

ابو سلیم

ناول کرونا وائرس بظاہر ایک آفت اور بیماری قرار پایا مگر دنیا میں کچھ حلقے اسے صرف وبائی مرض یا جانوروں سے جنم لینے والا وائرس ماننے کو تیار نہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ باقاعدہ ایک حیاتیاتی ہتھیار ہے جو چین جیسی معاشی سپر پاور کو کنٹرول کرنے اسے اور بھاری معاشی و معاشرتی نقصان پہنچانے کے لیے بنایا گیا۔ ان کا کہنا ہے، ماضی میں ایبولا، زیکا، نیپا، ایم آئی آر ایس، سارس، ڈینگی وغیرہ بیسیوں وائرس آئے جن سے دنیا بھر میں ہزاروں اموات واقع ہوئیں لیکن عالمی ذرائع ابلاغ میں اس قدر ڈنکا نہیں بجا اور نہ ہی کسی ملک کو عالمی تنہائی کا سامنا کرنا پڑا جیسے چین کے ساتھ ہوا۔ ووہان سمیت چین کے بڑے شہروں میں بالکل سناٹا طاری ہو گیا۔ کہیں کوئی انسان نظر نہ آتا۔

اس کے ساتھ چین کو معاشی حوالے سے شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی بین الاقوامی ٹیکنالوجی اور کار کمپنیوں نے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اپنے آپریشن اور کاروبار عارضی طور پر بند کردیے جس کی وجہ سے محتاط اندازے کے مطابق چین کو پچاس ارب ڈالر کا نقصان پہنچ چکا۔ یہ نقصان 1000 ارب ڈالر تک پہنچنے کا امکان ہے کیونکہ چین کی برآمدات و درآمدات سبھی ہوائی اور بحری اڈوں پر رک گئیں۔ دنیا جانتی ہے کہ چین کے اس شدید معاشی نقصان کا فائدہ کس کو ہوا۔ سنجیدہ حلقوں نے اسی بنیاد پر نئے کرونا وائرس کو چین پر حیاتیاتی حملہ یا بائیولوجیکل وار قرار دیا۔ اس موقف کو امریکی سیکرٹری برائے تجارت، ولبر روس کا عجیب وغریب انٹرویو تقویت دے گیا۔ ولبر روس نے کہا کہ چین میں پھیلنے والا مہلک کورونا وائرس امریکی معیشت کے لیے مثبت ثابت ہوسکتا ہے۔ ٹی وی چینل کو دیے گئے انٹرویو میں انھوں نے کہا: ''میرے خیال میں اس سے امریکا میں ملازمتیں واپس لانے میں تیزی آئے گی۔''

☆☆

یہ واضح ہے کہ لاٹھیوں اور تلواروں اور نیزوں سے شروع ہونے والی جنگیں ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں تک پہنچ کر ہی ختم نہیں ہوئیں بلکہ اب جانداروں کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے جنہیں حیاتیاتی ہتھیاروں کا نام دیا گیا۔ ان ہتھیاروں کے زہریلے مادے انسانی، حیوانی یا نباتاتی زندگی کا خاتمہ یا اُن کو بیمار اور مفلوج کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پاکستان میں جب گزشتہ چند برسوں سے ڈینگی کا مرض بڑھا تو یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگیں کہ یہ بیرونی قوتوں کی سازش ہے۔ حقیقت حال اللہ بہتر جانتے ہیں یا حکومتوں کے علم میں ہوگی۔ لیکن افواہیں ضرور ہیں۔ امریکا کی ''ڈی کلاسیفائیڈ'' دستاویز سے عیاں ہے کہ 1956ء سے 1958ء تک امریکی فوج نے سوانا، جارجیا اور اے وون پارک، فلوریڈا میں ''حیاتیاتی ہتھیار'' کے طور پر بطور تجربہ مچھر اور حشرات چھوڑے تھے۔ اسی دوران علاقے کے مکین حیرت انگیز طور پر مختلف النوع امراض کے نرغے میں رہے۔ مثال کے طور پر شدید بخار، برونکائٹس، ٹائیفائیڈ، انسیفلائٹس وغیرہ۔ اسی دوران کچھ اموات بھی ہوئیں۔

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو 1800ء تک ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی جب جراثیم کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ البتہ دیگر حیاتیاتی مظاہر بطور جنگی حکمت عملی استعمال کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ 600 قبل مسیح میں ایتھنز کے بادشاہ نے اپنے مخالفین کو زک پہنچانے کے لیے دریائی پانی کو ایک پودے کی جڑ سے زہریلا کر دیا تھا۔ دشمنوں نے جب وہ پانی پیا تو وہ شدید اسہال میں مبتلا ہو گئے۔ یوں شاہ ایتھنز نے وہ جنگ جیت لی۔ 200 قبلِ مسیح میں دوسری ''پیونک جنگ'' کے دوران عظیم کمانڈر، ہنی بال کے رسالہ دار، جنرل مہابل نے عجیب حکمتِ عملی اپنائی۔ اس نے جنگ کے دوران محاذ سے اس طرح پسپائی اختیار کی جیسے اُسے شکست ہوگئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے شراب کا ایک ذخیرہ بھی چھوڑ دیا۔

دشمنوں نے مال غنیمت سمجھ کر فتح کے جشن میں مفت کی شراب لنڈھائی لیکن جنرل نے اسے ایک زہریلی جڑی بوٹی کی جڑ کے شیرے سے لبریز کر دیا تھا۔ اسے پیتے ہی دشمن گہری غنودگی میں چلے گئے۔ جنرل مہابل واپس پلٹا اور مدہوش دشمنوں کی گردنیں اتارنا اُس کے لیے دشوار ثابت نہ ہوا۔

1343ء میں تاتاری حکمران، جانی بیگ نے بحر اسود کے کنارے آباد کریمیا، یوکرین کے ساحلی شہر کَفہ (موجودہ فیوڈوسیا) کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ تین برس تک جاری رہا۔ تین برس بعد جانی بیگ نے گوپھن کے ذریعے طاعون زدہ اجسام اور مُردوں کو شہر میں پھنکوا دیا۔ شہر میں طاعون پھوٹ پڑا۔ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ تاتاریوں نے باآسانی فتح پائی لیکن یہ واقعہ یورپ میں طاعون پھیلنے کا سبب بن گیا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ب یورپ میں ہر طرف طاعون کا دور دورہ تھا۔

حیاتیاتی ہتھیاروں کے استعمال کی تاریخ ''مہذب دنیا'' کے سیاہ کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ حشرات کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کی پہلی باقاعدہ مثال امریکی خانہ جنگی کے دوران سامنے آئی۔ تب ''ہارلیکوئن'' نامی کیڑے نے فصلوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ بہر حال یہ الزام کبھی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ جاپان نے چین سے جنگ کے دوران 1937ء سے 1945ء تک متعدد مرتبہ کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار استعمال کیے۔

روس بھی اس طرح کے تجربات میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ اس نے بھی دیگر ''مہذب'' اور ''ترقی یافتہ'' ممالک کی طرح تمام تر تجربات انسانوں ہی پر کیے۔ مغربی حکومتوں نے عام شہریوں، جنگی قیدیوں اور سیاسی قیدیوں کو چلتی پھرتی تجربہ گاہ بنا دیا گیا۔ 1941ء میں ایک ایسا ہی عفونت زدہ قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی وجہ سے منگولوں کے علاقے میں وبا پھوٹ پڑی۔ روس نے فوراً ہی وبا پر قابو پا لیا۔ دراصل روسیوں نے تمام عفونت زدہ منگولوں کو بم باری کر کے ختم کر دیا تھا۔ یوں وبا بھی ختم ہوئی۔ امریکیوں نے تو خیر ابتداء ہی سے حیاتیاتی ہتھیاروں کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ 1920ء سے اس ''کارِ عفونیت'' میں مصروف ہیں۔

1925ء میں لیگ آف نیشنز کے تحت ایک معاہدہ ہوا جس میں چالیس ممالک شامل ہوئے۔ معاہدے کی رو سے ایسے زہریلے حیاتیاتی مادے اور گیسیں جو عشی، سکتہ یا دم گھٹنے کی صلاحیت رکھتی ہوں، جنگ میں ان کا استعمال روک دیا گیا۔ 1972ء میں معاہدہ بہتر بناتے ہوئے کہا گیا کہ حیاتیاتی مادے کسی صورت میں جنگوں میں استعمال نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔

جب معاہدے پر دستخط ہو گئے اور حیاتیاتی ہتھیاروں کی تیاری غیر قانونی قرار پائی تو یہ تمام تر معاملہ انتہائی اخفا میں

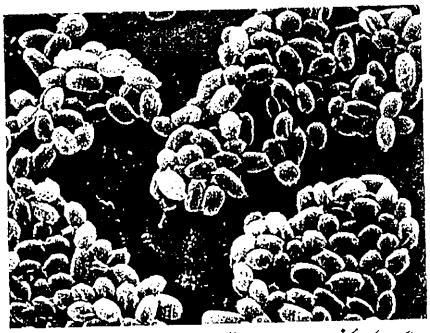

چلا گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ ترقی یافتہ ممالک حیاتیاتی ہتھیار بنا رہے ہیں یا نہیں۔ جدید دور کی مگر یہ بدنما حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی طاقت ور حکومتیں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر اثر ہیں۔ کچھ پسِ پردہ ہاتھ اور عوامل جنم لے چکے جو اشرافیہ کو نوازتے اور انھیں طاقتور بناتے ہیں۔ یہ لوگ پھر حکومت میں آنے کے بعد بڑی کمپنیوں کے خلاف کوئی قانون سازی کس طرح کر سکتے ہیں؟ جب بھی کہیں کوئی وبا پھوٹے تو اس کا صاف اور سیدھا مطلب ہے..... بڑا دھندا، بڑی کمائی۔ فارما کمپنیوں کی دواؤں، ٹیکوں اور ویکسینوں کی دھڑا دھڑ فروخت، اسپتالوں اور ڈاکٹروں کی کمائیاں..... کیا اس بات سے انکار ممکن ہے؟ کیا یہ تمام تر سرمایہ کاری جدید سائنس اور مہذب ممالک کی حکومتوں کے بغیر ممکن ہے؟

برطانوی لیبارٹری ''اوکزی ٹیک'' نے ڈینگی بخار سے نپٹنے کے لیے جینیاتی انجینئرنگ سے مچھر تیار کیے۔ 2009ء میں یہ جزائر غرب الہند کے جزیرے ''گرینڈ کیمین'' میں چھوڑے۔ 2010ء میں ایسے 30 لاکھ مچھر خفیہ طریقے سے دیگر علاقوں میں بھی چھوڑے گئے۔ سوال یہ ہے دیوہیکل کمپنیوں، حکومتوں اور سائنس دانوں کو کیا یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے خطرناک اور جینیاتی طور پر متغیر حشرات دنیا بھر میں چھوڑتے پھریں جو انسانی لہو پر پلتے ہوں؟ کیا انسانیت کے یہ دشمن تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ کہلائے جا سکتے ہیں؟

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

عالیہ احمد

دنیا کی بدنام ترین کارپوریشن

زراعت کو کیمیائی مادوں سے آلودہ کر کے انسانی صحت سے کھلواڑ کرنے والی مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں مونسانتو (Monsanto) سرفہرست ہے۔ اس امریکی کمپنی نے بقائے زندگی کے لیے ضروری وسائل تک زہریلے کر ڈالے۔ صحت بخش ادویات کی آڑ میں سم قاتل تیار کیے، مسیحائی کو کمائی کا دھندا بنا لیا۔ اسی کی دیکھا دیکھی بڑے دوا ساز ادارے دیدہ و دانستہ ایسی دوائیں تیار کرنے لگے جو ایک مرض میں استعمال ہوں، تو اس سے زیادہ ہولناک دوسرے امراض پیدا کر دیتی ہیں۔

کمپنی نے خوراک کی پیداوار بڑھانے کے نام پر ایسی

ایک مغربی کمپنی نے کمائی کے نت نئے طریقے اختیار کر کے مسیحائی کو بدنام کر ڈا

کھادیں اور بیج تیار کیے جو نہ صرف مضرِ صحت فصلیں پیدا کرتے بلکہ ان کے تیار کردہ بیج زمین بانجھ کر ڈالتے ہیں۔ ایک بار جس قطعے میں یہ بیج استعمال ہو، وہاں پھر کسی اور بیج کی دال نہیں گلتی۔ اسی لیے اسے ''دنیا کی سب سے بڑی شیطانی کارپوریشن'' (The World's Most Evil Corporation) کا خطاب ملا۔ یہ کارپوریشن جان فرانسس کوئینی نے امریکی شہر، سینٹ لوئیس میں 1901ء میں بطور کیمیکل کمپنی قائم کی۔

پہلا کیمیائی مادہ

کمپنی نے پہلی بار مصنوعی مٹھاس، سکرین (Saccharin) بنائی۔ یہ کیمیکل پہلے نہیں بنتا تھا۔ یہ سکرین اس نے کوکا کولا کمپنی کو فروخت کیا۔ جلد اس کے انسانی صحت پر منفی اثرات ظاہر ہوئے۔ حکومت نے اس کی پیداوار پر پابندی عائد کر دی لیکن وہ عدالت میں اپنا کیس ہار گئی۔ اس طرح سکرین اور اس سے بننے والی سافٹ ڈرنک مقبولیت کے زینے طے کرنے لگی۔ 1920ء تک مونسانتو خوب پھلی پھولی۔ بعدازاں وہ دیگر کیمیکل اور ادویہ بھی تیار کرنے لگی۔

اسپرین بھی اسی نے تیار کی تھی۔ جلد وہ اسپرین بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی، جو ایک تیزابی کیمیائی مادے سے بنائی گئی تھی۔ اسی دوران اس کمپنی نے پولی کلوری نیٹڈ بائی فینائلز (PCBs) متعارف کرایا۔ یہ تیل انتہائی غیر اثر پذیر ہے، اتنا کہ اسے آگ بھی نہیں پکڑتی۔ صنعتوں میں مختلف طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ کیمیکل تباہ کن ہے۔ جانداروں میں کینسر پیدا کرتا ہے، انسان کی تولیدی صلاحیت کمزور کرتا اور مدافعتی نظام تہس نہس کر دیتا ہے۔ آخر اس پہ پابندی لگا دی گئی۔ جب عدالت میں دستاویزات پیش کی گئیں تو دوران جرح معلوم ہوا، کمپنی کیمیکل کے مہلک اثرات سے آگاہ تھی۔ لیکن اس نے اس کے نقصانات پر مجرمانہ پردہ ڈالے رکھا اور PCBs بڑی مقدار میں دنیا بھر میں فروخت کرتی رہی۔

1930ء کی دہائی میں کمپنی نے زراعت کا رخ کیا اور مکئی کا سب سے پہلا ہائی برڈ بیج متعارف کرایا، جو ڈیٹرجنٹ، صابنوں، صنعتی صفائیوں، مصنوعی ربڑ کی تیاری اور پلاسٹک بنانے میں کام آتا اور انتہائی زہریلا ہوتا ہے۔ 1940ء کے بعد مونسانتو یورینیم پر تحقیق کرنے لگی جو مین ہٹن پراجیکٹ میں کام آئی اور نتیجتاً پہلے ایٹم بم وجود میں آئے۔ انھیں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا کر لاکھوں جاپانی، کوریائی اور خود امریکی اہلکار بھسم کر دیئے گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی کمپنی نے اسپرین تیار کرنے والی دو معروف و مقبول دواساز کمپنیوں، آئی جے فبین اور بائر کے اشتراک سے زائیکلون۔ بی (Zyklon-B) نامی کیمیکل تیار کیا۔ اعصاب تباہ کرنے والا مرکب اسپرٹیم (Aspartame) بھی متعارف کرایا جو فوجیوں کے کھانوں میں شامل کیا جاتا۔ یہ بھی سکرین کی طرح زہریلا جوہر ہے۔

ڈائی آکسین کی ایجاد

کمپنی نے پھر ایسی کیڑے مار دوائیں ایجاد کیں جو مہلک زہروں پر مشتمل ہیں۔ ان ادویہ کے چھڑکاؤ سے خوراک اور پانی مسموم ہوگئے۔ بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ کمپنی ان ادویہ میں ڈائی آکسین (Dioxin) نامی کیمیائی مادہ استعمال کرتی ہے۔ یہ کیمیکل کرہ ارض کو جہنم بنا سکتا ہے۔

دولت کی ہوس میں مونسانتو نے بچوں تک کو معاف نہیں کیا۔ 1956ء میں ادارے نے والٹ ڈزنی کمپنی کے ''ٹومارولینڈ'' (Tomorrowland) کی خاطر مختلف کیمیکلز سے بنے پلاسٹک کے ذریعے اشیا تیار کیں۔ بعدازاں یہ عقدہ کھلا کہ یہ پلاسٹک جراثیم کی پرورش اور افزائش کرتا ہے۔ والٹ ڈزنی کے ''ٹومارولینڈ'' سے 1957ء تا 1967ء یعنی دس برس تک بیس کروڑ بچے اور بڑے بیمار

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہوئے۔ جب یہ حقیقت افشا ہوئی تو اس ٹومارولینڈ کو ڑ دیا گیا۔

1960ء ہی کی دہائی میں مونسانتو نے ایک اور ادارے، ڈاؤ کیمیکل کے اشتراک سے امریکی فوج کو ویت نام میں استعمال کے لیے ڈائیاکسن (Dioxin) سے جانداروں کی کھال جھاڑ دینے والا ایک مادہ، ایجنٹ اورنج تیار کر کے دیا۔ اس شیطانی مادے کے اثرات ویت نام کے لاکھوں لوگ آج تک بھگت رہے ہیں۔

1970 کے عشرے میں مونسانتو نے جی ڈی سیرل دواساز کمپنی کے اشتراک سے یہ دعویٰ کیا کہ اسپرٹیم ایک محفوظ شیرینی ہے۔ اس کے برعکس امریکا کے ادارے ایف ڈی اے (Food and Drug Administration) نے اپنے طور پر اسپرٹیم کو تجربات سے گزارا تو معلوم ہوا کہ اس دوا کے زیر اثر رکھے گئے چوہے انتہائی اذیت میں ہلاک ہوئے اور مرنے سے پہلے ان کے مغز میں سوراخ پڑ گئے۔ یہ معلوم ہونے پر کمپنی کے خلاف گرینڈ جیوری قائم کی گئی اور کمپنی کو مطعون کیا گیا کہ اس نے جانتے بوجھتے اسپرٹیم کو محفوظ قرار دیا۔ اس وقت مستقبل میں امریکا کا وزیر دفاع، ڈونلڈ رمز فیلڈ جی ڈی سیرل کا سی ای او تھا۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر دونوں مجرم کمپنیوں کو بچا لیا۔

1980ء کی دہائی میں رمز فیلڈ کی بھاگ دوڑ کے باعث صدر ریگن نے اسپرٹیم کو خشک اشیا میں قابل استعمال قرار دے دیا۔ اس جعلی شکر کی منظوری ویسے ہی المیہ ہے۔ صدر ریگن کے حوالے سے اس کی المناکی یوں بڑھ گئی کہ وہ خود جیلی بین اور کینڈی کھانے کے شوقین تھے۔ نتیجہ انھوں نے بڑی اذیت سے بھگتا۔ ان کی پسندیدہ اشیا اسپرٹیم سے شیریں کی جاتی تھیں۔ سو بوڑھے ریگن الزائمر کا ایسا شکار ہوئے کہ مرنے سے بہت پہلے خود سے اجنبی ہو چکے تھے۔

1983ء میں کوکا کولا اپنی ڈائیٹ بوتلوں میں اسپرٹیم استعمال کرنے لگا۔ اس کی فروخت حیرت انگیز طور پہ بڑھ گئی۔ کروڑوں افراد ڈائیٹ کوک کے عادی ہو گئے۔ اس کے بعد تو دیگر سوفٹ ڈرنکس بنانے والوں کی جھجک ختم ہو گئی اور وہ بھی اسپرٹیم کو برتنے لگے۔

اسپرٹیم کے مسلسل استعمال سے پیدا ہونے والے عوارض میں جنون، تشدد، نظر زائل ہونا، جوڑوں کا درد، درماندگی، وزن بڑھنا، چھاتی میں درد، بے سدھ ہونا، بے خوابی، سن ہونا، ڈی پریشن، جکڑن، ناطاقتی، مرگی، اشتعال، متلی، بہرہ پن، یادداشت کا خاتمہ، جلد کی تکالیف، چکر، سردرد، اضطراب، دھڑکن کی بے قاعدگی، غشی، اعضا کا مڑنا، اسہال، انتشار، منہ کی جلن وغیرہ شامل ہیں۔ ان بیماریوں کا غلغلہ بلند ہوا، تو ایف ڈی اے کے عہدیدار آرتھر ہل نے استعفیٰ دے دیا۔ مگر استعفیٰ کی روشنائی سوکھنے سے پہلے ہی اسے مونسانتو کے تعلقاتِ عامہ کے شعبے میں بھاری مشاہرے پر سائنٹیفک کنسلٹنٹ رکھ لیا گیا۔ ماہرین کا دعویٰ ہے، امریکا میں تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں ایف ڈی اے اور دیگر حکومتی ریگولیٹری ایجنسیوں کی ملی بھگت سے کام کرتی ہیں۔ لگتا ہے کہ ایف ڈی اے کی کمشنری کے عہدے پر فائز ہونے کے لیے یہ شرط ہے، وہ فارماسیوٹیکل کارٹل کو وقت دیتا ہو۔

امریکی بیوروکریسی سے سازباز

1990ء کی دہائی میں ان کمپنیوں نے ریاستی اور وفاقی قوانین کو شکست دینے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کیے۔ امریکا میں ریاستی اور وفاقی قانون ساز ادارے ڈائی آکسین، کیڑے مار ادویہ اور سرطان افزا زہروں کے باعث پینے کے پانی کے نظام کو آلودہ کرنے پر قدغن عائد کرتے ہیں۔ پلانٹ پر کام کرنے والے افراد یا قرب جوار کے رہائشیوں اور بچوں میں پیدائشی نقائص آشکارا ہونے پر ''دی موسٹ ایول کارپوریشن'' کو کئی بار قانون کی زد میں لایا گیا تاہم ادارہ اپنی بے پناہ دولت اور اثر و رسوخ کے بل

www.pakistanipoint.com

بوتے پر ہر بار معصوم بن کر بچ نکلا۔ اربوں ڈالر کا منافع بٹورنے والا یہ ادارہ ایف ڈی اے، کانگریس اور وائیٹ ہاؤس کی مہربانی سے صرف ایک سو ملین ڈالر کی ادائیگیاں کر کے سارے گناہوں سے پاک صاف ہو گیا۔

1994ء میں مونسانتو نے ایک نئی دوا، بووائن گروتھ ہارمون (Bovine Growth Hormone) متعارف کرائی۔ اسے ای کولی بیکٹیریا میں جینیاتی تبدیلی کر کے بنایا گیا تاکہ مویشی اسے کھا کر زیادہ دودھ دے سکیں۔ اس کے مہلک اثرات کے خلاف سائنس دانوں نے بہت واویلا مچایا لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور ایف ڈی اے نے اس کی منظوری دے دی۔ کمپنی کا دعویٰ تھا کہ پیپ دار مواد والا دودھ نہ صرف انٹی بایوٹک اثرات اور ہارمون سے مالا مال اور محفوظ بلکہ انسانی صحت کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ جب ڈیری کمپنیوں نے یہ ہارمون استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی مصنوعات کے لیبلوں پر rBGH Free لکھنے لگیں۔ کمپنی نے ان پر مقدمہ قائم کر دیا کہ وہ ہارمون بنانے والی کمپنیوں کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ گویا مونسانتو نے تسلیم کر لیا کہ یہ ہارمون نقصان دہ ہے لیکن اس امر کا اعلان کرنا جائز نہیں کہ ہماری مصنوعات اس سے پاک ہیں۔

1995 میں اس کمپنی نے ''جی ایم او فصلیں'' (GMO Crops) متعارف کرائیں۔ یہ جینیاتی فصلیں اپنے اندر کرم کش اور نباتات کش صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے اردگرد اضافی گھاس پھوس یا جڑی بوٹیاں از خود تلف ہو جاتی ہیں۔ سرسوں، سویابین، مکئی اور کپاس کے ان بیجوں نے اپنی اس خاصیت کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔

انہیں محفوظ، صحت مند اور نامیاتی اجناس پر برتر ثابت کرنے کی زوردار تشہیری مہم چلائی گئی جو کامیاب رہی۔ سو اب منڈی میں دستیاب بیشتر کینولا یہ ہی جی ایم او کینولا ہے۔

ان فصلوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ فصلیں اپنا زرگل (Pollination) بھی خود کرتی ہیں، یعنی خود کو کہیں اور منتقل کرنے کے لیے انہیں پرندوں، مکھیوں یا بھڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس بات کا تاریک پہلو یہ کہ جی ایم او بیجوں کے استعمال سے روئے ارض پر شہد کی مکھی باقی نہیں رہے گی۔ شہد کی مکھی اور متعدد ایسے کیڑے مکوڑوں کا وجود اس لیے بہت ضروری ہے کہ یہ مختلف پودوں کی افزائش کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ لیکن جب شہد کی مکھی جیسے جاندار جی ایم او پودوں سے رس چوسنے کی کوشش کریں تو ان کے زہریلے اثرات سے مر جاتے ہیں۔ اس طرح یہ مخلوق دنیا سے معدوم ہو جانے کا خدشہ ہے۔ مونسانتو کے عزائم میں یہ امر شامل ہے کہ دنیا کے زرعی نظام پر تسلط حاصل کیا جائے۔

جب یہ امریکی کمپنی انسانیت کے لیے مضر صحت اپنی سرگرمیوں سے بہت زیادہ بدنام ہو گئی تو اسے فروخت کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چناں چہ جون 2018ء میں اسے ایک اور بڑی کمپنی، بائیر نے خرید لیا۔ تاہم مونسانتو کی مضر صحت مصنوعات کی تیاری ماضی کے مانند بدستور جاری ہے۔ ◆◆◆

Warda Azeem
www.pakistanipoint.com

سفارش طلب کون ہوتے ہیں؟ کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اپنی غرض میں کس حد تک چلے جاتے ہیں؟ کیا نہیں کر گزرتے؟ آپ یہ حقائق جاننا چاہتے ہیں تو کرنل محمد خان کی کتاب ''بزم آرائیاں'' میں باب سفارش طلب پڑھ لیجیے۔

ہم جن دو سفارش طلب حضرات کا ذکر کرنے لگے ہیں، وہ کس حد تک صحیح تھے یا غلط، یہ فیصلہ آپ کیجیے۔

آپ بیتی

سفارشیوں کے نرغے میں

بریگیڈیئر محمد اسماعیل صدیقی

ایجوکیشن کور میں ہونے کی حیثیت سے ہمارے پاس بھی امتحانی پرچے بغرض مارکنگ آتے تھے۔ سفارشیوں سے بچنے کے لیے کوشش یہی ہوتی تھی کہ جتنی جلد ہو سکے، پرچے دیکھ، نمبر لگا کر فوراً واپس کر دیے جائیں۔

تاکہ جب کوئی سفارش یا سفارشی پہنچے ہم اس فرض سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔ اس طرح کام کرنے کے لیے دن رات محنت کرنی پڑتی تھی۔ کوشش یہی ہوتی جیسے جیسے پرچے مارک ہوتے جائیں، انھیں اپنے ڈائریکٹوریٹ پہنچا دیا جائے لیکن یہاں ایک رکاوٹ آڑے آجاتی۔

تب ہمارے پاس سواری نام کی شے صرف ایک سائیکل ہوتی تھی۔ اس پر ان پرچوں کے گنے چنے بنڈل ہی جا سکتے تھے۔ کبھی کبھار ایسا اتفاق بھی ہو جاتا کہ پرچے سائیکل پر اٹھائے جانے کی گنجائش سے زیادہ تیار ہو جاتے۔ تب یہ امر مجبوری ان میں سے کچھ بنڈلوں کی چھانٹی کر انھیں اگلے روز لے جانے کے لیے گھر چھوڑنا پڑتا۔

لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دن ایسا ہی ہوا۔ کچھ بنڈل گھر چھوڑ کر جانے پڑے لیکن انھیں پیچھے چھوڑ کے جانے کا عمل بالکل اٹکل پچو تھا، ایسی کوئی تشخیص نہ تھی کہ کس بنڈل کو لے جایا، کسے چھوڑ دیا جائے۔ یہی حقیقت اس واقعے کا اہم پہلو ہے۔

اس دن شام کے وقت مجھے کہیں جانا پڑ گیا۔ دن ڈھلے میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ بڑی دیر سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں جا کر ان سے

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

بوالعجب انسانوں کی کتھا جنھیں اپنی غرض کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا

ااا۔ وہ کوئی ریٹائرڈ میجر صاحب تھے اور گھڑیال کے ریفرنس سے اپنا تعارف کروایا۔ اپنی سروس کے بالکل ابتدائی دور میں میری بھی وہاں تعیناتی رہ چکی تھی لیکن شاید ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ گھڑیال میں تب واقع ادارے کا میرے دل میں احترام تھا۔ کیونکہ وہ میری ملازمت کا پہلا تعیناتی مقام تھا۔

میں نے آمد کی غرض پوچھی تو کہنے لگے کہ میرا بھائی حوالدار ہے۔ اس نے سپلی آنے والے صرف ایک پرچے کا امتحان دے رکھا ہے۔ یہ اس کا آخری چانس ہے۔ اگر فیل ہو گیا تو گھر بھیج دیا جائے گا۔ اگر پاس ہوا تو اس کی جے۔ سی۔ او۔ رینک میں پرموشن ہو جائے گی۔

میں نے پرچے واپس کر دینے والی مجبوری بیان کی اور بتایا کہ امکان تو یہی ہے، پرچے واپس چلے گئے ہوں گے لیکن جو پیچھے رہ گئے ہیں، انھیں احتیاطاً دیکھ لیتا ہوں۔

دیکھا تو اس کا پرچہ موجود تھا اور وہ اس بنڈل میں موجود تھا جو اسی روز صبح میں زائد از گنجائش ہونے کی بنا پر گھر چھوڑ گیا تھا۔ اُمیدوار نے سو میں سے پینتالیس نمبر لیے تھے۔ گویا ضابطے کے مطابق 5 نمبر سے فیل ہو رہا تھا۔ اب اکثر ممتحن ذرا کمزور اُمیدواروں کو ایک دم پاس کرنے کے بجائے پانچ نمبر کی گنجائش پر لا کر چھوڑ دیتے تھے کہ اعلیٰ ممتحن اس کا کیس دیکھتے ہوئے اُسے 5 نمبر بطور ''Grace Marks'' یعنی رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیں لیکن ایسا تبھی ممکن ہو سکتا تھا جبکہ اس نے مکمل امتحان دیا ہو۔ اگر وہ سپلی والا اُمیدوار ہوتا تو اس رعایت سے محروم ہو جاتا۔ اور یہ حوالدار ایسا ہی اُمیدوار تھا۔

میں میجر صاحب کی زبانی اس امیدوار کی حالت زار اچھی طرح سن اور سمجھ چکا تھا۔ یہ حسنِ اتفاق بھی میری نظر سے اوجھل نہ تھا کہ بلا کسی جانے بوجھے ارادے کے، صرف اتفاقاً ہی ان صاحب کا پرچہ روانہ ہونے سے رہ گیا تھا لیکن کیا یہ محض اتفاق ہی تھا یا قدرت کو اس فرد کی مدد منظور تھی؟ اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ یہ تو صناع قدرت کے پاس ہی تھا۔ وہی جو سب رازوں کا جاننے والا ہے۔

سو میں نے اُسے اپنی جانب سے پانچ رعایتی نمبر دے دیے (یہ میرا صوابدیدی استحقاق تھا)۔ یوں وہ صاحب سیکڑوں شکریے ادا کرتے ہوئے خوشی خوشی لوٹ گئے۔

اس کے بعد وہ میجر صاحب اکثر راہ چلتے بازار میں سے گزرتے ملتے اور اپنے بھائی پر کیے جانے والے احسان کا شکریہ ادا کرتے۔ ساتھ ساتھ اس کی پروموشن اور ترقی کی منزلوں کو طے کرنے کا بھی بتاتے رہتے۔ حتیٰ کہ ایک دن بتایا کہ وہ صوبیدار میجر کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائرڈ ہو گیا ہے۔ یوں ان پانچ نمبروں کی بنا پر نہ صرف یہ کہ وہ قبل از وقت ریٹائر ہو جانے سے بچ گیا بلکہ لگ بھگ چودہ برس مزید ملازمت کرنے کے بعد اپنے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوا۔

اس امر سے قطع نظر کہ آیا میں نے وہ سفارش قبول کر کے صحیح کیا یا غلط؟ آپ ایک قاری کی حیثیت سے اس کے نتائج و عواقب پر غور کریں اور یہ کہ سب کچھ کرنا کیا عملاً صرف میرے اختیار میں تھا؟ یا میں صرف ایک بڑے نظام میں انتہائی مختصر اور حقیر سا پرزہ تھا جس نے اس شخص کی قسمت کو آخری حد تک پہنچانے میں انتہائی مختصر سا کردار ادا کرنا تھا۔ اگرچہ فائدہ کسی اور کا ہونا تھا لیکن یہ نیکی مجھ گنہگار کے ہاتھوں سے سرزد ہونی تھی۔

لگ بھگ اسی زمانے کا ذکر ہے، ایک دن ملتان کے معزز گھرانے کے کھاتے پیتے زمیندار تشریف لے آئے۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اُن سے ہمارے قریبی خاندانی تعلقات تھے۔ وہ جب بھی ادھر آتے ہمارے ہاں ہی قیام کرتے۔ یوں تو ملاقات ہوتی ہی تھی، اس بار انھوں نے بطورِ خاص بلوا بھیجا۔ ملاقات پر بتایا کہ اس دفعہ ان کی آمد ایک خاص کام اور مقصد سے تھی۔

ان کے ایک بچے نے ایف ایس سی کا امتحان دے رکھا تھا۔ اس کا ایک پرچہ گورڈن کالج راولپنڈی کے ایک پروفیسر کے پاس برائے مارکنگ آیا ہوا تھا۔ اس تک سفارش پہنچانی تھی کہ بچے کا خیال رکھے۔ کہنے لگے، میں نے سوچا چونکہ تم بھی اس کالج کے پرانے طالب علم ہو۔ مقامی ہو، کچھ نہ کچھ جان پہچان ضرور ہوگی اس لیے تمھاری سفارش کام آسکے گی۔

انھوں نے جن صاحب کا نام بتایا ان سے میں قطعی ناواقف تھا۔ وہ کوئی نئے صاحب تھے۔ میں نے اس حقیقت سے آگاہ کیا تو کہنے لگے کہ مجھے اُمید ہے، آپ کوئی نہ کوئی واقفیت نکال لیں گے۔

مجھ تک اپنی یہ ضرورت بتا کر وہ تو مطمئن ہوگئے البتہ مجھے ایک مخمصے میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کچھ ادھر اُدھر پوچھا۔ لیکن یونہی رواداری میں اور کوشش یہ کہ ان کا سامنا ہی نہ ہو لیکن غرض مند کب ایسی صورتِ حال برداشت کرتے ہیں؟ ایک دن انھوں نے ایک عزیز کی دکان پر گھیر لیا۔ پھٹ پڑے اور بڑے جلال میں بولے:

''میں اتنے دنوں سے آیا بیٹھا ہوں۔ آپ ہیں کہ کام ہی نہیں کر کے دے رہے۔ بچے کے امتحان کے سلسلے میں اب تک پندرہ ہزار روپیہ خرچ کر چکا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو مزید خرچ کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔ آپ ہیں کہ توجہ ہی نہیں دیتے۔ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ جیسے بھی ہو میرا کام کریں۔''

بس انھوں نے ''ورنہ'' کی دھمکی نہیں دی۔ لیکن ان کا لب و لہجہ اس سے کچھ کم نہ تھا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا اور وہ کسی لحاظ سے بھی خوشگوار نہ ہوتا۔ اب تو واقعی فکر پڑ گئی کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ آخر ایک پرانے ہم جماعت اور بچپن کے دوست پروفیسر محمد شفیق کو پکڑا۔ اس سے اپنی مشکل بیان کی۔ اس نے بتایا، ہاں وہ صاحب جن کے پاس پرچہ آیا، ان کے واقف ہیں۔ سو ایک دن وقت طے کر کے ہم دونوں ان کے پاس جا پہنچے۔

وہ صاحب فی الواقعی کوئی بہت ہی اچھے شخص تھے۔ وہ اپنے ہاسٹل کے کمرے میں لے گئے اور تمام پرچے لا کر ہمارے سامنے رکھ دیے اور کہا: ''جس سنٹر اور پرچے کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔ آپ بے شک خود تسلی کر لیں۔''

اور ہم نے دیکھا ان کا کہنا درست تھا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ جس رول نمبر کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہ غالباً کیمبل پور (تب تک اس کا نام اٹک نہیں ہوا تھا) کے کسی پروفیسر کے پاس ہوسکتے ہیں۔ یوں ہم ان اطلاعات سے آگاہ ہونے کے بعد اپنے ملتانی کرم فرما کے پاس پہنچے۔ انھوں نے جب یہ بات سنی تو وہ بہت حیران ہوئے اور بلا حقیقت چھپائے کہہ اُٹھے:

''اچھا تو پھر اس شخص نے ہم سے پیسے لیے اور اطلاع بھی غلط پہنچائی۔''

اب ہمیں علم نہیں کہ وہ کیمبل پور پہنچے یا نہیں۔ انھوں نے اپنے برخوردار کی کامیابی کے لیے مزید رقم خرچ کی کہ نہیں؟ کیونکہ پھر کبھی اس معاملے کا ذکر نہیں آیا۔ لیکن ایک بات سمجھ میں خوب آئی کہ غرض مند اپنی خواہش پوری کرنے کی خاطر ہر حد تک جا سکتا ہے؟ اُسے سوائے اپنی غرض کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

ابو صارم

آسٹریلیا میں اونٹ مصیبت بن گئے

پچھلے ماہ کے دوران آسٹریلیا کے جنگلوں میں لگی آگ سرخیوں کی زینت بنی رہی۔ جب پاکستان میں موسم سرما ہو، تو براعظم آسٹریلیا میں موسم گرما کا آغاز ہوتا ہے۔ گلوبل وارمنگ یا عالمی گرماؤ کے سبب آسٹریلیا میں گرمیوں کے دوران درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ اس اضافے کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ شدید گرمی سے جنگلوں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر ہوا تیز چلے اور گرمی کی شدت برقرار رہے، تو وہ آگ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ پچھلے چند ماہ کے دوران یہی ہوا۔

ستمبر اکتوبر 2019 میں مختلف آسٹریلوی جنگلات میں آگ لگی اور پھیلتی چلی گئی۔ تادم تحریر 73 ہزار مربع میل رقبے پر پھیلے جنگلات آگ کی زد میں آکر صفحہ ہستی سے مٹ چکے۔ وہ ساڑھے چھے ہزار عمارتیں نگل گئی اور تیس افراد لقمہ اجل بنے۔ سب سے زیادہ نقصان حیوانات اور نباتات کو پہنچا۔ خدشہ ہے کہ آگ کے حالیہ واقعات میں ایک ارب مختلف چرند پرند موت کے منہ میں چلے گئے۔ بعض اقسام تو ناپید ہوگئیں۔ انسانی سرگرمیوں کے سبب جنم لینے والی گلوبل وارمنگ کا یہ بڑا بھیانک روپ ہے جس نے آسٹریلیا کو نشانہ بنا رکھا ہے۔

کم ہی پاکستانی جانتے ہیں کہ یہ بدقسمت براعظم ایک اور مصیبت کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ یہ ہے جنگلی اونٹوں کی بے پناہ

یہ جانور کبھی انسان کا مددگار تھا مگر اب اس کے جتھے آبادیوں میں تباہی پھیلا رہے ہیں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آسٹریلیا کے اولیں افغان اونٹ سوار

آبادی! وسطی آسٹریلیا کے جنگلوں میں آج تین لاکھ سے زائد جنگلی اونٹ گھوم رہے ہیں۔ ان کی اتنی بڑی تعداد اب مقامی باشندوں کے لیے آفت یا موذی (Pest) بن چکی۔ جنگلی اونٹ کیونکر انسانوں کے لیے وبال جان بن گئے، یہ جاننے سے قبل آسٹریلیا میں اس حیوان کی تاریخ پڑھ لیجیے جو دل چسپ ہے اور ڈرامائی بھی۔

یہ 26 فروری 1606 کی بات ہے، جب ولندیزی مہم جو، ولیم جان سوزن نے براعظم آسٹریلیا پر قدم دھرے۔ وہ اس دور دراز مقام پر واقع براعظم میں قدم دھرنے والا پہلا یورپی تھا۔ ولیم نے چند دن ہی آسٹریلیا میں قیام کیا۔ اگر وہ اندرونی علاقوں کا رخ کرتا تو وہاں مقامی باشندوں (ایبوریجنل) سے اس کی ملاقات ہو جاتی۔

لیکن اندرون آسٹریلیا جانے کی خاطر مال برداری کے جانور درکار تھے۔ ان کی عدم موجودگی کے سبب ہی ولیم ساحل سمندر پر ہی مقیم رہا۔ تب آسٹریلیا میں ایک بھی اونٹ موجود نہ تھا۔ جی ہاں، تب براعظم میں اونٹ بالکل عنقا تھے۔ یہ جانور انیسویں صدی میں انگریز آسٹریلیا لائے تاکہ اندرون علاقوں میں سفر کر کے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر سکیں۔

ہمارے ہاں مشہور ہے کہ آسٹریلیا میں اولین اونٹ ہندوستان یا افغانستان سے گئے تھے، مگر یہ بات غلط ہے۔ انگریزوں نے سوچا ضرور تھا کہ ہندوستان سے اونٹ درآمد کیے جائیں مگر پھر انھوں نے بحراوقیانوس میں واقع جزائر کناری (Canary) سے اونٹ منگوانے کا فیصلہ کیا۔

جزائر کناری سے ایک کوہان والے 46 اونٹ منگوائے گئے مگر ان میں سے صرف ایک ہی منزل تک پہنچ سکا۔ بقیہ بحری سفر کے دوران ہی راہی عدم ہوئے۔ آسٹریلیا پہنچنے والے اکلوتے اونٹ کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ اسے جے اے ہوریکس نامی ایک مہم جو نے خریدا اور اس کا نام ہیری رکھا۔ یہ اکتوبر 1840 کی بات ہے۔

ہوریکس شکار کا شوقین تھا۔ ایک دفعہ وہ ہیری پر سوار تھا کہ اسے بڑا خوبصورت پرندہ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً بندوق نکالی اور پرندے کا نشانہ لے لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا ہیری بدک گیا۔ سوار بڑبڑا اٹھا۔ اسی دوران گولی چلی اور ہوریکس کے گال میں جا گھسی۔ اس کے دانتوں کا کباڑا ہو گیا۔

مضروب ہوریکس کا علاج ہوا مگر زخم سے پورے جسم میں زہر گیا۔ ہوریکس نے غصے میں آ کر ہیری کو مار ڈالا۔ مگر وہ بھی نہ بچ سکا اور چند دن میں خدا کو پیارا ہو گیا۔ یوں براعظم آسٹریلیا کا پہلا اور اکلوتا اونٹ اپنے ہی مالک کے ہاتھوں چل بسا۔

تاہم ہیری بار برداری میں بہترین جانور ثابت ہوا تھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گھوڑے تو صحرا میں چل نہ پاتے اور جلد ہی بیمار پڑ جاتے۔ ہیری اپنے مالک کو مختلف صحرائی علاقوں میں لیے لیے پھرتا۔ اس سخت جان جوان کی بہترین کارکردگی دیکھ کر ہی آسٹریلوی انگریز ہندوستان اور دیگر علاقوں سے مزید اونٹ منگوانے لگے۔ یہ جانور بغیر پانی پیے کئی دن نہ صرف زندہ رہتا بلکہ اپنے کام بھی بخوبی کرتا تھا۔

اونٹ سفر اور بار برداری کی دگنی ذمے داریاں انجام دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے، اگلے عشروں میں ہندوستان، افغانستان اور عرب ممالک سے بیس ہزار اونٹ آسٹریلیا پہنچ گئے۔ اونٹوں کے ساتھ ان کے رکھوالے بھی آئے جن میں سے بیشتر مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں نے اگلے پچاس برس کے دوران آسٹریلیا کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ مسلمان ایبورینجل باشندوں سے گھل مل گئے اور ان کی تبلیغ اسلام سے بعض مقامی باشندے مسلمان بھی ہوئے۔

1950 کے بعد آسٹریلیا میں اونٹوں کی اہمیت کم ہونے لگی۔ وجہ یہ تھی کہ اب سڑکوں پر گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں۔ یہی وجہ ہے، اونٹوں کے کئی مالکان نے اپنے جانوروں کو جنگلوں میں بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ لیکن آسٹریلوی جنگلی اونٹوں کو راس آ گئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان میں کوئی خونخوار جانور موجود نہ تھا۔ لہٰذا اونٹ کھلے جنگلوں میں بڑے آرام سے رہنے لگے۔

ایک اونٹ پچیس سے چالیس برس زندہ رہتا ہے۔ اونٹنی ہر دو سال بعد بچہ دیتی ہے۔ جنگلوں میں ان کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ 1969 میں اندازہ تھا کہ جنگلوں میں بیس ہزار اونٹ موجود ہیں۔ اگلے بیس برس میں ان کی تعداد دگنی ہوگئی۔ 2008 تک آسٹریلوی جنگلوں میں دس لاکھ اونٹ گھومنے پھرنے لگے تھے۔

بارہ برس قبل ماہرین حیوانیات نے حکومت کو خبردار کیا کہ اگر اونٹوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی تو اگلے ایک عشرے میں بیس لاکھ اونٹ سرزمین آسٹریلیا پر موجود ہوں گے۔ تبھی حکومت نے بادل نخواستہ انھیں مارنے کا منصوبہ بنایا۔ اگرچہ اسے قدامت پسند عیسائیوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ایران سے حضرت عیسیٰ کو دیکھنے آنے والے مجوسی اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ چنانچہ عیسائی اونٹ کو مقدس جانور سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں بھی اسے مقدس حیوان سمجھا جاتا ہے۔

آسٹریلیا کے اندرونی علاقوں میں رہنے والے ہزارہا باشندوں کا مگر مطالبہ تھا کہ انھیں جنگلی اونٹوں سے نجات دلائی جائے۔ اس مطالبے کی تین اہم وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اونٹ سبزہ بکثرت چرنے لگے تھے۔ چنانچہ سبزہ کم دستیاب ہونے لگا۔ کم سبزے کی وجہ سے بعض اوقات مویشی مر بھی

اونٹوں کی کثرت کے باعث پانی کی قلت جنم لے چکی

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

اور دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی جمع پونجی میں سے پچاس پونڈ بھیج دے گی۔

کولن یوں اچانک خاموش ہوتا دیکھ کر سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے بھڑک اُٹھا، ''اچھا۔ اب زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری آنٹی کی تھوڑی بہت مدد کر ہی دوں گا۔'' وہ ایک لمحہ رُکا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا: ''میرے خیال میں نقد رقم کی بجائے ہم کوئی ایسی چیز دے سکتے ہیں، جو شاید اُن کے کسی کام آجائے۔'' اُس نے بڑے فخر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''مثلاً؟'' کیرول نے سرد مہری سے پوچھا۔

''کیا خیال ہے، اگر ہم ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا وہ ڈیسک اُنھیں دے دیں۔ وہ ہمارے لیے تو بے کار ہے، مگر ہے ایک نادر و نایاب شے۔ ہوسکتا ہے کبھی کوئی قدر دان اُس ڈیسک کی اچھی قیمت لگادے۔''

کیرول کی آنکھیں تاسف اور تعجب سے پھیل گئیں۔

''تمہارا مطلب اُس ڈیسک سے تو نہیں جسے ہم نے کاٹھ کباڑ میں ڈال دیا ہے؟ اب تک اُس میں دیمک لگ چکی ہو گی۔ نہیں کولن! نہیں۔ یہ سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے۔ تم میری بیوہ آنٹی کو اس طرح بے وقوف نہیں بنا سکتے۔''

''مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' کولن اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''ممکن ہے ایک دن اس ڈیسک کا شمار قیمتی چیزوں میں ہو جائے اور آنٹی الزبتھ اس کی بدولت امیر و کبیر بن جائیں۔''

''تم یہ طفل تسلیاں رہنے دو۔ تم خوب جانتے ہو کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔'' کیرول منہ بسورتے ہوئے بولی، ''یہ محض ایک بھدا سا بے ہنگم وکٹورین ڈیسک ہے، جس کی قیمت شاید صفر سے بھی کم ہو۔''

''تم جتنا بھی چاہے نصیحتیں کرلو، لیکن اب یہی ڈیسک آنٹی الزبتھ کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔'' کولن نے فیصلہ سنا دیا۔

کیرول صلح جو عورت تھی۔ ''اچھا بھئی۔ تمہارا فیصلہ بالکل درست ہے۔ کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے کہ ہم کوئی چیز دے ہی ڈالیں۔ آنٹی الزبتھ کو کم از کم یہ احساس تو رہے گا کہ ہم نے اُنھیں بالکل ہی فراموش نہیں کیا۔''

ڈیسک روانہ کردینے کے ایک ہفتے بعد کا ذکر ہے، کولن کو انکل جارج کے پرانے کاغذات میں سے ایک خط ملا، جو اُسی کے نام تھا۔ کولن کو حیرت ہوئی کہ اگر خط اُس کے نام لکھا گیا تھا تو پھر پوسٹ کیوں نہیں ہوا؟ اُس کی سمجھ میں ایک ہی وجہ آئی کہ انکل جارج موت سے قبل کافی دنوں تک نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ اسی وجہ سے یہ خط کہیں دب کر رہ گیا۔ خط میں تحریر تھا:

''عزیز لڑکے!

بہت جلدی میں یہ چند سطور گھسیٹ رہا ہوں۔ تمہیں وہ پرانا وکٹورین ڈیسک یاد ہوگا، جو تمہارے ہی گھر کے ایک کونے میں کھڑکی کے قریب رکھا ہے۔ یہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے پاس اسی لیے رکھ چھوڑا تھا کہ تمہیں بطور تحفہ عطا کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی ایک خفیہ دراز میں ایک بہت ہی نادر شے موجود ہے، جو میں نے ایک آرٹ گیلری سے نہایت کم داموں میں خرید کر اُس دراز میں محفوظ کردی تھی۔ یہ عظیم فن کار ونسنٹ وان گف کا شاہکار پورٹریٹ 'محبت کی دیوی کی ایک جھلک' کے نام سے منسوب ہے۔

ماہرین کی تحقیقات کے مطابق ایک حادثے میں یہ تصویر تھوڑی سی جل گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی ظالم دیو نے کسی حسین شہزادی پر حملہ کر کے اُس کی گردن کا تھوڑا سا گوشت نوچ لیا ہو۔ چنانچہ اس بات میں اب کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہمارے پاس جو پورٹریٹ ہے وہ بالکل اصلی ہے۔ میں اپنی زندگی میں اُس کا سودا نہ کرسکا، لیکن اب یہ تمہاری نذر کر رہا ہوں۔ تم میری عزیز بھتیجی کیرول کے شوہر ہو

www.pakistanipoint.com

اور مجھے اندازہ ہے کہ تم لوگ کس قدر کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہو۔''

فقط

تمہارا انکل جارج

کولن نے دراز دریافت کرنے کے سلسلے میں دی گئی ہدایات کو جلدی جلدی ایک کاغذ پر نوٹ کیا اور تب ایک ڈراؤنی حقیقت اُس پر آشکار ہوئی۔ وہ ڈیسک تو اب آنٹی الزبتھ کے قبضے میں جاچکا۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

''اب تم ڈیسک کی واپسی کا تقاضا کس منہ سے کرو گے؟''

کولن نے جب خط اور اُس کے مندرجات سے کیرول کو آگاہ کیا تو وہ بے ساختہ پھٹ پڑی: ''تم نے تو اُسے ناکارہ سمجھ کر آنٹی الزبتھ کو بخش دیا۔''

کولن کو اپنی بیوی سے اسی ردِعمل کی توقع تھی۔ ''کہتی تو تم ٹھیک ہو، مگر ہم اس بار بیچ مچ آنٹی الزبتھ کو اچھی خاصی رقم بھیج کر ڈیسک کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لالچی بڑھیا ہمارے دام میں آجائے گی۔ میں اُسے لکھوں گا کہ تم اُس ڈیسک کو اپنے سنگاردان میں تبدیل کرنا چاہتی ہو۔''

کیرول ڈیسک کو بوسیدہ اور آنٹی کو بڑھیا کہنے پر کافی جز بز ہوئی، مگر کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔ ''کتنی رقم بھیجو گے؟'' ایک لمحے ٹھہر کر اُس نے پوچھا۔

''ایک سو پونڈ۔'' کولن بڑے فخر سے سینہ تان کر بولا۔

چیک بھیجنے کے ایک ہفتے بعد ڈیسک بھی موصول ہوگیا۔ کولن اُس پر یوں جھپٹ پڑا جیسے شیر اپنے شکار پر۔ اُس نے سامنے کی درازیں کھینچ کر باہر نکال پھینکیں اور پھر اُس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کوئی نامعلوم سا اُبھرا ہوا بٹن تلاش کرنے لگیں لیکن سراسیمگی اور جلد بازی میں اُسے کوئی بٹن نہ مل سکا۔ اُس نے ہدایت نامے کو بغور دیکھا۔ ''بائیں ہاتھ کی طرف کونے میں ایک معمولی سا خلا ہے۔ اُسی خلا میں وہ بٹن موجود ہے۔ اُسے زور سے دباؤ۔''

کولن نے بٹن تلاش کرلیا، جسے دباتے ہی ایک باریک سا تختہ پھسل کر سامنے آگیا لیکن یہ کیا؟ تختہ خالی تھا۔ اُس پر کوئی کینوس موجود نہیں تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب کینوس ہی نہیں تو پورٹریٹ کہاں سے آتا۔ کولن کی چیخ بڑی ہی بھیانک اور دردناک تھی۔

''اُس بڑھیا نے مجھے لوٹ لیا۔ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ احمق تھی۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''میرا خیال ہے وہ پورٹریٹ اس میں موجود ہی نہیں تھا۔ انکل جارج نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔'' کیرول نے اُسے بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مذاق؟'' وہ یک دم بھڑک اُٹھا۔ ''یہ جان لیوا مذاق انکل نہیں، آنٹی نے کیا ہے۔ میں وہ پورٹریٹ اُس کے حلق سے بھی اُگلوالوں گا۔'' کولن کا پارہ چڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔

''مگر اب تم کرو گے کیا؟'' کیرول نے مذاق اُڑانے والے انداز میں پوچھا، ''کیا اُسے کوئی اور لالچ دو گے؟ مزید رقم وغیرہ؟''

کولن کی قہر آلود نگاہیں آگ برسانے لگیں۔ ''ہم ابھی اور اسی وقت وہاں جارہے ہیں۔ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہیں نکلا تو میں انگلی ٹیڑھی کرنا بھی جانتا ہوں۔''

کیرول سہم کر رہ گئی۔ ضعیف اور لاغر آنٹی الزبتھ، تنِ تنہا رہتی تھیں اور بے رحم، خود غرض کولن کوئی بھی قدم اُٹھا سکتا تھا۔

آنٹی الزبتھ اُنھیں اچانک اپنے دروازے پر دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑیں۔ ''آؤ آؤ میرے بچو! بڑا اچھا ہوا کہ تم لوگ گئے۔ پچھلے ہی دنوں میرا 'جیکی' مجھے داغِ مفارقت دے گیا ہے، میں بالکل تنہا ہوگئی ہوں۔'' آنٹی نے دونوں کو گلے سے لگالیا اور تینوں 'جیکی' کی یاد میں آنسو بہانے لگے۔ 'جیکی' نامی کُتا دس سال تک آنٹی سے وفاداری نبھانے کے بعد اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

کولن اب آنٹی کو چھوڑ کر عقابی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ آنٹی الزبتھ کے تخلیق کردہ آرٹ کے نمونے کمرے میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ ایک اچھی خاصی آرٹسٹ تھیں اور بازار میں اُن کی مانگ تھی۔ کولن نے اُن کے کام

www.pakistanipoint.com

ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور اُنھیں مبارک باد دی۔ یہ پوچھنے کے لیے اُس کا دل بے چین تھا کہ ڈیسک میں سے جو 'مال' برآمد ہوا، وہ کہاں ہے؟ لیکن اُس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ آنٹی تو اب اپنی مٹھی میں ہیں، پتا چلا ہی لوں گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''اور ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟'' آنٹی تعریف سن کر خوشی سے پھول گئیں۔ ''میرے فن کا بہترین نمونہ تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔ آؤ! میرے ساتھ آؤ۔'' کولن بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے اُن کے ساتھ عقبی کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے میز پر ایک فریم رکھا تھا۔ وہ ایک نفیس کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کولن کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں 'محبت کی دیوی' کو اپنا شاہکار تو نہیں بتانا چاہ رہی تھیں آنٹی الزبتھ۔

آنٹی نے بڑھ کر دھیرے دھیرے وہ کپڑا ہٹایا۔ سامنے 'جیکی' کا شاندار پورٹریٹ تھا۔ وہ ایک شاہانہ وقار کے ساتھ داہناں پنجہ آگے کی طرف اُٹھائے ہوئے یوں کھڑا تھا گویا اپنے ہر مہمان سے مصافحہ کرنا چاہ رہا ہو۔ یہ پورٹریٹ ایک اعلیٰ دبیز اور نفیس کینوس پر تیار کیا گیا تھا اور آرٹسٹ کے کمال فن کا شاندار نمونہ تھا۔ کولن کے جسم میں سرد لہری سی دوڑ گئی۔ ''کہیں یہ وہی کینوس تو نہیں؟'' پھر اُس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔ ''نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ آنٹی نے وہ پورٹریٹ کہیں محفوظ کر دیا ہوگا۔''

''کیا ایسا نہیں لگتا گویا زندہ جیکی اپنی پوری آن بان کے ساتھ ہمارے سامنے بیٹھا ہو۔'' آنٹی الزبتھ نے کولن کی جانب دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں پوچھا۔

کولن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا شک اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ یہ وہی 'محبت کی دیوی کی ایک جھلک' والا کینوس ہے۔ اُس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور وہ مایوس ہوتا چلا گیا۔ آنٹی نے اپنا شاہکار کسی کے خوابوں کے محل کو روند کر تعمیر کیا تھا۔ لرزتے قدموں سے وہ آگے بڑھا اور 'جیکی' کے پورٹریٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یکا یک اُسے یوں لگا جیسے کینوس کے درمیان میں جوڑ لگایا گیا ہے۔ وہ اُس اُبھرے ہوئے حصے کو بغور دیکھتا رہا اور پھر آنٹی الزبتھ کی جانب مڑا۔ ''یہاں پر یہ جوڑ کیوں لگایا گیا ہے؟ کیا ایک پیس میں کینوس موجود نہیں تھا، یا پھر درمیان میں کوئی ایسی چیز حائل ہو رہی تھی، جسے علیحدہ کیے بغیر چارہ نہ تھا؟'' ایک موہوم سی اُمید کولن کے ذہن میں پھر اُبھر آئی۔ 'شاید وہ درمیانی حصہ آنٹی نے نکال کر کہیں رکھ دیا ہو۔'

لیکن آنٹی الزبتھ اُس کے جذبات سے بے خبر مسلسل بول رہی تھیں۔ ''یہ کینوس تمہارا ہی دیا ہوا تحفہ ہے۔ ڈیسک کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد یہ ٹکڑا مجھے ملا۔ مجھے اس کا بہترین استعمال یہی نظر آیا کہ اس پر 'جیکی' کا پورٹریٹ بنایا جائے۔'' اُن کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی، گویا وہ سب کچھ جانتی ہوں اور جان بوجھ کر کولن کے جذبات کا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ ''یہاں درمیان میں ایک حسین عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی، لیکن وہ بھی نیم سوختہ۔ اُس کی گردن بُری طرح زخمی تھی۔ مجھے یہ کریہہ المنظر چہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ میں نے وہ حصہ کاٹ کر آتش دان میں ڈال دیا۔ دونوں حصوں کو جوڑ کر مضبوط بنانے کے لیے میں نے ایک دوسرا بڑا ٹکڑا اس کے پیچھے چسپاں کر دیا اور پھر 'جیکی' کا پورٹریٹ بنا ڈالا۔''

وہ کولن کی جانب مڑیں اور اس کے وحشت زدہ چہرے کو دیکھ کر خود حواس باختہ ہو گئیں۔ ''یقین کرو، وہ بالکل بکواس سی تصویر تھی۔ حد درجہ بھدی اور جلی ہوئی۔ اُس کا ضائع ہو جانا ہی بہتر تھا۔''

کولن کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور وہ کسی بھی لمحے گرنے والا تھا۔ آنٹی الزبتھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کولن کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے اُسے وہیں فرش پر لٹا دیا اور اُس کے چہرے کو طنز آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں:

''شاید تمھیں میرا کارنامہ پسند نہیں آیا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اچھا چلو! تم ذرا آرام کرلو، جب تک میں تمہارے لیے بہترین ڈنر تیار کرتی ہوں۔'' ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قاضی شرف الدین

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انصاف

دو نوجوان امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی محفل میں داخل ہوتے ہی محفل میں بیٹھے ایک شخص کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور اس کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے بولے: ''یا عمرؓ، یہ ہے وہ شخص!''

سیدنا عمرؓ ان سے پوچھتے ہیں: ''کیا کیا ہے اس شخص نے؟''

''یا امیر المومنین، اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے تمہارے باپ کو قتل کر دیا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تعجب سے پوچھتے ہیں۔

نوجوان اثبات میں سر ہلاتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس شخص سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں: ''کیا تو نے ان کے باپ کو قتل کیا ہے؟''

وہ شخص کہتا ہے: ''ہاں امیر المومنین، مجھ سے قتل ہو گیا ہے ان کا باپ۔''

''وہ کس طرح؟'' سیدنا عمرؓ نے پوچھا۔

''امیر المومنین، ان کا باپ اپنے اونٹ سمیت میرے کھیت میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے منع کیا۔ باز نہیں آیا تو میں نے ایک پتھر دے مارا۔ پتھر سیدھا اس کے سر میں لگا اور وہ موقع پر مر گیا۔ میں ہرگز اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن قصاص تو دینا پڑے گا۔ موت ہے اس کی سزا۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

فیصلہ لکھنے کی ضرورت نہیں اور وہ بھی ایسا

عفو درگزر، ایفائے عہد اور عدل کی اعلیٰ صفات سے متصف ایک ناقابل فراموش واقعہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اٹل کہ جس پر کسی بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں۔ نہ ہی اس شخص سے کنبے کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا، نہ ہی یہ پوچھا گیا کہ تعلق کس خاندان سے ہے، نہ ہی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ تعلق کسی معزز قبیلے سے تو نہیں، معاشرے میں کیا رتبہ یا مقام ہے؟ ان سب باتوں سے بھلا سیدنا عمرؓ کو مطلب ہی کیا ہے!! معاملہ اللہ کے دین کا ہو تو عمر رضی اللہ عنہ پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی کوئی شریعت کے معاملے پر عمر رضی اللہ عنہ کو روک سکتا ہے۔ حتیٰ کہ سامنے عمرؓ کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ قاتل کی حیثیت سے آ کھڑا ہو، قصاص تو اس سے بھی لیا جائے گا۔

وہ شخص کہتا ہے: ''اے امیر المومنین، میں بدو ہوں۔ یہاں کاشت کاری کرنے آیا تھا۔ اس کے نام پر جس کے حکم سے یہ زمین و آسمان قائم کھڑے ہیں، مجھے صحرا میں اپنی بیوی بچوں کے پاس واپس جانے دیجیے تاکہ میں انھیں بتا سکوں، مجھے قتل کا حکم مل چکا۔ ان کا اللہ اور میرے سوا کوئی آسرا نہیں۔ میں واپس آ جاؤں گا۔''

سیدنا عمرؓ کہتے ہیں: ''کون تیری ضمانت دے گا کہ تو صحرا جا کر واپس آ جائے؟''

مجمع پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں جو اس کا نام تک جانتا ہو۔ اس کے قبیلے، خیمے یا گھر وغیرہ کے بارے میں جاننے کا معاملہ تو بعد کی بات ہے۔ کون ضمانت دے اس کی؟ کیا یہ دس درہم کے ادھار، زمین کے ٹکڑے یا کسی اونٹ کے سودے کی ضمانت کا معاملہ ہے؟ ادھر تو ایک گردن کی ضمانت دینے کی بات ہے، جسے تلوار سے اڑا دیا جانا ہے۔ اور کوئی ایسا بھی تو نہیں ہے جو اللہ کی شریعت کے معاملے پر عمرؓ سے اعتراض کرے، یا پھر اس شخص کی سفارش کے لیے ہی کھڑا ہو جائے۔ وہ کون ہو سکتا ہے جو سفارشی بننے کی سوچ سکے؟

محفل میں موجود لوگوں پر خاموشی سی چھا گئی ہے۔ صورتحال سے خود عمر رضی اللہ عنہ بھی متاثر ہیں۔ اس شخص کی حالت نے سب کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ کیا اس شخص کو واقعی قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے اور اس کے بچے بھوکوں مرنے چھوڑ دیے جائیں؟ یا پھر اس کو بغیر ضمانتی واپس جانے دیا جائے؟ واپس نہ آیا تو مقتول کا خون رائیگاں جائے گا!

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سر جھکائے افسردہ بیٹھے ہیں۔ آخر سر اٹھا کر التجا بھری نظروں سے نوجوانوں کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں: ''معاف کر دو اس شخص کو۔''

''نہیں امیر المومنین۔ جو ہمارے باپ کو قتل کرے، اس کو چھوڑ دیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' نوجوان اپنا آخری فیصلہ بغیر کسی جھجھک کے سنا دیتے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ ایک بار پھر مجمع کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے پوچھتے ہیں: ''اے لوگو، ہے کوئی تم میں سے جو اس کی ضمانت دے سکے؟''

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے زہد و صدق سے بھرپور بڑھاپے کے ساتھ کھڑے ہو کر کہتے ہیں: ''میں ضمانت دیتا ہوں اس شخص کی!''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ابوذرؓ، اس نے قتل کیا ہے!''

''چاہے قتل ہی کیوں نہ کیا ہو۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ اپنا اٹل فیصلہ سناتے ہیں۔

حضرت عمرؓ: جانتے ہو اسے؟

حضرت ابوذرؓ: نہیں جانتا۔''

عمر رضی اللہ عنہ: ''تو پھر کس طرح ضمانت دے رہے ہو؟''

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ: ''میں نے اس کے چہرے پر مومنوں کی صفات دیکھی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے یہ جھوٹ نہیں بول رہا، انشاء اللہ یہ لوٹ کر واپس آ جائے گا۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تغلق کا انصاف

محمد شاہ تغلق ایک مرتبہ باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بادشاہ سے ٹکرا گیا۔ تغلق کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس نے لڑکے کو چھڑی سے پیٹ ڈالا۔ لڑکا روتا ہوا عدالت میں پہنچا اور اس کے استغاثے پر قاضی القضا نے بادشاہ کو عدالت میں بلوایا۔ محمد شاہ تغلق انصاف پسند حکمران تھا لہٰذا ایک ملزم کی طرح عدالت میں پیش ہوا۔ اپنا جرم تسلیم کیا اور کہا: "لڑکے نے مجھے نہیں دیکھا تھا اور مجھ سے واقعی زیادتی ہوئی۔"

قاضی القضا نے بادشاہ کو ایک دن کی مہلت دی کہ کل تک اس لڑکے کو راضی کرلو ورنہ قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بادشاہ نے لڑکے کو بہت زر و مال دینا چاہا مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ قاضی القضا کے دربار میں حاضر ہوا۔ قاضی کے حکم سے لڑکے نے اسی چھڑی سے جس سے اسے پیٹا گیا تھا، بادشاہ کے جسم پر اکیس بید مارے۔ سزا کے بعد بادشاہ نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی کہ خدا نے اسے انصاف پر قائم رکھا اور دنیا میں اس سے جو غلطی ہوئی تھی، اس کی سزا اسے دنیا ہی میں مل گئی۔

(بشکریہ: بڑے لوگوں کے روشن واقعات، خان اکبر علی خان)

وقت کی نزاکت

کسی مالدار بخیل کا بیٹا بہت سخت بیمار ہو گیا۔ دوا دارو کرنے کے باوجود بھی بخار کا زور نہ اترا تو کسی نیک دل شخص نے اسے مشورہ دیا کہ قرآن مجید ختم کرا دیا بکرے کا صدقہ دے دو۔ یہ سن کر مالدار بخیل سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا: "قرآن مجید ختم کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ منڈی دور ہے اور آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہوگا۔"

اس کی یہ بات سن کر نیک آدمی نے کہا: "قرآن مجید ختم کرنا اسے اس لیے پسند آیا کہ قرآن اس کی نوک زبان پر ہے۔ اور روپیہ اس کی جان میں اٹکا ہوا ہے۔"

حاصل کلام: بخیل وقت کی نزاکت مدنظر رکھنے کے بجائے ہمیشہ دولت کو دیکھتا ہے، خواہ دولت نہ خرچ کر کے نقصان ہی اٹھانا پڑے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

عمر رضی اللہ عنہ: ''ابوذر غفاریؓ، دیکھ لو اگر یہ تین دن ...یں لوٹ کر نہ آیا تو مجھے تیری جدائی کا صدمہ دیکھنا پڑے ...گا۔''

''امیر المومنین، اللہ مالک ہے۔'' وہ اپنے فیصلے پر ...ئے جواب دیتے ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے تین دن کی مہلت پا کر وہ شخص رخصت ہو جاتا ہے۔ کچھ ضروری تیاریوں، بیوی بچوں کو الوداع کہنے، اپنے بعد آنے والی مشکلات کا کوئی حل نکالنے اور لوٹ کر واپس آنے کے لیے۔

اور پھر تین راتوں کے بعد، عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر کہ

وہ بھلا کیسے اس امر کو بھلا پاتے، بعد از نماز عصر شہر میں سبھی کو جمع ہونے کی منادی مل جاتی ہے۔ نوجوان اپنے باپ کا قصاص لینے کو بے چین ہیں۔ لوگوں کا مجمع اللہ کی شریعت پہ عمل ہوتا دیکھنے جمع ہو چکا۔

ابو ذر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لاتے اور امیر المومنین کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ''کدھر ہے وہ آدمی؟'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سوال کرتے ہیں۔

''مجھے نہیں معلوم یا امیر المومنین۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ مختصر جواب دیتے ہیں۔

وہ پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں جدھر سورج ڈوبنے کی جلدی میں معمول سے زیادہ تیز دکھائی دے رہا ہے۔ محفل میں ہو کا عالم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ آج کیا ہونے جا رہا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ابو ذر غفاریؓ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بستے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے جسم کا ٹکڑا مانگیں تو دیر نہ کریں، کاٹ کر ابو ذر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں۔ لیکن ادھر معاملہ شریعت کا ہے، اللہ کے احکامات کی بجا آوری کا ہے۔ کوئی کھیل تماشہ نہیں ہونے جا رہا نہ ہی کسی کی حیثیت یا صلاحیت کی پیمائش ہو رہی ہے۔ نہ ہی زمان و مکان کو بیچ میں لایا جانا ہے۔ قاتل نہیں آتا تو ضامن کی گردن جاتی نظر آتی ہے۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے بدو آ جاتا ہے۔ بے ساختہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہ سے ''اللہ اکبر'' کی صدا نکلتی ہے۔ ساتھ ہی مجمع بھی ''اللہ اکبر'' کا بھرپور نعرہ لگاتا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: ''اے شخص، اگر تو لوٹ کر نہ بھی آتا تو ہم نے تیرا کیا کر لینا تھا۔ نہ ہی کوئی تیرا گھر جانتا تھا اور نہ ہی تیرا پتا۔''

''امیر المومنین، اللہ کی قسم، بات اس ذات کی تھی جو سب ظاہر و پوشیدہ کے بارے میں جانتا ہے۔ دیکھ لیجیے میں آ گیا ہوں، اپنے بچوں کو پرندوں کے چوزوں کی طرح صحرا میں تنہا چھوڑ کر، جدھر نہ درخت کا سایہ ہے اور نہ ہی پانی کا نام و نشان۔ میں قتل کر دیئے جانے کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے بس یہ ڈر تھا کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے، اب لوگوں سے وعدوں کا ایفا کرنا اٹھ گیا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طرف رخ کر کے پوچھا: ''ابو ذرؓ، تم نے کس بنا پر اس کی ضمانت دی تھی؟''

ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے امیر المومنین، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے، اب لوگوں سے خیر ہی اٹھا لی گئی۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لمحے کو توقف کیا اور پھر ان دونوں جوانوں سے پوچھا: ''کیا کہتے ہو اب؟''

نوجوانوں نے روتے ہوئے جواب دیا: ''اے امیر المومنین، ہم اس کی صداقت کی وجہ سے اسے معاف کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے، اب لوگوں سے عفو اور درگزر ہی اٹھا لیا گیا۔''

سیدنا عمرؓ ''اللہ اکبر'' پکار اٹھے۔ آنسو ان کی ڈاڑھی تر کرتے نیچے گر رہے تھے۔

اے امیر المومنین، اللہ آپ کو عدل و رحمدلی پر جزائے خیر دے۔

اے بدو، اللہ تجھے اس وفائے عہد و صداقت پر جزائے خیر دے۔

اے نوجوانو! تمہاری عفو و درگزر پر اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔

اے ابو ذرؓ، اللہ آپ کو اس شخص کی مصیبت میں مدد پر جزائے خیر دے۔

(یہ قصہ عرب مصنف، محمد دیاب التلیدی (متوفی 1100ھ) کی کتاب ''نوادر الخلفاء'' کی ابتدا میں قاضی شرف الدین حسین بن ریان کے حوالے سے منقول ہے۔)

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محمد خلیل چودھری

ساحلوں کا جادوئی پھل

عربی زبان میں ناریل کو نارجیل، فارسی میں جوہندی، بنگلہ میں ناریکل، سندھی میں ڈونھکی، پشتو میں پرہ، لاطینی میں کس نوسی فیرا اور انگریز میں کوکونٹ کہتے ہیں۔ ناریل کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ممتاز پھلوں میں ہوتا ہے۔ یہ پھل نہ صرف اپنی غذائیت اور لذت بلکہ اپنی خصوصی افادیت کے اعتبار سے بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ناریل کا درخت زیادہ تر ایسے علاقوں میں پیدا ہوتا ہے جہاں زمین نم رہے اور خوب بارش ہوتی ہو۔ سمندر کے کنارے کھاری ماحول میں پیدا ہونے والا یہ پھل میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔ ناریل کا آبائی وطن ملایا سے نیوگنی تک کے علاقے ہیں۔ ایشیا میں یہ پھل قدیم زمانے میں ہی پہنچ چکا تھا۔ کچھ شواہد سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ناریل ہندوستان میں تین ہزار سال قبل کاشت ہونا شروع ہوا۔

ہندو مت کے مقدس صحیفوں میں اسے جنت کے درخت سے موسوم کیا گیا ہے۔ ہندو دیو مالا کے مطابق جب بھگوان وشنو دھرتی پر آیا تو وہ اپنے ساتھ ناریل بھی لایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو ناریل کو اپنی مذہبی رسومات اور تقریبات میں بہت زیادہ تقدس کا درجہ دیتے ہیں۔ پوجا کے دوران اسے بطورِ عقیدت مندروں میں چڑھاوے کی غرض سے بھینٹ کیا جاتا ہے۔

ناریل افریقہ اور پانامہ کے خطوں میں 1492ء سے قبل پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد منطقہ حارہ کے سبھی ممالک میں کاشت شروع ہوگئی۔ آج کل سری لنکا، بنگلہ دیش، آسام، فلپائن، مشرق الہند، انڈیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا کے علاوہ بحر ہند اور بحرالکاہل کے جزائر میں وسیع پیمانے پر ناریل اُگایا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں ناریل خودرُو بھی ہوتا ہے۔ اب پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کے نواحی علاقوں میں ناریل کامیابی سے کاشت کیا جارہا ہے۔

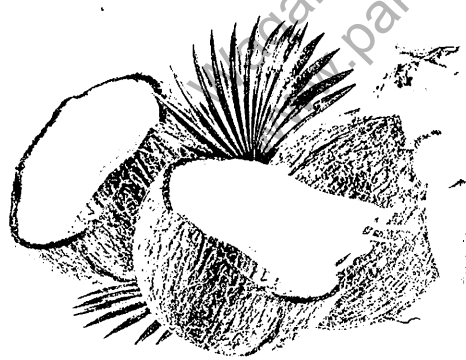

www.pakistanipoint.com

ناریل کے درخت کی اونچائی بیس سے تیس میٹر تک ہوتی ہے۔ درخت کی شاخیں نہیں ہوتیں بلکہ تنے کے اُوپر لمبے پتوں کا تاج سا بنا ہوا ہوتا ہے۔ عموماً یہ پتے تعداد میں بارہ سے چوبیس تک ہوتے ہیں۔ پتوں کے ضمن میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر ماہ ایک نیا پتا پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ہر ماہ ایک پتا اپنی طبعی عمر گزار کر مر جاتا ہے۔ اس طرح اس کے پتوں کی تعداد ہمیشہ ایک جتنی رہتی ہے۔

ناریل کی بالعموم دو قسمیں کاشت کی جارہی ہیں۔ ایک قسم لمبے قد والے ناریل کی ہے جبکہ دوسری قسم کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ گھروں میں شوقیہ لگانے کے لیے پست قد والی قسم زیادہ مقبول ہے کیونکہ اس قسم کے درخت تین یا چار سال میں پھل دینے لگتے ہیں۔ جبکہ تجارتی مقاصد کے لیے دراز قد والی قسم زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ چھوٹے قد والی قسم کے ناریل کی عمر بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس میں پھل بھی کم آتا ہے۔ اس پھل میں تیل کا تناسب بھی کم ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے ناریل کو پھل جسامت میں بڑے لگتے ہیں اور ان میں تیل کا تناسب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

درخت کی چند عجیب خصوصیات:

ناریل کے پودے میں چند ایک خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ ہیں اور عجیب بھی۔ انسانوں کی طرح نباتات کی زندگی کے بھی کچھ مراحل اور ادوار ہوتے ہیں۔ یعنی بچپن، جوانی (بلوغت) اور پیرانہ سالی (بڑھاپا)۔ اٹھارہ برس کی عمر سے انسانی زندگی میں سن (بلوغت) کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ کس قدر حیرت انگیز اور دلچسپ بات ہے کہ ناریل کا پودا بھی اٹھارہ برس کی عمر تک بالغ ہو جاتا ہے۔ اور پھر تھوڑی ہی مدت بعد یعنی اکیس بائیس برس تک ثمر آور ہونا ہے۔ ناریل کا طویل قامت درخت کم و بیش پچاس سے ستر سال تک پھل دیتا رہتا اور اس کے بعد گویا بانجھ ہو جاتا ہے۔

☆ ناریل کے درخت میں دیگر درختوں کی نسبت تیز ہواؤں اور طوفانی آندھیوں کا مقابلہ کرنے کی قوت زیادہ ہے۔ یہ بالعموم ساحلی اور مرطوب علاقوں میں اُگتا ہے، جہاں اکثر و بیشتر تند و تیز ہوائیں اور آندھیاں چلتی ہیں۔ ان تیز و تند ہواؤں اور طوفان خیز آندھیوں کے بے رحم تھپیڑے سہنے کے باوجود ناریل کا درخت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اس کے چوڑے پتے طوفانی ہواؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ پتوں کی سطح پر ایک دبیز چھلی ہوتی ہے جس پر مون سون کی بارشیں بھی اثر انداز نہیں ہوتیں۔

☆ ناریل کا پھل زمین سے خاصی بلندی پر لگتا ہے، چنانچہ ٹوٹ کر گرنے کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن قدرت نے گراں قدر پھل کی حفاظت کا بڑا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ پھل کا جائزہ لیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے اس کی حفاظت کے لیے کس قدر محفوظ پیکنگ کی ہے۔ بیرونی جانب کتھئی رنگ کا چھلکا چڑھا ہوتا ہے۔ اسے اتارا جائے تو اندر سے ریشہ دار جٹاؤں کی موٹی تہ برآمد ہوتی ہے۔ یہ ناریل کی چھال کہلاتی ہے۔

ان جٹاؤں کو ہٹائیں تو بھی ناریل کے گودے تک ہماری رسائی نہیں ہو پاتی کیونکہ جٹاؤں کے اندر سخت لکڑی کا خول برآمد ہوتا ہے۔ اسے توڑا جائے تو ناریل کے پھل میں بھرا ہوا شیریں پانی اور گودا حاصل ہوتا ہے۔ گودے پر بھی سرخی مائل سیاہ رنگ کا چھلکا چڑھا ہوتا ہے جسے کھایا بھی جا سکتا ہے۔ ناریل جب تازہ ہو تو اس کا بیرونی چھلکا سبز اور اس میں جٹاؤں کی رنگت سفید ہوتی ہے۔ ناریل کا پھل 20 سے 30 سینٹی میٹر تک لمبا ہوتا ہے۔

غذائی اور کیمیائی اجزا:

ناریل بیک وقت غذا ہے اور دوا بھی۔ ناریل سے انسان کو بھرپور غذائیت ملتی اور فربہی حاصل ہوتی ہے۔ ناریل میں روغنی جزو بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے جو زود ہضم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہوتا ہے۔ اس روغن کی شکل وصورت اور کیمیائی ترکیب حیواناتی گھی سے مشابہ ہے۔ اس کے پروٹین میں تمام امینو ایسڈز شامل ہیں۔ ناریل میں سوڈیم، سلفر، پوٹاشیم اور میگنیشیم بافراط ملتے ہیں۔ جب ناریل پک کر خشک ہو جائے تو اس کی شرح توانائی میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک سو گرام ناریل میں 662 حرارے پائے جاتے ہیں۔

100 گرام ناریل میں لحمیات 4.5 فیصد، رطوبات 36.3 فیصد، چکنائی 41.6 فیصد، کاربوہائیڈریٹس 13.0 فیصد، معدنی اجزاء 1.0 فیصد تک ہوتے ہیں۔ فاسفورس 240 ملی گرام، فولاد 1.7 ملی گرام، کیلشیم 10 گرام، وٹامن سی 1 ملی گرام، اور تھوڑی مقدار میں وٹامن بی کمپلیس پایا جاتا ہے۔ 100 گرام خام اور کچے ناریل میں 444 کیلوریز ہوتی ہیں۔

غذائی استعمال اور طبی افعال وخواص:

اطبائے قدیم وجدید کے مطابق ناریل تقویت بخش غذا ہے۔ اس کے استعمال سے بدن میں عمدہ اور صالح خون پیدا ہوتا ہے۔ یہ جسم کی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ جدید طبی تحقیقات کے مطابق ناریل کا شمار جامع غذاؤں میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں زلفِ بنگال کا بڑا شہرہ ہے۔ بنگال کی خواتین اپنی دلکش زلفوں کے لیے دنیا بھر میں معروف ہیں۔ بالوں کا یہ حسن اور زلفوں کی دلکشی ورعنائی بڑی حد تک ناریل کی مرہونِ منت ہیں۔ بنگال کی عورتیں سبز ناریل کا پانی پیتیں اور پختہ ناریل کھاتیں جبکہ اس کا تیل بالوں میں لگاتی ہیں۔ ایسی عورتیں جو اولاد کی نعمت سے محروم ہوں، انھیں ناریل استعمال کرنا چاہیے۔ حاملہ خواتین کے لیے بھی ناریل مؤثر اور افادیت بخش غذا ہے۔

حمل میں بدن کو حیاتین اے کی ضرورت ہوتی ہے اور ناریل یہ کمی پوری کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے اسقاطِ حمل کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ نیز بچہ صحت مند اور خوبصورت پیدا ہوتا ہے۔ زچگی کے زمانے میں جب ماں کا دودھ کم بنے اور بچہ سیر ہو کر دودھ نہ پی سکے تو ناشتے یا غذا کے بعد زچہ کو ناریل کی گری کھلانے سے ہفتہ عشرہ میں دودھ سیلاب کی طرح اُمڈ آئے گا۔ بچہ سیر ہو کر دودھ پی کر خاطر خواہ توانائی حاصل کر سکے گا۔ ناریل کا استعمال عورتوں کے رحم کو بھی طاقتور بناتا ہے۔

کچے ناریل میں معدنی پانی ملتا ہے۔ اس کو فرحت بخش مشروب کے طور پر پیا جاتا ہے۔ اس پانی میں شوگر کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ یہ زود ہضم بھی ہے۔ ناریل غذائی لحاظ سے پکنے سے پہلے زیادہ فائدہ مند ہے۔ جب اس کی گری کچی ہو تو اس میں چکنائی کے بے شمار انزائمز موجود ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بہت زیادہ زود ہضم ہے جبکہ پکے ناریل میں چکنائی اور کاربوہائیڈریٹس کا خزانہ مستور ہوتا ہے۔ ناریل میں دیگر مغزیات کی طرح لحمیات زیادہ مقدار میں نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پکی سبزیوں اور ان کے سلاد کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

جن بچوں میں غذائیت کی کمی ہو، ان کے لیے ناریل کا دودھ بہترین غذا ہے۔ ناریل کے دودھ میں گری کی نسبت وٹامن اے زیادہ ملتا ہے۔ سونے سے پیشتر ناریل کا پانی پینے سے تھکے ماندے اعصابی نظام کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ نیند خوب آتی ہے۔ ناریل کا رس اپنے خواص کے اعتبار سے گائے اور بکری کے دودھ سے بھی بہتر ہے۔ ناریل کا تیل گھی کی طرح بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اس میں جسمانی صحت کی افزائش اور نشوونما کرنے اور جسم فربہ بنانے کی خاصیت موجود ہے۔

ناریل کا تیل حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھوپرے کا مغز اس پر موجود باریک چھلکے سمیت کدوکش کر لیا جائے پھر اسے پانی میں ڈال کر ہلکی آنچ دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ سردیوں میں تیل ازخود پانی کے اُوپر جم جائے گا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

جبکہ گرمیوں میں اسے فریج میں کچھ دیر رکھنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ پانی کے اُوپر جو تیل جم جائے، اسے جمع کر شیشی میں رکھ لیں۔

یہ عام بازاری تیل سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ تیل تیار کرنے کے بعد جو کھوپرا بچے، اسے بھی مختلف کھانوں میں استعمال کرنا ممکن ہے۔ گھر میں کھوپرے کے تیل سے مکھن بھی تیار کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نصف لیٹر ناریل کا تیل اور اتنی ہی مقدار میں مونگ پھلی کا تیل لے کر اس میں زرد رنگ یا گیندے کے پھولوں کا باریک سفوف شامل کر لیں۔ کھانے کا نمک تھوڑا سا ملا کر اسے انڈے کی طرح خوب پھینٹا جائے۔ جب تیل گاڑھا اور ٹھنڈا ہو جائے تو پھینٹنے کا سلسلہ روک دیں۔ بس مکھن تیار ہے۔ چونکہ یہ کم درجۂ حرارت پر بھی پگھل جاتا ہے، اس لیے مکھن کو فریج میں محفوظ رکھیں۔

پھل پر پائی جانے والی جٹائیں بھی مفید ہیں۔ ان جٹاؤں کو جلا کر راکھ حاصل کی جاتی ہے۔ یہ راکھ جریان خون روکتی ہے۔ اس لیے اسے منجنوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ بواسیر وحیض کا خون بند کرنے کے لیے بھی مریضوں کو کھلاتے ہیں۔ یہ جٹائیں سرکے یا پانی میں ملا کر ملنے سے چہرے کے داغ دھبے دور ہوتے ہیں۔

مختلف امراض میں شفائی اثرات:

اطبائے قدیم و جدید نے ناریل کے معجزہ نما شفائی اثرات کو تسلیم کیا ہے۔ ذیل میں چند اہم امراض میں ناریل کے طبی اعجاز اور شفائی تاثیر کا جائزہ نذر قارئین ہے۔

صفراوی بخار سے نجات:

ناریل کے پانی کو صفراوی بخاروں کے علاج میں اکسیری درجہ حاصل ہے۔ مریض کو ناریل کا پانی پلاتے رہنے سے بخار میں آرام آجاتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ ناریل کا پانی پلانے کے فوراً بعد سادہ پانی یا کوئی دیگر مشروب ہرگز نہ دیں۔ البتہ کچھ دیر بعد پیاس کی صورت میں پانی یا کوئی دیگر مشروب دیا جاسکتا ہے۔

گلے کی خراش اور خشک کھانسی:

ناریل کا دودھ گلے کی خراش اور سگریٹ نوشی کی وجہ سے ہونے والی خشک کھانسی کا مؤثر تدارک ہے۔ ان عوارض میں ناریل کا دودھ کھانے کا ایک چمچ، بھنگ کے بیج ایک چمچ، خالص شہد اور گائے کا دودھ رات سونے سے قبل استعمال کرنے سے گلے کی خراش اور خشک کھانسی ختم ہوجاتی ہے۔

پیٹ کے کیڑوں سے چھٹکارا:

پیٹ کے کیڑوں کے خاتمے اور اخراج کے لیے ناریل کا استعمال بے حد مفید ہے۔ پیٹ کے کیڑے ہلاک کرنے کے لیے ناریل بذات خود بھی فائدہ مند ہے۔ اسے مزید مؤثر بنانے کے لیے اس میں پلاس پاپڑہ بھی شامل کرتے ہیں۔

پلاس پاپڑہ ایک درخت ''ڈھاک'' کے بیج ہیں۔ پلاس پاپڑہ اور کھوپرا برابر مقدار میں ملا کر پیس لیں۔ اس دوا کی چھے گرام مقدار میں ایک چمچ سرکہ ملا کر تین چار دن تک صبح نہار منہ کھلائیے۔ مرض شدید ہونے کی صورت میں یہ دوا دن میں تین چار بار بھی دی جاسکتی ہے۔

ناریل اور پیشاب کے امراض:

ناریل کا پانی پیشاب کی بے قاعدگیاں دُور کرنے کے لیے مفید ہے۔ ناریل قدرتی طور پر پیشاب آور اثرات رکھنے والی دوا ہے۔ قلت بول اور احتباس بول کے عوارض میں ناریل کا پانی استعمال کرنے سے پیشاب جاری ہوجاتا ہے۔ پیشاب میں کیمیائی اجزاء کی موجودگی، مثانے کا استسقاء اور یورک ایسڈ کی زیادتی کی صورت میں ناریل کا پانی مؤثر دوا ہے۔

پیچش، اسہال، بواسیر اور معدے کا السر:

ناریل کی کچی گری نظام ہضم کی بے قاعدگیوں میں انتہائی مفید ہے۔ اس سے بدہضمی کے ساتھ ساتھ دست،

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اسہال، آنت کی سوزش، پیچش، بواسیر اور معدے کے السر کا خاتمہ ہوتا ہے۔ کچے ناریل کا پانی فساد ہضم، قے اور تبخیر کا شافی علاج ہے۔

ہیضے کا علاج:

ناریل کا پانی بارہ اونس لے کر اس میں لیموں کا رس ایک چمچہ ملا کر پینے سے ہیضے کی شکایت رفع ہوتی ہے۔ یہ آمیزہ خون کی تیزابیت ختم کرنے کے ساتھ ساتھ جسم میں الیکٹرولائٹ کا بھی توازن درست کرتا ہے۔ ہیضے کی صورت میں مریض کو پانی اور دیگر مشروبات زیادہ مقدار میں پینے پڑتے ہیں۔ اسی لیے معالجین متفق ہیں کہ رطوبتوں کے توازن کے لیے ناریل کا پانی ضروری ہے۔ اس پانی میں پوٹاشیم پایا جاتا ہے۔

خارش اور جلدی امراض:

ناریل بعض جلدی امراض میں بھی کرشمانی فوائد کا باعث بنتا ہے۔ کچے ناریل کے گودے سے کشید کیا ہوا تیل جھلسی جلد پر لگانے سے وہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تیل سے بنائے گئے مرہم بھی کافی موثر ہیں۔ یہ بہت جلد انسان کی جلد میں جذب ہو کر خارش، کھجلی اور دیگر جلدی امراض سے انسان کو شفایاب کرتے ہیں۔ خام گری کا رس، کیل، مہاسوں اور چھائیوں کو ختم کرتا ہے۔

بالوں کے امراض:

روغنِ ناریل بالوں کی جڑیں مضبوط رکھنے میں پوری معاونت کرتا ہے۔ سر کی خشکی کو دور کرنے میں بادام روغن سے بھی بہتر ہے۔ بالوں کو سیاہ، لمبا اور نرم و ملائم بناتا ہے۔ سر کی خشکی روکتا ہے اور بال گرنے بند ہو جاتے ہیں۔

چیچک کا علاج:

چیچک کی وبا کے دنوں میں حفاظتی تدابیر ملحوظ رکھتے ہوئے شیر خوار اور نو عمر بچوں کو ایک رتی وزن سے لے کر ایک ماشہ وزن تک دن میں دو مرتبہ کھوپرا دینے سے بچے چیچک کے حملے سے محفوظ رہیں گے۔ حملہ ہوا بھی تو اتنا شدید نہیں ہوگا۔ البتہ اگر کسی کو چیچک نکل چکی ہو تو بھی اسی وزن تک دے سکتے ہیں۔ اس سے چیچک کے گہرے نشانوں سے بچاؤ یقینی ہو جاتا ہے۔

ایک عجیب و غریب کرشمہ:

ناریل کے درخت کو شگاف دے کر اس کا پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ ''تذکرہ الہند'' اور ''خزائن الادویہ'' کے مطابق ناریل کا یہ رس 6 ماشے سے ایک تولے تک اگر حاملہ خاتون تیسرے ماہ سے شروع کر کے آٹھویں مہینے تک ہر ہفتے ایک یا دو مرتبہ پیتی رہے تو سیاہ فام والدین کی اولاد گندمی، گندمی والے والدین کی اولاد سفید جبکہ سفید رنگ والدین کی اولاد سفید و سیندور کے رنگ والی جنم لے گی اور سر کے بال سنہری ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

ہونٹوں کا پھٹنا اور خشکی:

ناریل کا تیل 12 گرام اور موم دو گرام لیں۔ گرم کر کے موم اور تیل ملا لیں اور دن میں دو تین مرتبہ ہونٹوں پر لگائیں۔ چند روز متواتر استعمال سے ہونٹوں کی خشکی ختم ہو جائے گی۔ پھٹے ہوئے ہونٹ نرم و ملائم اور خوبصورت ہو جائیں گے۔

متفرق امراض میں فوائد:

ناریل دل اور دماغ کو تقویت دیتا ہے۔ فالج، مالیخولیا اور جنون میں مفید ثابت ہے۔ حیض لاتا اور باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ بانجھ پن کے لیے مفید ہے۔ مثانے اور گردوں کی کمزوری کا خاتمہ کرتا ہے۔ جسم فربہ کرتا ہے۔ نیا خون پیدا کرنے کے علاوہ اسے صاف بھی کرتا ہے۔ لیکوریا کا خاتمہ کرتا ہے۔ خام گری کے استعمال سے مرض اٹھرا کا یقینی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یادداشت کی صلاحیت بہتر اور عضلات و پٹھے مضبوط کرتا ہے۔ بینائی مضبوط کرنے کے لیے ہر روز نہار منہ کوزہ مصری ہم وزن کے ساتھ کھانا بے حد مفید ہے۔ ناریل بخار اور

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

حکمرانوں کے لیے امتحان

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غائب پاتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز کی ادائیگی کے لیے تو باقاعدگی سے مسجد میں آتے ہیں مگر جونہی نماز ختم ہو وہ چپکے سے مدینہ کے مضافاتی علاقوں میں ایک دیہہ کی طرف نکل جاتے۔ کئی بار ارادہ بھی کیا کہ سبب پوچھ لیں مگر ایسا نہ کر سکے۔

ایک بار وہ چپکے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے چل دیئے۔ سیدنا دیہہ میں جا کر ایک خیمے میں چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد جب وہ باہر نکل کر واپس مدینے کی طرف لوٹ چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس خیمے میں داخل ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خیمے میں ایک اندھی عورت دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: "اے اللہ کی بندی! تم کون ہو؟

عورت نے جواب دیا: "میں ایک نابینا اور مفلس و نادار عورت ہوں۔ ہمارے والدین ہمیں اس حال میں چھوڑ کر فوت ہو گئے ہیں کہ میرا اور ان دو لڑکیوں کا اللہ کے سوا کوئی اور آسرا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر سوال کیا کہ یہ شیخ کون ہے جو تمہارا گھر میں آتا ہے؟ عورت (جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اصلیت نہیں جانتی تھی) نے جواب دیا کہ میں اس شیخ کو جانتی تو نہیں مگر یہ روزانہ ہمارے گھر میں آ کر جھاڑو دیتا ہے۔ ہمارے لیے کھانا بناتا ہے اور ہماری بکریوں کا دودھ دوہ کر ہمارے لیے رکھتا اور چلا جاتا ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ یہ سن کر رو پڑے اور کہا: اے ابوبکر! آپ نے اپنے بعد کے آنے والے حکمرانوں کے لیے ایک تھکا دینے والا امتحان کھڑا کر کے رکھ دیا ہے۔"

ذیابیطس میں پیاس بجھاتا ہے۔ اس کا تیل روزانہ پلکوں پر لگانے سے وہ بہت ملائم ہو جاتی ہیں۔ فالج، لقوہ، رعشہ اور وجع المفاصل میں بھی اس کا استعمال مفید ہے۔

ناریل کے چھلکوں کے جوشاندے سے غرارے کرنے پر دانت مضبوط ہوتے ہیں۔ قطرہ قطرہ پیشاب آنے کی بیماری میں مفید ہے اور اس مرض کو جڑ سے اُکھاڑتا ہے۔ کچا ناریل بھوک لگاتا اور زود ہضم ہوتا ہے۔ اگر بند چوٹ ہو تو پرانے ناریل میں ایک چوتھائی ہلدی ملا کر پوٹلی باندھ لیں۔ اسے گرم کر کے چوٹ کی جگہ ٹکور کرنے سے درد اور سوجن ٹھیک ہوتی ہے۔ چاول کھانے کے بعد تھوڑا سا ناریل کھا لینے سے وہ فوراً ہضم ہو جاتے ہیں۔

مضر پہلو:

جن لوگوں کو سر درد اور نکسیر کا دائمی عارضہ ہو، ان کے لیے اس کا استعمال مناسب نہیں۔ جن لوگوں کا جگر خراب ہو، وہ بھی ناریل کے استعمال سے بچیں۔ جن لوگوں کو اختلاج القلب کی تکلیف یا فشارِ خون کا عارضہ ہو، ان کے لیے اس کا استعمال آبیل مجھے مار کے مترادف ہے۔ کھانسی اور دمے میں ناریل کا استعمال بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ ناریل کھا کر پانی بالکل نوش نہ کیجیے۔

◆◆◆

☆☆☆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سنہرے دور کی دستک... ایک بار پھر!

اُردو ڈائجسٹ کے نامور خصوصی شمارے اب بہترین کاغذ پر کتابی شکل میں دستیاب ہیں

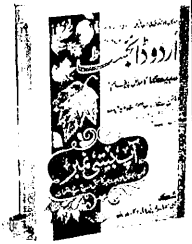

سال	مہینہ	خصوصی نمبر	سال	مہینہ	خصوصی نمبر
1969	جنوری	سالنامہ	2000	اپریل	آپ بیتی نمبر
1971	مارچ	سالنامہ	2000	دسمبر	مشرقی پاکستان نمبر
1971	نومبر	مشرقی پاکستان نمبر	2001	نومبر	افغانستان نمبر
1975	اپریل	سالنامہ	2001	دسمبر	قائداعظم نمبر
1975	اگست	آزادی نمبر	2002	اپریل	سیاحت نمبر
1975	ستمبر	دفاع نمبر	2003	دسمبر	فاطمہ جناح نمبر
1979	جون	انقلاب ایران نمبر	2004	اپریل	جدوجہد نمبر
1984	ستمبر	دفاع نمبر	2004	اگست	آزادی نمبر
1984	دسمبر	سالنامہ	2004	دسمبر	سالنامہ 40 سالہ انتخاب 1960 سے 2000
1986	جنوری	فروغ جمہوریت نمبر	2006	جنوری	صحت نمبر
1988	اپریل	رحمت اللعالمین نمبر	2011	جنوری	گولڈن جوبلی شکاریات نمبر
1988	اگست	آزادی نمبر	2011	مارچ	صحت نمبر
1989	مئی	رحمت اللعالمین نمبر	2011	مئی	غذائیات نمبر
1989	اگست	شہدائے پاکستان نمبر	2011	جون	عالمی سفرنامہ نمبر
1991	جنوری	سالنامہ	2011	جولائی	مہم جوئی نمبر
1994	فروری	عظیم مائیں نمبر	2011	اگست	آزادی نمبر
1994	مارچ	عظیم مائیں نمبر	2014	فروری	مزاح نمبر
1995	ستمبر	دفاع نمبر	2015	جولائی	طب وصحت نمبر
1999	جنوری	عظیم سفرنامے	2018	جون	آپ بیتی نمبر
1999	اکتوبر	چین نمبر			

اُردو ڈائجسٹ

آرڈر بک کروانے کے لیے ابھی رابطہ کیجیے 042-35290739, 0307-0060707

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فکر تونسوی

بیوی کی ڈوئی چھوڑ ہڑتال

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے، تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اکلوتی پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ پلّہ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا: ''یہ کیا ہے حضور؟''

وہ بولی: ''جھنڈا اُونچا رہے ہمارا۔''

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشک بتاں تھا، آج کسی انجمن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا

؎ اُٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

میں نے کچھ مسکرا (اور کچھ ڈر کر) کہا: ''اے انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ۔''

وہ اپنی سڈول بانہوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی: ''آج کھانا نہیں ملے گا، آج چولھا ڈاؤن اسٹرائیک ہے۔''

شُبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور بیگم کے ساتھ رومانوی گفتگو کرنا

Nadeem Azeem
www.pakistanipoint.com

ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز اُجاگر کرتا ایک پُرلطف اور شگفتہ قصّہ

فضول۔ یہ کس ستمگر نے گھر پر انقلابی چھاپہ مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کے بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب ولہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا: ''بیگم! تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم میری بیوی ہو۔''

تڑاخ سے جوب آیا: ''ہاں، مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں۔''

''مگر ڈارلنگ!'' میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا ''مالک تو تم ہو، میرے دل وجان کی مالک، اس گھر کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو۔ بتاؤ ہو کہ نہیں؟''

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ طلسم ہوشربا کا کام کر جاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آ گرتی تھی لیکن آج اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر مارتے ہوئے بولی: ''سیٹھ جی! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکیں اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور...... جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔''

میں نے کہا: ''کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟''

وہ بولی: ''نہیں شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اُٹھا ہے۔ لہٰذا میرے مطالبات مانیے نہیں تو......''

''کون سے مطالبات؟''

''سب سے پہلے......'' بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں گھنگھروؤں کی مانوس جھنکار نہیں بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی۔ ''سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انھیں کم کر کے نو گھنٹے کیے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی دستور ہے۔''

''مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے۔''

وہ بھڑک اٹھی: ''اور بائی دی وے، جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ ہاں تو ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لیے نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟''

میں نے کہا: ''دیکھو ڈارلنگ...... نہیں! ورکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں؟''

سوکن کا جلاپا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بُوجھ کر اُنگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی: ''یہ مالک کا اپنا مسئلہ ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔''

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لیے پریشان کُن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا: ''مگر اُسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے، تمھارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔''

''اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔''

''میں نے کہا؟ یہ مالک کا سردرد ہے، اُسے خود سوچنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''مینجمنٹ اس پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔''

''دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔''

''مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیشکش کر چکا مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔''

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''دیکھیے آپ اسے مذاق میں مٹ ٹالیے (حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگاروں کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے چائے پینے آٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقر عید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی۔ نہ میڈیکل، نہ ایمرجنسی چھٹی! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا لیکن مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

سچ تو یہ کہ مطالبہ بالکل جائز تھا لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کرلو تو اُسے احسان کا درجہ دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا: ''دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی۔''

''لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔''

''میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچا عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی، سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مُسلط ہوجائے گی۔ سارا کام اُس روز پٹ ہو جائے گا، یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرادی گئی ہے۔ بچے روئیں گے، میں روؤں گا، گھر کی بلی اور طوطا بھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں، تمہاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟''

''آپ کیجیے گا۔'' جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا: ''اچھا چلو میں تمہاری ہفتہ وار چھٹی منظور کرتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کروگی کیا؟''

''بس بیٹھی رہوں گی، سوئی رہوں گی، تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔''

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے، اور یجنل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں، یعنی چھٹی کے دن کام کرو، تو دوگنی اجرت ملے گی، اوور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کو اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہوکر آواز دی: ''ویکلی چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جایا کرو۔''

میکے کے ''لنچ'' پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے۔ میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی پخ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے تھے۔ سوچا کہ اس سے بیگم خوش ہوجائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہوتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہوں۔

بیگم نے زیرِ لب تبسم سے اس فیصلے پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہوکر کہا:

ہکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لیے اُسے جو رقم دی جاتی ہے، اس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ اشیاء کے پُرانے نرخ قائم نہیں رہے۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہوگئی ہے مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے جھٹ کہا: ''بیگم! مجھے تمہارے اس

Asghar Azeem www.pakistanipoint.com

مطالبے سے ہمدردی ہے، بلکہ صرف ہمدردی ہے۔''

وہ تڑپ اُٹھی: ''مگر صرف ہمدردی سے تو بنیان بھی نہیں آ سکتی۔''

''تو بنیان نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے: ''روکھی سوکھی کھا ٹھنڈا پانی پی۔'' تو اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔''

جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ رُوکھے سوکھے کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ معیارِ زندگی گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کیے اور دھمکی دی: ''گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو۔ خالی خُولی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ ہو گئے تو میں بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟''

''اپنی آمدنی بڑھاؤ'' انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

''کیسے؟''

''رشوت لو، جیب کترنا شروع کر دو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائسنس لے لو۔ ساری دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔''

میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے، میں اسے چند کرنسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیانوں اور آلو گوبھی کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مُصر تھی: ''ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے میرا یہ مطالبہ مان لو ورنہ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کر دوں گی۔'' یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا، مگر خاندانی اخلاق کو طلاق نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بُحرانی خاموشی کے بعد بیگم بولی: ''تو کیا ارادے ہیں؟''

''مطالبہ رد کیا جاتا ہے۔'' میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

''لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس بات پر غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کرواؤں یا نہیں؟''

''مجھے یہ چیلنج منظور ہے۔''

اس مرحلے پر آ کر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے مطابق بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ میں خصلت کے مطابق یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آ گرا ہے۔ پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

''یہ کون تھا؟''

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی:

''اُٹھو، کھانا کھا لو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' ◆◆◆

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

شان آغا

ریورس سوئنگ کا موجد

یہ 1978ء کی سردیوں کے دن تھے جب پاکستانی اور بھارتی کرکٹ ٹیموں کے کھلاڑی ایک روزہ میچوں کی سیریز کا فیصلہ کن میچ کھیلنے ساہیوال پہنچے۔ پاکستان نے 40 اوورز میں 205 رنز کا مجموعی اسکور کیا، جواب میں ہندوستان نے 2 وکٹوں کے نقصان پر 183 رنز بنا لیے۔ انھیں آخری 3 اوورز میں 23 رنز درکار تھے جب سرفراز نواز نے 78 رنز پر بیٹنگ کرنے والے چھے فٹ لمبے انشومان گائیکواڈ کو گیند کرانے کے لیے بھاگنا شروع کیا۔

یہ گیند شارٹ تھی اور گائیکواڈ کے سر کے کافی اوپر سے گزرتے ہوئے سیدھی وسیم باری کے دستانوں میں محفوظ ہو گئی۔ تمام نظریں پاکستانی امپائرز جاوید اختر اور خضر حیات پر مرکوز تھیں جو اپنی اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔

سرفراز نے اگلی تین گیندوں پر یہ عمل دہرایا۔ ہندوستانی کپتان بشن سنگھ بیدی شدید غصے میں تھے اور انھوں نے ہاتھ ہلا کر بلے بازوں کو واپس پویلین آنے کا اشارہ کیا۔

اس طرح یہ کرکٹ کی تاریخ کا پہلا ایک روزہ انٹرنیشنل میچ بن گیا جس میں کسی ٹیم نے کھیل ختم ہونے سے قبل ہی شکست تسلیم کر لی اور میچ پاکستان کے نام کر دیا گیا۔ اس طرح کا اگلا واقعہ 22 سال بعد ہوا جب انگلینڈ کے ایلک اسٹیورٹ احتجاجاً پچ چھوڑ کر گراونڈ سے چلے گئے تھے۔ پاکستان کو اس وقت میچ جیتنے کے لیے 61 گیندوں پر چار رنز درکار تھے۔

پاکستان نے بھارت کے خلاف 1978ء کی سیریز 1-2

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کرکٹ کے میدان سے لے کر سیاست تک میں اپنی تیز و تند طبیعت سے ہلچل مچا دینے والے کھلاڑی کا دلچسپ ماجرا

ے سیتی اور ساہیوال دوبارہ کسی انٹرنیشنل میچ کی میزبانی نہ کرسکا۔

پاکستانی کرکٹ کا پہلا بدمعاش

یہ سوچنا انتہائی مشکل ہے کہ سرفراز نے یہ طرزِ عمل کپتان مشتاق محمد کی منظوری اور پاکستان امپائرز کی مداخلت کے بغیر انجام دیا۔ معاملہ چاہے جو بھی، یہ سرفراز نواز ہی تھے جو رسنا کارانہ طور پر پاکستان کرکٹ کے پہلے بدمعاش بنے۔

بچپن میں سرفراز نواز نے کبھی کرکٹ کھیلنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، 17 سال کی عمر میں وہ اپنے خاندانی کاروبار کا حصہ بن گئے اور لاہور گورنمنٹ کالج کے کرکٹ گراونڈ کی دیوار بنانے میں شریک رہے۔

لیکن 1965ء کی جنگ چھڑ گئی اور تعمیرات روک دی گئی۔ اسی گراونڈ میں سرفراز نے کرکٹ کھیلنے والے گروپ کو جوائن کرلیا اور پھر بقیہ کہانی تاریخ کا حصہ بن گئی۔

انھوں نے اپنا فرسٹ کلاس ڈیبیو 1967ء میں کیا اور 1969ء میں انٹرنیشنل ڈیبیو سے قبل انھیں کاونٹی کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ نیٹ میں ان کی عمدہ سوئنگ باولنگ نے دورہ کرنے والی میری لیبون کرکٹ کلب (ایم سی سی) کے رکن اور نارتھمپٹن شائر کے کپتان راجر پریے ڈیوکس کو خاصا متاثر کیا۔

مشتاق محمد کی قیادت میں سرفراز نواز کی صلاحیتیں خوب نکھر کر سامنے آئیں جہاں سابق کپتان 70ء کی دہائی میں پاکستان کرکٹ کی سوچ کی تبدیلی میں مصروف تھے۔ اپنے پیشرو باولرز سے روایت شکنی اور کھیل میں جارحانہ مزاجی اور لانے کا جذبہ بیدار کرتے ہوئے سرفراز پاکستان کے نئے فاسٹ باولنگ اٹیک کے سرخیل بنے۔

1975ء میں ہیلمٹ سے پہلے کے دور میں جب نارتھمپٹن کے لیے کھیلنے والے سرفراز نواز کو جیف تھامسن نے ایک باؤنسر کرایا تو سرفراز نے چیخ کر کہا: ”مقامی قبرستان میں ایک قبر خالی ہے۔“

جب تھامسن بیٹنگ کے لیے آئے تو سرفراز نے انھیں باؤنسر کرا کر آوٹ کردیا۔ اس وقت میں مشتاق محمد بھی سرفراز کی ٹیم کا حصہ تھے اور جلد ہی ان کے کپتان بنے۔

1976ء میں پاکستان کئی سال بعد آسٹریلیا اور ویسٹ انڈیز کے تاریخی دورے پر روانہ ہوا۔ مشتاق نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ آسٹریلیا کو ہرانے کے لیے پاکستان کو برابری کی سطح پر کھیلنا ہوگا۔ آسٹریلیا سے نمٹنے کے لیے کرکٹ میں مہارت کے ساتھ ساتھ فقرے بازی بھی انتہائی اہم تھی۔

پورے دورے کے دوران پاکستان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا یہاں تک کہ قومی ٹیم آخری ٹیسٹ کھیلنے سڈنی پہنچی۔ ڈینس للی نے اپنی کتاب میں دورے کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایک نسبتاً سخت رویے والی اور ہر شعبے میں جارح مزاج پاکستانی ٹیم کا سامنا کیا۔

للی اور گلمور نے پاکستانی بلے بازوں پر باؤنسر اور گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ للی کی ایک تیز گیند سرفراز کی پسلیوں میں لگی جس سے وہ انتہائی تکلیف میں نظر آئے۔ انھوں نے اپنا بلا پھینک دیا اور لیگ امپائر کی جانب جا کر عامیانہ انداز میں شکایت کی۔

جب پاکستان باولنگ کے لیے میدان میں اترا تو یہ بدلہ چکانے کا وقت تھا۔ عمران خان اور سرفراز نواز نے اپنے ہی انداز میں حریف بیٹنگ لائن کو تہس نہس کردیا۔

مشتاق نے 19 سالہ جاوید میانداد کو سلی پوائنٹ پر کھڑا کیا جو سرفراز نواز اور عمران کی باولنگ کے دوران مستقل بلے باز کو یہ جملہ کہہ رہے تھے: ”اب یہ تمہیں ہلاک کردے گا۔“ اس کے بعد میانداد نے اردو فلموں کے گانے گانا شروع کردیئے۔

للی نے شکایت کی اور بہت زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرنے پر امپائرز نے مشتاق کو تنبیہ کی لیکن انھوں نے اسے یکسر نظر انداز کردیا۔

اس میچ میں عمران خان اور سرفراز نے 18 وکٹوں کا بٹوارا کیا جس کی بدولت پاکستان نے آسٹریلین سرزمین پر پہلی فتح حاصل کی۔

www.pakistanipoint.com

اسی سال کے آخر میں مشتاق پانچ پاکستانی کھلاڑیوں کے ساتھ آسٹریلیا میڈیا ٹائیکون، کیری پیکر کی آسٹریلیا میں ہونے والی ورلڈ سیریز کھیلنے گئے۔

1978ء میں بھارتی ٹیم طویل عرصے کے بعد پاکستان کے دورے پر آئی تو پورے ملک کو کرکٹ کا بخار چڑھ گیا۔ قومی ٹیم لاہور ٹیسٹ شروع ہونے سے ایک روز پہلے قذافی اسٹیڈیم لاہور میں پریکٹس میں مصروف تھی۔ سرفراز نواز ایک بنیان اور جانگیے میں ملبوس اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ تبھی منچلوں کا ایک ٹولہ ایک بالکونی پر کھڑا سرفراز نواز پر مسلسل آوازے کسنے لگا۔ سرفراز نواز پہلے تو نظر انداز کرتے رہے لیکن پھر وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے۔ انھوں نے ان منچلوں کی طرف دیکھ کر کہا: ''کیا تکلیف ہے؟''

اس پر منچلے خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس پر سرفراز نواز نے قریب پڑا ہوا ایک بلا اٹھایا اور منچلوں کو مارنے ان کے پیچھے بھاگے۔ منچلے فوری طور پر سیڑھیوں سے اتر کر باہر بھاگ گئے۔ اسٹیڈیم میں موجود تمام لوگ یہ منظر دیکھ کر قہقہے لگاتے رہے۔ سرفراز کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو قہقہوں کا طوفان بھی تھم گیا۔

سیاست اور کمنٹری میں مخالفین پر دھاوا

پاکستان میں متعدد مرتبہ ریٹائرمنٹ کا اعلان کرنے کی روایت پہلی مرتبہ سرفراز نواز نے ڈالی۔ 1984ء میں حتمی طور پر ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک بے باک کمنٹیٹر بن گئے۔

1985ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں رکن پارلیمنٹ بنے۔ اس وقت کے وزیراعلیٰ نواز شریف کے زیر سایہ وہ پنجاب اسپورٹس بورڈ کے وائس چیئرمین کے عہدے پر بھی خدمات انجام دیتے رہے جہاں وزیراعلیٰ خود بورڈ کے چیئرمین تھے۔

1988ء میں جب بینظیر بھٹو کی وطن واپسی ہوئی تو انھوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ سے الیکشن لڑا۔ 2011ء میں وہ ایم کیو ایم کا حصہ بنے۔

1980ء کی دہائی میں انھوں نے آصف اقبال اور سنیل گواسکر پر میچ فکسنگ کا الزام عائد کیا۔ جسٹس قیوم کی عدالت میں انھوں نے 1990ء کی دہائی کے تقریباً تمام ہی کرکٹرز کے خلاف گواہی اور ثبوت دیے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ پاکستانی ٹیم ورلڈ کپ 2007ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ جان بوجھ کر ہاری جس کے نتیجے میں جمیکا میں باب وولمر کی موت ہوئی۔

میچ فکسنگ کے خلاف آواز اٹھانے پر اسلام آباد کے پارک میں مبینہ طور پر مسلح افراد نے ان پر حملہ کیا جس کی انھوں نے ایف آئی آر بھی کٹوائی۔

انھوں نے لاہور کی نیشنل کرکٹ اکیڈمی میں پاکستانی اور دہلی کے کلینک میں ہندوستانی فاسٹ باولرز کی کوچنگ کی۔ کینسر کے موذی مرض سے لڑنے والی اداکارہ رانی سے ان کی شادی ہوئی۔ انھیں اداکارہ کے ساتھ متعدد فلموں میں کام کرنے کی پیشکش بھی ہوئی جسے انھوں نے رد کر دیا۔

2016ء میں سرفراز نواز نے اپنے سابق ساتھی اور سیاست میں قدم رکھنے والے کھلاڑی، عمران خان پہ الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ انھوں نے روزنامہ دنیا کے رپورٹر سے گفتگو کرتے ہوئے تحریک انصاف کے چیئرمین سے سات سوال کیے:

1۔ عمران اور ان کی بہن علیمہ نے یو اے ای میں جو فلیٹ خریدا، اس کی رقم کہاں سے آئی؟

2۔ عمران جب پاکستانی ٹیم کے کیپٹن تھے تو ایک کھلاڑی کو ٹیم میں شامل کرانے کے کتنے پیسے لیے تھے؟

3۔ حسیب احسن کو ٹیم مینیجر بنوانے کے لیے کتنے پیسے لیے گئے؟

4۔ عمران خان کی 96۔1995ء اور 14-2103ء کے انکم ٹیکس ریٹرنز میں زمین و آسمان کا فرق کیوں ہے؟۔

5۔ سیتا وائٹ سے پیدا ہونے والی بیٹی، ٹیرین کے ساتھ فوٹو سیشن کے واسطے انگریزی میگزین سے کتنے پیسے لیے تھے؟

6۔ ورلڈ کپ 1987ء میں راولپنڈی میں پاکستان اور

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

انگلینڈ کے درمیان ہونے والے میچ کے دوران باؤلنگ کے وقت کہاں غائب ہو گئے تھے؟

7۔ چیلسی میں جو فلیٹ خریدا تھا، اسے کتنے میں رہن رکھا تھا اور کتنے میں فروخت کیا؟

اس موقع پر سرفراز نواز نے کہا کہ میری کوئی سیاسی جماعت ہے نہ میرے سیاسی مقاصد مگر تحریک انصاف کے پیئر مین بتائیں، مذکورہ سوالات کی روشنی میں کیا وہ آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ انھوں نے کہا، عمران خان بتانا پسند کریں گے کہ جمائما سے طلاق کے عوض بھاری رقم وصول کرتے وقت ان کا ضمیر کہاں تھا؟

خان دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے بیرون ملک کمنٹری سے کروڑوں روپے کمائے ہیں حالانکہ اس کی آڑ میں وہ اپنا کالا دھن سفید کرتے تھے۔ نیز انھوں نے لندن میں بکیز سے مل کر اپنے سالے، زیک کو دس ہزار پاؤنڈ جتوائے جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔

سرفراز نواز نے نیب اور ایف آئی اے حکام سے مطالبہ کیا کہ عمران خان نے چیلسی میں جو فلیٹ رہن رکھا تھا اور بعد میں فروخت کیا، وہاں کی رجسٹری سے معلومات حاصل کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جائے۔

ریورس سوئنگ کے موجد

تمام تر چمک دمک، طاقت اور سیاست اور الزامات کے باوجود کرکٹ کے کھیل میں ان کی مہارت اور فن ہی تھا کہ جس کے لیے سرفراز نواز کو یاد رکھا جائے گا۔ وہ ہمیشہ ہی ریورس سوئنگ کے موجد کے طور پر جانے جائیں گے۔

مسلسل کوششوں اور غلطیوں سے سبق سیکھتے ہوئے سرفراز نے یہ پتا چلایا کہ کرکٹ کی گیند کو ایک طرف سے کھردرا کر دیا جائے اور دوسری سائیڈ کو نیا رکھیں تو بلے باز کے لیے گیند کھیلنا مشکل ہو جائے گا۔

گیند کے دو حصوں میں جتنا زیادہ فرق ہو گا، اتنے ہی کم وزن اور زیادہ رفتار کے ساتھ گیند سفر کرتی ہوئی ہوا میں بے پناہ سوئنگ ہو گی۔ انھوں نے اپنے باؤلنگ پارٹنر اور دوست عمران خان کو بھی یہ گر سکھایا تھا۔

چاہے وہ ابتدا میں اس کے پیچھے چھپی مکمل سائنس سے واقف ہوں یا نہیں لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ فاسٹ باؤلنگ کے فن کو ہمیشہ کے لیے بدل رہے ہیں۔

یہ فن خفیہ ہی رہا اور وسیم اکرم اور وقار یونس تک منتقل ہوا جو بعد میں ریورس سوئنگ کے بے تاج بادشاہ بنے۔ یہ وہ وقت تھا جب بہت کم لوگ اس بارے میں جانتے اور اس سے بھی کم لوگ سمجھتے تھے۔

ایک بار پھر 1979ء کی گرمیوں میں واپس چلتے ہیں جب میلبورن کرکٹ گراونڈ کے پانچویں دن کھیل کی چوتھی اننگز میں تاریخی 381 رنز کے تعاقب میں آسٹریلوی ٹیم تین وکٹ کے نقصان پر 305 رنز بنا چکی تھی۔

اس کے بعد سرفراز نے بقیہ سات وکٹیں صرف ایک رن دے کر حاصل کیں۔ انھوں نے اننگز میں نو وکٹیں لیں، صرف گراہم یلپ ان سے بچ سکے کیونکہ وہ رن آوٹ ہوئے تھے۔

پاکستان نے دوسری مرتبہ آسٹریلیا میں ٹیسٹ میچ جیتا اور سرفراز نے اس میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے کیریئر کی بہترین باؤلنگ کرتے ہوئے 86 رنز کے عوض نو وکٹیں لیں۔

اس وقت دنیا کے کسی بھی اچھے باؤلنگ اٹیک میں ریورس سوئنگ ایک اہم ہتھیار سمجھا جاتا ہے اور مستقبل میں بھی سمجھا جاتا رہے گا۔

انگلینڈ کے پرنس رنجیت سنجھی کے لیگ بال اور برنارڈ بوسانکوئیٹ کی گوگلی کی طرح سرفراز نواز کی میراث..... ریورس سوئنگ میں بھی ہمیشہ زندہ رہے گی۔

سرفراز نواز کا کہنا ہے کہ مجھے اپنے کرکٹ کیریئر میں کوئی پشیمانی اور افسوس نہیں۔ میں نے بہت کچھ حاصل کیا اور کرکٹ کا شکریہ جس کی بدولت میں نے مکمل، متحرک اور رنگین زندگی گزاری۔ حالیہ یکم دسمبر کو پاکستان کے یہ عظیم باؤلر 71 برس کے ہو گئے۔ ◆◆◆

www.pakistanipoint.com Waqar Azeem

شیام اور پُشپا کی عجب کہانی

موسیٰ رضا

1980ء سے کچھ پہلے مجھے ایک سرکاری کام سے پہلی بار سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہوٹل میں میرے لیے کمرا محفوظ کرانے کے علاوہ دفتر والوں نے ہوائی اڈّے پر میرے استقبال اور گاڑی وغیرہ کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ مجھے کسی ایسے غیر سرکاری مقامی راہنما کی ضرورت تھی جو مجھے شہر کی سیر کرا سکے۔ میری بیوی اور بیٹیوں نے مجھے ایک لمبی چوڑی اور بھیانک قسم کی فہرست دے دی جس کے مطابق مجھے خریداری کرنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر مجھے کوئی ماہر راہنما نہ ملا تو میں اس فہرست میں گڑبڑ کر دوں گا۔

لہٰذا میں نے احمد آباد میں مقیم اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا وہ سنگاپور میں کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جس کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جا سکے؟ اس نے سنگاپور میں کسی سے بات کی اور مجھے کمار نامی ایک شخص کا حوالہ دیا جو وہاں کا ایک مقامی شہری اور درآمد برآمد کے کاروبار سے منسلک تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ملائشیا میں بھی اس کے کچھ باغات ہیں۔ میرے دوست نے کمار کے ساتھ یہ بندوبست کر دیا کہ وہ سنگاپور میں گھریلو سامان کی بھول بھلیوں جیسی دکانوں میں میری راہنمائی کے فرائض انجام دے گا۔

جب میں اپنی ٹرالی دھکیلتا اڈّے سے باہر نکلا تو میرے لیے دو افراد میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو سرکاری افسر تھا جو میرے استقبال کے سنگاپور کے ہوائی نام کے پلے کارڈ

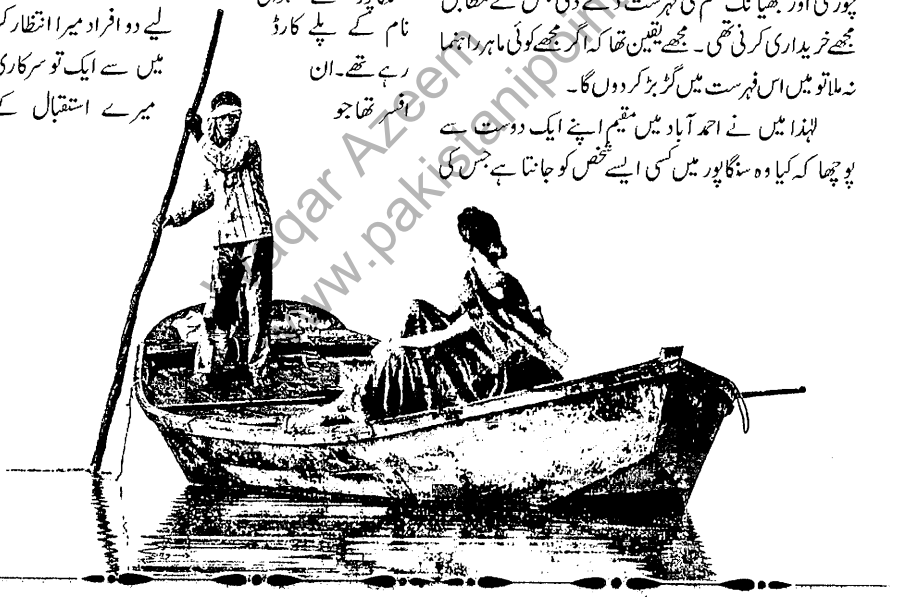

قدرت کے نرالے کھیل کا سحر آفریں ماجرا، اس نے دو بچھڑے پنچھیوں کو یکجا کر ڈالا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

لیے آیا۔ دوسرا شخص کچھ سانولی رنگت اور گہری نیلی آنکھوں والا ایک خوبصورت چالیس سالہ آدمی تھا۔ وہ ہلکے رنگ کا عمدہ تراش خراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں اور دوسرے خدوخال مانوس معلوم ہو رہے تھے۔ میں اپنے ذہن پر پورا زور دے کر سوچنے لگا کہ پہلے اس سے کہاں ملا تھا؟

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو ایک مخصوص ماحول میں دیکھتے ہیں اور وہ شخص اپنے نقوش آپ کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے۔ پھر کبھی آپ اس شخص کو اسی ماحول میں دیکھیں تو اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ آپ اسے بھول جائیں لیکن اس شخص کو آپ مخصوص منظر سے ہٹا دیجیے، لباس تبدیل کرا دیجیے اور اسے ایک مختلف فریم میں رکھ کر سوچیے تو آپ اپنے ذہن پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیں اسے آپ ہرگز پہچان نہیں پاتے اور نہ اس کا نام یاد کر پائیں گے۔ بس آپ کو بے چینی سی ہوگی کہ آپ نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔ لہٰذا میں اس شخص کی طرف بڑھا اور اپنا تعارف کرایا۔

’’ٹھیک ہے جناب، میں آپ کو جانتا ہوں‘‘ اس نے کہا ’’لیکن آپ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔ ان دنوں میرا نام شیام لال تھا۔ جب آپ رانا گڑھ آئے تھے تو میں آپ کو پرندے دکھانے نال سروور جھیل لے گیا تھا۔‘‘

اچانک مجھے تمام باتیں یاد آ گئیں۔ آخری بار میں نے شیام لال پدھر کو اس وقت دیکھا تھا جب ہم اپنی گاڑی میں رانا گڑھ سے گجرات واپس جا رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہتے ہوئے شہزادی پشپا کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں برسوں پہلے شیام لال پدھر سے ملا تو وہ بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ پدھر ایک قدیم قبائلی قوم ہے۔ وہ جھیل نال سروور کے کناروں پر آباد ہے۔ اب تو یہ جھیل گجرات میں سیر و سیاحت کی بہت اہم جگہ ہے۔ میٹھے پانی کی ایک بہت لمبی چوڑی جھیل ہے (میں کلومیٹر میں اس کی لمبائی نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے اعداد و شمار یاد نہیں) لیکن اس کی گہرائی کہیں بھی سات آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں۔ احمد آباد والے حصے کے کنارے پر سیمنٹ اور لوہے کی کچھ بدہیئت کوٹھیاں بنا کر جھیل کو سیرگاہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ کچھ پتوار اور کچھ موٹر سے چلنے والی کشتیاں موجود رہتی ہیں۔ جاڑے کا موسم شروع ہوتے ہی وہ لوگ جو خود کو پرندوں کا شوقین سمجھتے ہیں، اپنی گاڑیوں میں اس تفریح گاہ پر آنے لگتے ہیں۔ کشتیوں میں بیٹھ کر پکنک مناتے ہوئے جو شور غل مچاتے ہیں، اس سے دن بھر جھیل گونجتی رہتی ہے۔

اس ہنگامے کا نتیجہ یہ ہے کہ نقل مکانی کرنے والے پرندے جو ایک گرم اور آرام دہ موسم سرما کی امید میں سائبیریا، اسکینڈے نیویا اور گرین لینڈ وغیرہ کے سرد علاقوں سے نال سروور آتے ہیں، اُکتا کر یا تو پانی کے ایسے چھوٹے چھوٹے قطعوں میں پناہ لے لیتے ہیں جو سیاحوں کے لیے ناقابل رسائی ہوں یا پھر وہ جھیل کی دوسری طرف اس کنارے پر چلے جاتے جدھر پدھر رہتے ہیں۔

جس طرح تمام قبائلیوں کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں، اسی طرح پدھروں کی بھی اپنی امتیازی نسلی خصوصیت اور تہذیب ہے۔ ان کی اکثریت نال سروور کے دلدلی کنارے پر اس گاؤں میں رہتی ہے جسے رانا گڑھ کہتے ہیں۔ رانا گڑھ کی طرف جھیل زیادہ گہری نہیں اور وہاں کنارے پر پانی میں لمبی لمبی سرکنڈے نما گھاس اُگی ہوئی ہے۔ یہ سرکنڈے آٹھ سے دس فٹ لمبے ہوتے ہیں، چار فٹ پانی کے اندر بقیہ حصہ اُوپر ہوتا ہے۔ پدھروں نے اس گھنے حصے کو کاٹ کر ٹیڑھی میڑھی تنگ نہروں کی بھول بھلیاں بنا رکھی ہیں۔ اپنی تنگ اور چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر یہ لوگ مچھلیوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ سردیوں میں دُور دراز کے ملکوں سے آئے پرندوں کا غیر قانونی شکار کر کے اپنی لحمی خوراک میں اضافہ کر لیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مرغابیوں، جنگلی بطخوں، آبی سفید تیتروں، دراز چونچ پرندوں اور بے شمار دوسری اقسام

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کے نقل مکانی کرنے والے پرندوں کے بسیرا کرنے کی عادات کے ماہر ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے کون سی چڑیا کب نال سروور آتی ہے، کہاں بسیرا کرتی، کب اور کہاں انڈا دیتی، اُسے کتنے دن تک سیتی، کون سی مچھلی کھانا پسند کرتی ہے اور تلے جانے کے بعد اس چڑیا کا مزا کیسا ہوتا ہے۔

رانا گڑھ چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں صرف سریندر نگر کی طرف سے جایا جا سکتا ہے۔ کسی نے اب تک اسے سیاحوں کے لیے ترقی دینے کے بارے میں نہیں سوچا۔ بہرحال اگر آئندہ بھی کسی نے ایسی مداخلت کا ارادہ کیا تو وہاں اس کی ایک قدرتی حفاظت موجود ہے۔ اپنے محل وقوع کی بنا پر یہ جگہ جھیل کے دلدلی علاقے کے قریب واقع ہے لہٰذا یہ لاکھوں کروڑوں مچھروں کا بھی ٹھکانا ہے جو یہاں دن رات مصروف عمل رہتے ہیں۔

طویل عرصے سے جاگیرداری ریاست کے باشندے ہونے کی وجہ سے یہ مچھر دیوہیکل قد بدن کے حامل ہو چکے۔ ان کی کاٹ ان کی بھنبھناہٹ سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ جب تک کسی کے پاس کثیر مقدار میں مچھروں سے بچاؤ والی کریم اور مچھر دانیاں نہ ہوں تو بہتر یہ ہے کہ وہ رانا گڑھ کی سیر کو نہ جائے۔ پدھر علاقے میں طویل مدت سے رہ رہے ہیں لہٰذا وہ ان خوفناک مچھروں کی زد میں رہتے رہتے نہ صرف ان کے کاٹنے بلکہ ملیریا سے بھی محفوظ و مامون ہو گئے ہیں۔ شاید ہی کبھی کوئی پدھر اس خوفناک بیماری کا شکار ہوا ہو۔

جب میں نے اپنا پروگرام بنایا تو رانا گڑھ جانے کے خطرات سے آگاہ نہ تھا۔ وہاں بنیادی صحت کا ایک ذیلی مرکز تعمیر کیا جا رہا تھا اور زیرِعمل منصوبوں کا معائنہ کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

جس روز ہمیں جانا تھا، اس سے ایک دن پہلے ٹھاکر صاحب اپنی بیٹی پشپابا کے ہمراہ ہم سے ملنے آ گئے۔ ٹھاکر راجیندر سنگھ جی ایک چھوٹی سی دیسی ریاست کے حکمران تھے۔ آزادی کے بعد جب ریاستیں ختم ہوئیں اور ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ ان کا انضمام ہو گیا تو ٹھاکر صاحب نے بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اس ضلع میں سفر کے دوران میں ہم دونوں اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ ان سابق حکمرانوں میں شامل تھے جنھوں نے اپنی ریاست کے خاتمے سے اپنے طرزِ زندگی اور اپنی اقدار کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ اب بھی ایک آراستہ پیراستہ محل کے مالک تھے۔ اگرچہ وہ اس محل سے یقیناً چھوٹا ہو چکا تھا جہاں کبھی گیارہ اور سترہ توپوں کی سلامیاں دی جاتی تھیں۔

ان کے یہاں مہمانوں کے قیام اور تواضع کا بھی معقول انتظام تھا۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی بیوی مر چکی تھی اور پشپابا ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے نام میں ''با'' احترام ظاہر کرنے کا ایک اضافہ تھا جس کے معنی ہیں ''ماں۔'' سوراشٹر کے شاہی خاندان کی عورتوں کے ناموں کے ساتھ یہ اضافہ کیا جاتا ہے۔ پشپابا کی عمر بیس سال سے کم تھی۔ وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے مقامی کانونٹ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک حکمران کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی عادتیں کسی حد تک بگڑی ہوئی تھیں۔ فطرت میں ایک قسم کی خودسری اور ضد کا مادہ پیدا ہو گیا تھا لیکن بحیثیت مجموعی وہ محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

جب اس شام ٹھاکر صاحب ہمارے یہاں چائے پر آئے تو میں نے انھیں اپنے رانا گڑھ کے مجوزہ دورے سے آگاہ کیا۔

''اوہ انکل'' پشپا نے کہا: ''میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ مجھے جھیل اور پرندے دیکھنے کا بے پناہ شوق ہے۔ براہ کرم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔'' پھر اس کے بعد وہ اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولی: ''پاپا، آپ انکل اور آنٹی کے ساتھ مجھے بھی جانے دیجیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی'' (یہ جانتے ہوئے بھی کہ حسن آراء اس سے عمر میں بہت بڑی نہیں تھی، پشپابا نے صرف مرتبے کے لحاظ سے اسے آنٹی کہا تھا۔)

ٹھاکر صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورتحال

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے کیسے نمٹیں۔ وہ ایک شفیق باپ تھے لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک جوان لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے میں ہم لوگوں کو کوئی زحمت ہوگی یا نہیں؟ چنانچہ حسن آراء نے مداخلت کی اور کہا:

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم پشپا کو بڑی خوشی سے ساتھ لے جائیں گے۔ بلکہ آپ خود بھی ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟''

اس مرحلے پر میرے لیے بھی کچھ کہنا لازم ہوگیا۔

''بالکل، آپ اور پشپا کے چلنے سے ہم لوگوں کو بے انتہا خوشی ہوگی لیکن میں آپ کی آگاہی کے لیے یہ ضرور بتا دوں کہ وہاں قیام گاہ بڑی پرانی وضع کی ہے۔ آپ دونوں کو تھوڑی بہت اذیت برداشت کرنی پڑے گی۔''

یہ بات سن کر ٹھاکر صاحب نے اس انداز میں قدرے ناک بھوں چڑھائی گویا میں نے ان کی صلاحیت پر شبہ کیا ہو کہ محل میں رہنے سے وہ رہائش کے معمولی حالات برداشت نہیں کرسکیں گے۔ ''اوہ نہیں۔ مجھے اس کی کوئی پریشانی نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آپ لوگوں کو بے آرامی ہوگی۔''

پشپا کے لیے تو بہرحال یہ ایک رومانوی مہم جوئی تھی اور وہ اپنی خیالی پرواز میں مشغول تھی۔ کہنے لگی: ''پاپا! گاؤں میں کیمپ کے اندر رہنا اور پھر جھیل پر جانا، کتنا مزہ آئے گا! پاپا، ہاں کر دیجیے نا، اگر آپ نے ہاں نہ کی تو میں آپ کو کبھی معاف نہ کروں گی۔''

اب کہنے کے لیے ٹھاکر صاحب کے پاس کیا رہ گیا تھا؟ لہٰذا سب کچھ طے ہوگیا اور مقررہ تاریخ کو ہم سب رانا گڑھ پہنچ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا، رانا گڑھ جھیل نال سرودر کے کناروں پر مخصوص قبائلی گاؤں تھا۔ وہاں کوئی دو سو گھر تھے جو سب کچی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھتوں سے بنے ہوئے تھے۔ بعض مکانوں کی چھتوں میں اینٹیں لگا کر انھیں غریب پڑوسیوں کے مکانوں کی چھتوں سے اُونچا کر دیا گیا تھا۔ ایسے اینٹ لگے مکانوں میں پرائمری اسکول اور بنیادی صحت کے ذیلی مرکز کی عمارات بھی تھیں۔

گاؤں میں ہمیں ٹھہرانے کے لیے کوئی چوکی یا ڈاک بنگلہ نہیں تھا، لہٰذا مقامی اہلکاروں نے صحت مرکز کی نیم تعمیر شدہ عمارت میں کچھ کرسیاں اور چارپائیاں ڈال کر اسے قابل رہائش بنا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اہلکار اور دیہاتی ہم لوگوں کا استقبال کرنے آئے تو مچھروں کو بھی ہم لوگوں کی آمد کی خبر مل گئی۔ وہ ایک جھنڈ کی شکل میں صحت مرکز کی عمارت پر منڈلاتے ہوئے اُتر آئے۔

میں نے جوناگڑھ اور ڈانگس کے جنگلات کے تجربوں کی روشنی میں مچھر بھگاؤ کریم کی وافر مقدار رکھ لی تھی لیکن ہماری پارٹی نے اس کا استعمال بھی اتنی فراخ دلی سے کیا کہ ختم ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوگیا۔ ٹھاکر صاحب تو بڑی سنجیدگی اور صبر وضبط کا مظاہرہ کررہے تھے لیکن پشپا کو جوں ہی کوئی مچھر کاٹتا وہ قلقاری مار کر شادمانی کا اظہار کرتی۔

میں تعجب کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی اذیت پسند تو نہیں؟ وہاں پدھر قبیلے کے لوگ اکٹھا ہوگئے تھے۔ وہ اور سرکاری اہلکار ہم لوگوں کے اردگرد کھڑے ان حملوں سے بچنے کے لیے طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے، بعض مفید اور بعض بس ایسے ہی۔ مچھروں کے ساتھ جنگ وجدل برپا تھی کہ شیام لال ڈرامائی طور پر نمودار ہوا۔ اس کا قد بدن اوسط درجے کا تھا۔ اپنے قبیلے کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا رنگ سیاہ نہیں بلکہ پختہ سانولا تھا۔ چمکدار چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی دوگہری نیلی آنکھیں تھیں جو شرارت، ذہانت اور شگفتگی سے بھرپور تھیں۔ قیاس کہتا ہے کہ اس کے آباؤاجداد میں سے کوئی شخص مخلوط نسل سے تعلق رکھتا ہوگا۔

شیام جوں ہی مرکز صحت کی عمارت میں داخل ہوا گردوپیش کے سارے معاملات اس نے خود سنبھال لیے جن میں ہماری پارٹی بھی شامل تھی۔ گلیوں کے جو چھوکرے وہاں اکٹھا ہوگئے تھے، ان سب کو اس نے چشم زدن میں رفو چکر کر دیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تماشا دیکھنے والے پدھروں کو اس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے نرمی کے ساتھ وہاں سے سرکا دیا۔ خدا جانے کہاں سے وہ کچھ مچھر دانیاں اٹھالایا اور قبل اس کے کہ میں یا ٹھاکر صاحب صحیح طور پر سمجھ پاتے کہ ہو کیا رہا تھا، اس نے رات کے کھانے کے لیے ہم لوگوں کی خواہش معلوم کرنی شروع کر دی۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ پشپا بھی جو حاضرین کی گفتگو اور مچھروں کی بھنبھناہٹ میں پورے زور شور سے دلچسپی لے رہی تھی، یکا یک خاموش ہو گئی۔

وہ شیام لال کو ایسی گہری نظروں سے دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگی جس سے مجھے اسی مرحلے پر احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ وہ لگاوٹ نہ پشپا کے لیے بہتر تھی اور نہ شیام کے لیے۔ ''اوہ انکل، کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں اس شخص کی۔'' اس نے مجھے دھیمے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیسا خوبصورت نوجوان ہے، کیا خیال ہے آپ کا، کیا یہ واقعی خوبصورت نہیں؟ کتنی شاندار وضع قطع ہے اس کی اور کتنے ہنرمندانہ انداز میں اس نے ان چھوکروں کو بھگایا ہے!''

''یقیناً۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دنیا سے الگ تھلگ اس چھوٹی سی جگہ پر ایک پدھر کا یہ حسن اور ذہانت اس کے حق سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس ماحول میں وہ ان خوبیوں کو استعمال کہاں کرے گا؟'' اس اثنا میں شیام میری بیوی سے رات کے کھانے کا مینو وغیرہ طے کر چکا تھا اور پھر بلا جھجک وہ مجھ سے مخاطب ہو گیا:

''جناب! آج شام کو آپ مرکز صحت اور پرائمری اسکول کا دورہ کرنے جائیں گے۔ ہم لوگوں نے وہاں کچھ کھیل تماشے کا انتظام بھی کیا ہے۔ آپ ہمارا لوک رقص دیکھیں گے اور خود بھی اس میں حصہ لیں گے۔ رقص کھانے کے بعد ہو گا لہٰذا آپ لوگ کھانا ذرا سویرے کھا لیں کیونکہ آپ لوگوں کو کل صبح بہت سویرے اُٹھنا بھی ہو گا۔'' ایک ہی سانس میں اس نے ہم لوگوں کو پورا پروگرام بتا دیا۔

''اور ہمیں اتنے سویرے کیوں اُٹھنا ہو گا؟'' پشپا نے پوچھا۔ وہ اب شیام کی خیرہ کن نیلی آنکھوں پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھی۔

''میں آپ لوگوں کو پرندے دکھانے جھیل پر لے جاؤں گا۔ کھلے پانی میں پہنچنے کے لیے ہمیں لمبے سرکنڈوں سے بھری کئی کلومیٹر لمبی نہر پار کرنا ہو گی۔ اکثر پرندے ان نہروں میں بسیرا کیے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ واقعی انھیں قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں تو سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچنا ہو گا۔ سورج نکلتے ہی یہ پرندے کھلے پانی میں مچھلیاں پکڑنے اپنے گھونسلوں سے اُڑ جائیں گے۔ اس کے بعد انھیں صرف دوربینوں سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ انھیں پکڑ کر آپ اپنے ہاتھوں میں نہیں لے سکتیں۔'' شیام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ! کیا ہم ان پرندوں کو واقعی اپنے ہاتھوں سے پکڑیں گے؟'' پشپا نے بڑے ہیجان انگیز لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، اگر آپ صبح بہت سویرے اُٹھ جائیں۔'' شیام نے جواب دیا۔

اس طرح پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہم لوگ مرکز صحت، پرائمری اسکول اور پھر پنچایت گھر گئے۔ جیسا کہ شیام نے انتظام کیا تھا، لوک رقص میں بھی شرکت کی۔ شیام نے پشپا کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ اس نے اسے قبائلی رقص کے بہت پیچیدہ قدم کی تربیت دی۔ وہ بڑی مستعد شاگرد ثابت ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس طرح ناچنے لگی کہ ان دونوں کے بازو ایک دوسرے کی کمر کے گرد لپٹے ہوئے تھے اور وہ ڈھول کی آواز کی مطابقت میں اپنے قدم اُٹھا رہے تھے۔

میں اس بات کا اعتراف ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ ناچتے ہوئے ان دونوں کی جوڑی بہت خوبصورت اور ہم پلہ معلوم ہوئی، لیکن ایک مبہم سا خوف مجھے بے چین کر رہا تھا۔ شیام کتنا ہی خوبصورت اور ذہین کیوں نہ ہو، بہرحال تھا تو وہ ایک غریب پدھر جبکہ پشپا شاہی خاندان کی وارث تھی۔ ان کا ملاپ دونوں میں کسی کے لیے نیک شگون نہ تھا۔

www.pakistanipoint.com

اگلی صبح ہم بہت سویرے اُٹھ گئے۔ چند سو گز پیدل چلنے کے بعد ہم دلدلی پانی کے کنارے پہنچے جہاں نصف درجن ڈونگیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ شیام نے اس موقع پر بھی مرکزِ صحت ہی سے پوری پارٹی کو اپنی تحویل میں لے لیا لیکن اس کی خاصی توجہ کا مرکز پشپا تھی۔ خود پشپا کی کیفیت بھی یہ تھی کہ وہ ہر معمولی یا غیر معمولی منظر کو دیکھتے ہی تعجب اور مسرت کی بچکانہ قلقاریاں مارنے لگتی۔ شیام اسے تمام باتیں بڑی دلچسپی کے ساتھ سمجھا رہا تھا۔

جب ہم سب کشتیوں میں بیٹھے تو دیکھا کہ میں، حسن آرا اور پشپا ایک کشتی میں تھے اور ظاہر ہے اُسے شیام چلا رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب، جو اپنی بیٹی کی ساری ہاؤ ہو بڑی شفقت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، ایک سرکاری افسر کے ساتھ ہمارے پیچھے دوسری کشتی میں تھے۔ ہم سرکنڈوں کی لمبی اور گھنی جھاڑیوں کو کاٹتے تنگ اور پیچ دار نہروں میں آگے بڑھتے رہے۔ اس جگہ کشتیاں چلانے کے لیے چپو استعمال نہیں ہوئے بلکہ انھیں لمبے بانس کی مدد سے دھکیل کر چلایا جا رہا تھا۔ ایک شخص کشتی کے کنارے پر کھڑے ہو کر بانس پانی میں ڈال کر اُسے آگے بڑھا رہا تھا۔

اگرچہ ہمارا یہ جلوس بہت کم آواز پیدا کر رہا تھا تاہم بسیرا کرنے والے بعض پرندے پریشان ہو رہے تھے۔ ہر چند منٹ بعد کوئی نہ کوئی بطخ یا مرغابی گھنی جھاڑیوں سے نکل پڑتی، کچھ دور نہر پر نیچی پرواز کرتی اور پھر تیز رفتاری کے ساتھ اُڑ جاتی۔ اگر کہیں نچلی پرواز کے لیے کسی پرندے کو کافی جگہ نہ ملتی تو وہ پانی میں ڈبکی مارتا اور چند گز کے بعد پھر نمودار ہو کر اُڑ جاتا۔ شیام نے جھاڑیوں کے درمیان میں ایک قدرے چوڑی جگہ اپنی ڈونگی روکی اور دوسری ڈونگیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا جو اس کے قریب آ گئیں۔ ساری کشتیاں ایک دوسرے کے ساتھ مثلث کی شکل میں جڑ گئیں۔ شیام نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''وہاں کوئی دو فٹ نیچے ایک بہت بڑی چڑیا چھپی ہوئی ہے۔''

''کہاں، کہاں؟'' پشپا نے ہیجان کے عالم میں پوچھا۔

''وہاں، نرکل کی جھاڑیوں میں۔'' شیام نے جھیل کی سطح کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ اندر ڈالا اور اسی رفتار سے ایک بہت بڑی بطخ پکڑے باہر نکال لیا۔ وہ بطخ پھڑ پھڑا کر بھاگ نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ پھڑ پھڑاتے ہوئے بدن سے جو پانی اُڑ رہا تھا اس نے ہمیں شرابور کر دیا۔ پشپا تو ہیجان کے عالم میں اس طرح اُچھل کود رہی تھی کہ بار بار پانی پر ڈولتی کشتی اُلٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ شیام نے بطخ کے پر ایک دوسرے سے لپیٹ دیے۔ اس طرح وہ اُڑنے سے قاصر ہو گئی۔ اس نے وہ بطخ پشپا کو دے دی جو کچھ دیر تک اس کے ساتھ قلقاریاں بھرتی رہی یہاں تک کہ ہم کھلے پانی میں پہنچ گئے اور پھر بطخ کو ہم نے آزاد کر دیا۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں دو فٹ نیچے ایک پرندہ موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پانی سے جو بلبلے اُٹھ رہے تھے، ان کی تعداد اور سطح پر پہنچنے کے بعد ان کے سائز سے، صاحب جی۔'' اس نے جواب دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ شخص تو بالکل شرلاک ہومز معلوم ہوتا ہے جو سیکڑوں قسم کے بلبلوں اور ان کے نیچے سانس لینے والے پرندوں پر مقالہ لکھ سکتا تھا۔

ہم نے جھیل کا چکر لگایا اور کئی قسم کی آبی چڑیاں پکڑیں، دُوربین سے دُور دُور کا نظارہ کیا اور جب سورج کافی اُونچا ہو گیا تو ہم رانا گڑھ واپس آ گئے۔

اگلی رات بھی ہم نے وہیں قیام کیا اور دوسرے روز گھر واپس آئے۔ یہ سارا واقعہ یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، وہ تو اب شروع ہوا تھا۔ پشپا اور شیام اس کے بعد بھی خفیہ طور پر ملتے رہے اور ایک دوسرے کی شدید

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محبت میں گرفتار ہو گئے۔ پشپا کا نوٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی اور شیام، خوبصورت پدھر جو مچھلیاں اور غیر قانونی طور پر موسمی پرندے پکڑ کر بیچ دیتا تھا اور اس طرح اپنی روزی کماتا۔ آخر کار یہ خبر ایک روز ٹھاکر صاحب کے کان تک بھی پہنچ گئی جس نے انھیں ہلا کر رکھ دیا اور ان کا امن و سکون رخصت ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب یوں تو خوش اخلاق اور معتدل مزاج انسان تھے لیکن یہ ان کی اکلوتی بیٹی کا معاملہ تھا جو انھیں بے وقوف بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ اب انھیں افسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے اب تک پشپا کے کھلنڈرے پن سے چشم پوشی کیوں برتی۔ انھوں نے طے کر لیا کہ اب وہ سختی سے کام لیں گے۔ چنانچہ پشپا کو محل میں پابند کر دیا گیا۔ شیام پدھر کو یہ خبر پہنچا دی گئی کہ اگر اسے اپنی جان عزیز ہے تو وہ صرف رانا گڑھ نہیں بلکہ گجرات کا صوبہ ہی چھوڑ دے۔ بے چارہ شیام اگرچہ پشپا سے بے انتہا محبت کرتا تھا لیکن اکثر لوگوں کی طرح اسے بھی اپنی جان زیادہ پیاری تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رانا گڑھ چھوڑ دے گا اور جھیل نال سرور کو بھول جائے گا۔

یہ واقعات پیش آنے سے قبل میرا اُس ضلع سے تبادلہ ہو چکا تھا۔ میں آپس میں پیار کرنے والے اس نوجوان جوڑے کے المیے سے ناواقف رہا۔

مجھے یہ ساری باتیں اس وقت یاد آئیں جب میں مسٹر شیام کمار سے ہاتھ ملا رہا تھا جو اب ریفلز امپورٹ کارپوریشن اور ساؤتھ بورینو ریبر ایکسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ لیکن یہ قلب ماہیت بڑی تعجب خیز تھی۔ میری آخری ملاقات ایک قبائلی نوجوان سے ہوئی تھی جو اگرچہ خوبصورت اور ذہین تھا لیکن بہر حال ایک غریب دیہاتی تھا جو غیر قانونی طور پر آبی پرندے اور کشتی میں جھیل سے مچھلیاں پکڑ کر زندگی گزارنے کا سامان مہیا کرتا تھا اور آج میری نظروں کے سامنے ایک چاق و چوبند اور رنگ سک سے درست آدمی کھڑا تھا جو خوبصورت اور ذہین ویسا ہی تھا لیکن اب وہ ایک دولت مند اور خوش پوشاک انسان بھی تھا۔

اس روز شام کو وہ مجھے سنگاپور کے ایک ریستوران میں لے گیا جہاں آپ شیشے کے ٹینک میں دیوار کی جانب ایک قطار میں تیرتی مچھلیوں اور کیکڑے پسند کے مطابق منتخب کر وہیں پکوا کے کھاتے ہیں۔

جب ہم لوگوں کی مچھلی تلی جا رہی تھی اور لابسٹر بھونے جا رہے تھے تو میں نے شیام سے پوچھا: ''گجرات چھوڑنے کے بعد تم پر کیا گزری؟''

''اوہ، وہ ایک خاصی لمبی کہانی ہے۔ میں بمبئی آ گیا اور وہاں ملازمت تلاش کی۔ چونکہ میں صرف مچھلیاں پکڑنے کا کام جانتا تھا لہٰذا بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ دن میں نے ایک ٹرالر پر کام کیا لیکن کھلے سمندر میں کام کرنے سے مجھے زیادہ خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے جھیل نال سرور کی پرسکون سطح، سرکنڈے کی لمبی ڈنڈیوں اور موسمی پرندوں کی یادیں ستا رہی تھیں۔ چنانچہ جوں ہی مجھے موقع ملا میں ایک بحری جہاز پر ملازم ہو کر رنگون آ گیا۔ رنگون میں بھی مجھے کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں دشواری ہوئی۔ اسی اثنا میں ہندوستان سے آئے ہوئے کچھ لوگوں سے میری دوستی ہو گئی۔''

''ہم پانچ آدمیوں نے ایک شراکت قائم کر لی اور اندرونِ ملک منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں ملائیشیا لوگوں کی ہمت افزائی کر رہا تھا کہ وہ خالی زمین پر ربڑ کے باغات لگائیں لہٰذا ہم لوگوں نے جھیل کنابالو کے کنارے ایک اچھا قطعۂ زمین لیا اور وہاں پٹے پر چند سو ایکڑ زمین حاصل کر کے ربڑ کے درخت لگوا دیے۔ ہمارے درخت تو بہت تیزی سے بڑھنے لگے لیکن وہ علاقہ مچھروں سے بھرا نکلا لہٰذا ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اس خوفناک بیماری یعنی ملیریا کا شکار ہوتے گئے اور اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ان لوگوں کو نہ بچا سکا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن بہر حال مجھ پر اس بیماری کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے ان لعنتی کیڑوں نے لاکھوں، کروڑوں مرتبہ کاٹا لیکن میرے درجۂ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حرارت میں کبھی ایک درجے کا بھی اضافہ نہ ہوا۔''

''بہرحال میں اس باغ کا واحد مالک رہ گیا جس کا نام اب ''سابرک'' ہے۔ مجھے اس باغ کے لیے کارکن رکھنے پڑے۔ حالات میں تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ میں سنگاپور منتقل ہوگیا اور ''ریفلز امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن'' قائم کرلی۔ اب میں اور میرے خاندان والے اپنا وقت باری باری سنگاپور اور اپنے بورنیو کے باغ میں گزارتے ہیں۔ اگر آپ یہاں اپنے قیام میں چند دنوں کا اضافہ کرلیں تو مجھے آپ کو وہاں لے جاکر بے انتہا خوشی ہوگی۔''

مجھے قدرت کے فیصلوں اور ان پُر پیچ طریقوں پر تعجب ہورہا تھا جن سے یہ فیصلے زیرِعمل آتے ہیں۔ ان ساتھیوں میں سے جنہوں نے باغ لگایا تھا، قدرت نے صرف شیام کو منتخب کیا کہ وہ زندہ بچ جائے۔ مجھے کچھ دنوں پہلے اخبارات میں چھپی ایک رپورٹ یاد آگئی جو ملیریا سے پدھروں کے محفوظ و مامون رہنے کے بارے میں مطالعاتی تحقیق پر مبنی تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ صدیوں سے اس بیماری کے سامنے رہ کر اس کا مقابلہ کرتے کرتے ان کے خلیاتِ خون اب ملیریا کے جراثیم سے متاثر نہیں ہوتے۔

''اور پشپا کا کیا بنا؟'' مجھے اس کے بارے میں جاننے کی بے چینی بھی تھی۔ ''کیا اس کی خیر خبر لینے تم پھر کبھی گجرات گئے؟''

''جی ہاں، میں ایک مرتبہ گجرات گیا تھا، لیکن وہ دوسری کہانی ہے۔ اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ فی الحال تو میں اپنے بیوی بچوں سے ملانے آپ کو اپنے گھر لے جارہا ہوں۔ میں نے آپ کو وہاں لے جانے کا ان لوگوں سے وعدہ لیا ہوا ہے کیونکہ کل میری بیوی ہی آپ کو خریداری کروانے لے جائے گی۔ میرے کچھ دوسرے پروگرام ہیں جن میں میں بری طرح مشغول ہوں۔''

ہم گاڑی کے ذریعہ شیام کے محل نما بنگلے پر پہنچ گئے۔ دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک کم عمر لڑکے نے آکر دروازہ کھولا۔ یہ بالکل شیام کا بچپن تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اس نے جوں ہی مجھے دیکھا، دوڑ کر میرے بازوؤں سے لپٹ گئی اور بولی:

''اوہ انکل! آپ کو برسوں کے بعد دیکھ کر مجھے ناقابل بیان خوشی ہورہی ہے۔ آپ میں تو ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی۔ دیکھنے کا وہی سنجیدہ انداز، چہرے پر وہی تیوریاں۔ مجھے آپ کی وہ تیوری یاد ہے جب میں اور شیام رانا گڑھ کے چوک میں ناچ رہے تھے۔'' اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہا۔

میں نے اس کے کاندھے پکڑ کر اسے علیحدہ کیا اور اسے دیکھنے لگا۔ یہ اس روز کی دوسری حیرت تھی جس سے میں دوچار ہوا۔ یہ تو پشپا تھی جو اب تیس سال سے کچھ اوپر کی ایک مکمل حسینہ بن چکی تھی۔ اپنے چہرے پر استعجاب کا وہی اظہار لیے میں شیام کی طرف مڑا اور اس سے کہا:

''اب مجھے بتاؤ نا، آخر یہ معجزہ کیا ہے؟ یہ سب کیسے ہوا اور تم نے مجھے ریستوران میں یہ بات کیوں نہیں بتائی؟''

''اوہ، میں آپ کو ذرا حیرت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ پشپا تو میرے ساتھ ہوائی اڈے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ میں وہ مسرت انگیز حیرت دیکھنا چاہتا تھا جو یہاں پشپا کو دیکھ کر آپ کے چہرے پر آئی۔''

☆☆☆

ٹھاکر صاحب نے تو پشپا کی شادی باضابطہ طور پر ایک نوجوان راجپوت سے کردی تھی جو ایئر انڈیا میں بڑا افسر تھا لیکن یہ شادی کامیاب نہ ہوئی۔ اس شخص کے تعلقات پہلے ہی سے ایک ایئر ہوسٹس کے ساتھ تھے لہٰذا وہ پشپا کو نظر انداز کرتا رہا۔ آخر کار وہ شادی علیحدگی پر ختم ہوئی۔ اس اثنا میں ٹھاکر صاحب مرگئے اور پشپا محل میں اکیلی رہ گئی۔ تب شیام سے اس حالت میں پشپا کی دوبارہ ملاقات ہوئی کہ وہ کروڑ پتی بن کر ملائیشیا سے واپس گیا تھا۔ یوں ان کی زندگی نئے سرے سے شروع ہوگئی۔ سچ ہے کہ قدرت نے شیام کی قسمت میں پشپا ہی لکھی تھی۔ ◆◆◆

www.pakistanipoint.com

عاصم محمود

دنیائے اسلام کے بطلِ جلیل

مسلم مورخین نے لکھا ہے کہ زریاب نے نئی قسم کی مٹھائی ایجاد کی تھی۔ وہ آج ہندوستان میں ''جلیبی'' کہلاتی ہے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان، سبھی یہ منفرد مٹھائی شوق سے تناول کرتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے ایک مسلمان موجد کو دعا دیجیے کہ انھوں نے کیسی عمدہ مٹھائی آپ کے لیے تیار کی۔ عربی میں اس کو ''زلابیہ'' کہتے ہیں۔

یہی نہیں، ہمارے بازاروں میں ''گچک'' بھی خصوصاً موسم سرما میں خوب بکتی ہے۔ اس کو ''پت'' بھی کہتے ہیں۔ یہ اشیا گڑ سے تیار ہوتی ہیں۔ زریاب پہلے ماہر طباخ ہیں جنھوں نے گچک بنائی اور انسان کو نئے ذائقے سے آشنا کرایا۔

زریاب کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کی اولاد نے بھی فنون لطیفہ میں نام کمایا۔ ابوالحسن علی بن نافع المعروف بہ زریاب 789ء میں پیدا ہوئے اور 857ء میں چل بسے۔ انھوں نے سڑسٹھ، اڑسٹھ برس کی عمر پائی۔ لیکن اس عرصے میں وہ ایسے محیر العقول کارنامے انجام دے گئے کہ آج بھی دنیا انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مشہور مسلم مورخ، المقری اپنی کتاب ''نفح الطیب'' میں لکھتا ہے:

''زریاب کی زندگی میں اس جیسا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بعد ایسا کوئی آیا جسے اس جیسی قدر و منزلت اور بے انتہا محبت ملی ہو۔''

زریاب سے قبل دنیائے اسلام کے ایک اور نابغہ روزگار، عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی بھی اپنی تحقیقات سے اہل مغرب کا دامن مالا مال کر چکے تھے۔ آپ خوارزم سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ مورخین نے پیدائش کا سن 780ء لکھا ہے۔

تاہم وہ عباسی خلیفہ، المامون کے زمانے میں بغداد میں رہے۔ خلیفہ المامون نے آپ کا خوب اکرام کیا۔ خوارزمی ''بیت الحکمہ'' سے منسلک ہو کر معتبر سائنسدانوں اور علما میں شمار ہوئے۔ بیت الحکمت نویں صدی میں بغداد میں دانشوروں کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ ریاضی اور فلکیات میں شہرت

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

نامور مسلم ماہرین کا ذکر خیر جن کی دریافتوں نے اہل مغرب کا دامن مالا مال کر دیا

پائر ابھرے۔ آپ کی وفات 850ء میں ہوئی۔ الخوارزمی نے بہت ساری اہم تصانیف چھوڑیں جن میں کچھ اہم یہ ہیں:

الزیج الاول، الزیج الثانی جو ''السند ہند'' کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب الرخامہ، کتاب العمل بالاسطرلاب، اور مشہورِ زمانہ ''کتاب الجبر والمقابلہ'' جسے انھوں نے لوگوں کے روزمرہ ضروریات اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا جیسے میراث، وصیت، تقسیم، تجارت، خرید وفروخت، کرنسی کا تبادلہ (ایکسچینج)، کرایہ، عملی طور پر زمین کا قیاس (ناپ)، دائرہ اور دائرہ کے قطر (diameter) کا قیاس، بعض دیگر اجسام کا حساب جیسے ثلاثی، رباعی اور مخروط ہرم وغیرہ۔ آپ پہلے سائنسدان تھے جنھوں نے علمِ حساب اور علمِ جبر (الجبرا) کو الگ الگ پیش کیا۔ جبر کو علمی اور منطقی انداز دے کر شہرت کمائی۔

موسیٰ خوارزمی نہ صرف عرب کے نمایاں سائنس دانوں میں شامل ہیں بلکہ آج ان کا شمار دنیا کے اہم ترین ماہرین ریاضی میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف جدید الجبرا کی بنیاد رکھی، بلکہ علمِ فلکیات میں بھی اہم دریافتیں کیں۔ ان کی بنائی زیچ (جنتری) طویل عرصے تک مغربی فلکیات دانوں کے کام آتی رہی۔ سچ یہ ہے کہ ریاضیاتی علوم میں یورپ کبھی ترقی نہ کرپاتا اگر اس کے ریاضی دان خوارزمی سے نقل نہ کرتے۔ آپ کے بغیر آج کے زمانے کی تہذیب، تمدن اور ترقی بہت زیادہ تاخیر کا شکار ہوجاتی۔

مثال کے طور پر ''الگورتھم'' (Algorithm) کی اصطلاح ہی کو لیجیے۔ دیکھنے یا سننے سے لگتا ہے، یہ کوئی جدید اصطلاح ہے لیکن اصل میں یہ لفظ لگ بھگ دوسو سال پرانا ہے۔ یہ لفظ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی کے نام سے ہی نکلا۔ ہوا یہ کہ برطانیہ سے تعلق رکھنے والا ایک دانشور، رابرٹ آف چیسٹر طویل عرصہ اندلس میں قیام پذیر رہا۔ اس دوران وہ عربی خوب اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگا۔ اس نے پھر 1145ء میں خوارزمی کی کتاب، الجبر والمقابلہ کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب مغربی سائنس دانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اور سولہویں صدی تک یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی۔

اسی کتاب نے مغرب کو ہندو عربی اعداد سے روشناس کرایا اور بالآخر انھیں رومن اعداد کو تبدیل کردیا۔ اعشاریہ اور ہندو عربی نمبروں کے نظام کو خوارزمی نے اپنی کتاب میں دنیا میں استعمال کیے جانے والے نمبروں کی بنیاد بتایا ہے۔ آج یہ نظام یہاں تک پیش گوئی کرسکتا ہے کہ ہم نے کیسے ووٹ دینا اور کس طرح پیار میں مبتلا ہونا ہے۔ الگورتھم ہی اس نظام کی بنیاد ہے۔ یہ چھوٹا سا لفظ جو قرونِ وسطیٰ میں دنیائے اسلام میں ایجاد ہوا، آہستہ آہستہ انسانوں کی زندگیاں بدلنے لگا۔

الخوارزمی کا نام جب ان کی کتاب پر لاطینی زبان میں لکھا گیا تو وہ ''الگورتھمی'' بن گیا۔ اس کے بعد الگورتھم کا لفظ ریاضی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ لفظ ''الجبرا'' کا ماخذ بھی الخوارزمی کی کتاب 'الجبر' کا عنوان ہے۔ اس کتاب میں الجبرے کے بنیادی اصول اور مسائل حل کرنے کے طریقے متعارف کرائے گئے تھے۔ ان کتابوں نے مغرب میں علمِ ریاضی میں انقلاب برپا کردیا۔ الخوارزمی نے بتایا کہ کس طرح پیچیدہ مسئلوں کو سادہ حصوں میں توڑ کر انھیں حل کرنا ممکن ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں الگورزمس کا مطلب اعشاریہ کے نمبروں کا نظام تھا۔ تیرہویں صدی تک وہ انگریزی زبان میں استعمال کیا جانے لگا اور اسے چاسر جیسے مصنفوں نے بھی استعمال کیا۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں الگورتھم کو ایک مسئلہ حل کرنے کی خاطر قدم بہ قدم اصولوں کا جامع طریقہ بتایا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سائنسدان اور کمپیوٹر کے ماہر، ایلن ٹیورنگ نے تحقیق کی کہ کس طرح نظریے (تھیوری) کے مطابق کوئی مشین الگورتھم کی ہدایات

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پر عمل درآمد کرتے ہوئے پیچیدہ ریاضی کے مسائل حل کرتی ہے۔ یہ کمپیوٹر کے زمانے کا آغاز تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران انھوں نے ایک مشین ایجاد کرلی جس کا نام انھوں نے 'بومب' رکھا۔ یہ مشین الگورتھم کے استعمال سے 'انیگما کوڈ' کھولنے کی کوشش کرتی تھی۔

آج کل الگورتھم کی اصطلاح زبانِ زدعام ہے۔ اگرچہ کئی مرتبہ عام لوگوں کو پوری طرح معلوم نہیں ہوتا کہ الگورتھم کرتا کیا ہے۔ مگر الگورتھم ہر جگہ ہیں۔ وہ ہمیں اے کے مقام سے بی تک لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ انٹرنیٹ کی سرچز اور ہمارے لیے چیزیں خریدنے، دیکھنے اور شیئر کرنے میں تجاویز دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے مسئلوں کو سادہ طریقے سے حل کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ الخوارزمی دنیا کے وہ بڑے ریاضی دان اور فلسفی ہیں جنھوں نے ہندوستان، عرب اور مغرب کو ایک تکون کی طرح علمِ ریاضی میں ملادیا۔

جابر بن حیان

اسلامی دنیا میں جابر بن حیان کو پہلے سکہ بند سائنس دان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ خاص طور پہ کہا جاتا ہے کہ علم کیمیا میں ان کا مقام وہی ہے جو ارسطو کا منطق میں ہے۔ جابر نے علم کیمیا میں جدید اسلوب استعمال کر کے نئے علوم میں اضافہ کردیا۔ جابر کی ولادت اور رحلت کی تاریخ واضح نہیں۔ بہرحال آپ کا زمانہ 715ء سے لے کر 815ء تک کا بتایا جاتا ہے۔ جابر کی جائے ولادت اور وہ جگہ جہاں انھوں نے بچپن گزارا، بھی معین نہیں۔ بعض ان کو کوفی اور بعض خراسانی سمجھتے ہیں۔ ابن ندیم کہتے ہے کہ جابر خراسانی تھے۔ ویل دورانت لکھتے ہیں، جابر کوفہ کے کسی دواساز کے بیٹے تھے۔ طبابت میں مشغول رہتے اور اپنے اوقات تجربہ گاہ میں گزارتے۔

جابر بن حیان تقریباً تین ہزار نو سو کے لگ بھگ تصنیفات کے مالک ہیں۔ جابر کی کتابوں میں سے کتاب الجمع، کتاب الاستتمام، کتاب الاستیفاد، وکتاب التکلیس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ مغربی مفکرین ان سے استفادہ کرتے رہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی توجہ الکیمی یعنی مصنوعی سونا بنانے کی طرف تھی۔ تاہم حقیقت بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں کیمیاءگری محض سونا بنانے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ادویہ سازی، معدنیات، ارضیات اور دفاعی صنعتوں میں علم کیمیا استعمال ہوتا رہا ہوتی تھی۔ اس لیے مسلمان کیمیا دان زیادہ تر زور عموماً علم کیمیاء پردیتے تھے۔

جابر بن حیان تجربی کیمیا کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کیمیا کے تمام تجرباتی اعمال سے واقف تھے۔ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں: "کیمیا میں سب سے زیادہ ضروری شے تجربہ ہے۔ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہ رکھے، وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ پس اگر کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں پر انحصار کرو اور صرف اس علم کو صحیح جانو جو تجربے سے سچ ہوجائے۔ ایک کیمیادان کی عظمت اس بات میں نہیں کہ اس نے کیا پڑھا بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا کچھ تجربے سے ثابت کیا۔"

جابر نے علم حاصل کرنے کے دوران اردگرد کے لوگوں کو سونا بنانے کے جنون میں مبتلا دیکھا تو خود بھی یہ روش اپنالی۔ کافی تجربات کے بعد بھی وہ سونا تیار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ لیکن کیمیا میں حقیقی دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے تجربات کا سلسلہ ختم نہ کیا۔ شہر کوفہ میں اپنی تجربہ گاہ تعمیر کرلی۔ ایک بار خلیفہ ہارون رشید کے وزیر یحییٰ برمکی کی چہیتی بیوی شدید بیمار ہوئی۔ بہتیرے علاج کے بعد بھی شفا نہ ہوئی۔ جب یحییٰ اس کی زندگی سے مایوس ہوگیا تو ایک حکیم سے رجوع کیا۔ حکیم نے صرف ایک دوا "دوگرین" تین اونس "شہد" میں ملا کر ایک گھونٹ پلائی۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں مریضہ پہلے کی طرح صحتیاب ہوگئی۔ یہ دیکھ کر یحییٰ برمکی اس حکیم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے گرویدہ ہوگئے۔ یہ حکیم جابر بن حیان ہی تھے جن کی بیانیہ مہارت نے حاکم وقت کے دل میں گھر کر لیا۔

ابن حیان ہمہ وقت کسی نہ کسی سوچ اور تجربے میں منہمک رہتے تھے۔ سونا بنانے کی لگن میں انھوں نے بے شمار حقائق دریافت کیے اور متعدد ایجادات کیں۔ مثال کے طور پہ انھوں نے اپنے علمِ کیمیا کی بنیاد اس نظریے پر رکھی کہ تمام دھاتوں کے اجزائے ترکیبی ''گندھک'' اور ''پارہ'' ہیں۔ مختلف حالتوں اور تناسب میں ان دھاتوں کے اجزائے ترکیبی ملنے سے دیگر دھاتیں بن سکتی ہیں۔ ان کے خیال میں دھاتوں میں فرق کی بنیاد اجزائے ترکیبی نہیں بلکہ ان کی حالت اور تناسب تھا۔ لہٰذا معمولی اور سستی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا ممکن تھا۔

جابر بن حیان ''قرع الانبیق'' نامی ایک آلے کے بھی موجد ہیں جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں کیمیائی مادے پکائے جاتے۔ اس مرکب سے اٹھنے والے بخارات آلے کے دوسرے حصے میں پہنچ کر ٹھنڈے کر لیے جاتے۔ یوں وہ بخارات دوبارہ مائع حالت اختیار کر لیتے۔ کشیدگی کا یہ عمل کرنے کے لیے آج بھی اسی قسم کا آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو ''ریٹورٹ (Retort)'' کہتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی تجربے کے دوران ''قرع الانبیق'' میں بھورے رنگ کے بخارات اٹھے اور آلے کے دوسرے حصہ میں جمع ہو گئے جو تانبے کا بنا ہوا تھا۔ حاصل شدہ مادہ اس قدر تیز تھا کہ دھات گل گئی۔ جابر نے مادے کو چاندی کے کٹورے میں ڈالا تو اس میں بھی سوراخ ہو گئے۔ چمڑے کی تھیلی میں ڈالنے پر بھی یہی نتیجہ نکلا۔ جابر نے مائع کو انگلی سے چھوا تو وہ بھی جل گئی۔ اس کاٹ دار اور جلانے کی خصوصیت رکھنے والے مائع کو انھوں نے ''تیزاب'' کا نام دیا۔ اسی مادے کو آج ہم ''تیزاب'' کہتے ہیں۔ جابر نے جب اس تیزاب کو دیگر متعدد دھاتوں پر آزمایا تو سونے اور شیشے کے علاوہ سب گل گئیں۔

جابر ابن حیان پہلے سائنس داں ہیں جنھوں نے مادوں کی تین حصوں میں درجہ بندی کی یعنی نباتات، حیوانات اور معدنیات۔ بعد ازاں معدنیات کو بھی تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ پہلے گروہ میں بخارات بن جانے والی اشیاء رکھیں اور انھیں ''روح'' یا ''عرق'' کا نام دیا۔ دوسرے گروہ میں آگ پر پگھلنے والی اشیاء مثلاً دھاتیں شامل کیں۔ تیسرے گروہ میں ایسی اشیاء جو گرم کرنے پر پھٹک جائیں اور سرمہ بن سکتی تھی۔ پہلے گروہ میں گندھک، سنکھیا، پارہ، کافور اور نوشادر شامل ہیں۔ عربی میں نوشادر (امونیم کلورائیڈ) کا نام پہلی بار جابر کی تصنیفات میں دیکھا گیا۔

ابن حیان کا یہ نظریہ کہ زمین پر وجود میں آنے والی اشیاء ستاروں اور سیاروں کے اثر کا نتیجہ ہیں، آج بھی نیا اور اچھوتا ہے۔ جابر نے کئی کیمیائی مرکبات مثلاً بنیادی لیڈ کاربونیٹ، آرسینگ سلفائیڈ اور اینٹیمینس سلفائیڈ اور الکحل کو تجربات کے ذریعے خالص بنایا۔ یہ جابر ہی ہیں جنھوں نے شورے کے تیزاب (نائیٹرک ایسڈ)، نمک کے تیزاب (کلورک ایسڈ) اور فاسفورس سے دنیا کو پہلی بار روشناس کرایا۔ انھوں نے دو عملی دریافتیں بھی کیں...... ایک تو تکلیس کشتہ کرنا یعنی آکسائیڈ بنانا اور دوسرا تحلیل یعنی حل کرنا۔ کیمیاء کے فنی استعمالات پر ان کے تجربات اور دریافتیں بہت اہم ہیں۔ مثلاً فلزات کی صفائی، فولاد کی تیاری، پارچہ بافی اور جلد کی رنگائی، وارنش کے ذریعے کپڑے کو ضد آب بنانا، لوہے کو زنگ لگنے سے محفوظ رکھنا، شیشے کو مینگانیز ڈائی آکسائیڈ سے رنگین بنانا، آئرن پائرٹ سے سونے پر لکھنا اور سرمے سے ایسٹک ایسڈ بنانا وغیرہ۔ امریکا کے ممتاز سائنسدان، پروفیسر فلپ جابر ابن حیان کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں: ''کیمیاء گری میں نہایت انہاک سے کام کرنے کے سبب جابر نے اپنی آنکھیں خراب کر لیں۔ لیکن اسی طرح اس حکیم اور عظیم دانشور نے کئی چیزیں ایجاد بھی کیں اور اصل کیمیا کی بنیاد رکھی۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محبت اس کو کہتے ہیں!

ترجمہ: ابوالفرح ہمایوں

نفرت سے میری کے چہرے کے عضلات بگڑ گئے اور بے ساختہ وہ چیخ اٹھی: ''اس آدمی کی شکل دیکھنا بھی گناہ ہے۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' اُس کی سہیلی ایلسی نے گھبرا کر پوچھا۔

میری نے اسٹاف ٹیبل کی ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک دراز قد نوجوان جس کے بال بالکل سیدھے انداز میں سجے ہوئے تھے، وہاں بیٹھا تھا۔ اُس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ کچھ زرد اور بیمار سا نظر آرہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

''یہ شخص پچھلے ہی ہفتے ہماری کمپنی کے اکاؤنٹ سیکشن میں آیا ہے۔'' ایلسی اُلجھے اُلجھے انداز میں بتانے لگی۔ ''اس کا نام تھامپسن ہے، مگر اُس سے کیا غلطی ہوئی جو تم اس قدر ناراض نظر آرہی ہو؟''

''ذرا اس کی حرکتیں دیکھو!'' میری کو پھر غصہ آ گیا۔ ''میں گزشتہ دو دنوں سے برابر اُسے جانچ رہی ہوں۔''

تھامپسن نے نمک کی بوتل اُٹھائی اور انتہائی بے ہودگی سے تمام نمک قیمے کی پلیٹ پر اُلٹ دیا۔ اس کے بعد کالی مرچ کے ڈبے کا بھی یہی حشر کیا اور پھر سرکے کی بوتل بھی خالی کر دی۔ ٹماٹر ساس بھی انڈیل دیا۔ یہاں تک کہ اُس کی پلیٹ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عجب مخمصے میں گرفتار ایک شوہر کا دل نواز فسانہ

ابن صفی نے چوری کا سراغ لگایا

ایک بار ابنِ صفی سے پوچھا گیا کہ انھوں نے اتنے جاسوسی ناول لکھے ہیں، کبھی خود بھی جاسوسی کی؟ انھوں نے بتایا کہ ایک بار ان کے گھر میں چوری ہوگئی۔ چور گھر کا سارا قیمتی سامان چرا کر لے گئے۔ انھوں نے تھانے میں رپورٹ لکھوادی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ انھوں نے خود سراغ لگانے کی کوشش کی۔ انھوں نے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا کہ کوئی ایسی چیز ہاتھ لگے جس سے سراغ لگایا جاسکے۔ تلاشی کے دوران انھیں گھر کی ڈیوڑھی سے لانڈری کی ایک رسید ملی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ ایک سرا ہاتھ لگ گیا۔ ابنِ صفی نے اسے خاموشی سے اٹھالیا اور جا کر پولیس اسٹیشن میں جمع کرادیا اور یہ شک ظاہر کیا کہ چور کی جیب سے یہ رسید گری ہے۔ پولیس نے اپنے آدمیوں کو متعلقہ لانڈری پر کھڑا کردیا کہ جب بھی وہ شخص اپنے کپڑے لینے آئے، تو اسے گرفتار کرلیا جائے۔ ابن صفی رسید پر پڑی تاریخ کو پولیس اسٹیشن میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس ان کے بہنوئی کو گرفتار کر کے لے آئی اور انھیں بتایا کہ یہ رسید کے کپڑے لینے آئے تھے۔ ابن صفی بہت شرمندہ ہوئے۔ انھوں نے بہنوئی سے معافی مانگی اور یہ تہیہ کرلیا کہ آئندہ جاسوسی نہیں کریں گے اور صرف جاسوسی ناول ہی لکھیں گے۔

(شکیل صدیقی کی کتاب "ابنِ صفی" سے ماخوذ)

ایک خون آلود تالاب کا منظر پیش کرنے لگی۔

''ہونہہ!'' ایلسی کے منہ سے بے ساختہ نکلا: ''اب تمہاری ناراضی کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ وہ اس ملغوبے کو شاید کھا نہیں سکے گا۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' میری نے گردن ایک جھٹکے سے اُٹھائی۔ ''آؤ! اب ہم چپ چاپ اپنا کھانا کھائیں۔ خواہ مخواہ اس کو دیکھ دیکھ کر جی جلانے سے کیا فائدہ؟''

''کیا تمہارے خیال میں وہ کوئی غیر ملکی ہے؟'' ایلسی نے اچانک سوال کیا۔ ''دیگر ممالک کے لوگوں میں نہ جانے کیا کیا انداز اور طریقۂ کار بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب اسپین میں ہمیں ایک آکٹوپس سے واسطہ پڑا تھا۔ میری ماں امریکیوں کے بارے میں مجھے بتا رہی تھی کہ یہ لوگ جنگ کے زمانے میں یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ وہ لوگ گوشت پر اسٹرابیری کا جام لگا کر کھاتے تھے۔''

''ہاں میری! کچھ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔'' ایلسی نے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک آدمی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ٹوٹے شیشے کی کرچیاں چبا کر کھا جاتا تھا۔ بلیڈ بھی ثابت حالت میں نگل جاتا۔ یہ کرتب میں نے ایک میلے میں دیکھا تھا۔ وہ آدمی زیپو کے نام سے مشہور تھا جس کے معنی ہیں، انسانی شتر مرغ۔ یہ آدمی تھا مپسن بھی اُسی نسل کا لگتا ہے۔''

☆☆☆

شام کے وقت میری ایک دوسری سہیلی جون کے پاس چلی گئی جو تھامپسن کے ساتھ ہی اکاؤنٹس میں کام کرتی تھی۔ سلام دعا کے بعد اس سے پوچھا: ''یہ نیا آدمی اپنے کام میں کیسا ہے؟''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''تم مسٹر تھامپسن کی بات کر رہی ہو؟'' جون نے کہا۔

''ٹھیک ٹھاک اور صاف ستھرا آدمی ہے۔ اپنے کام میں بھی ہوشیار ہے۔ مجھے تو اُس کے ساتھ کام کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

میری نے ناک بھوں چڑھا کر کہا: ''مجھے تو یہ بالکل پسند نہیں آیا۔''

''مگر کیوں؟ کیا تم اُس میں دلچسپی لے رہی ہو؟'' جون نے پوچھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میری نے خفگی سے کہا۔

جون نے ہنکارا بھرا: ''کچھ تو دال میں کالا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' میری چلائی۔ ''تم جانتی ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔''

''اوہ۔ میں تو بس مذاق کر رہی تھی۔'' جون نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی شادی شدہ ہے اور میرے خیال میں اپنی بیوی سے خوش ہے۔''

''مگر تم اتنا کچھ اس کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟'' میری نے سوال کیا۔

''ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی خاص عادت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر بھی کوئی ایسی بات ہو۔ مجھے تو جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' جون نے صفائی پیش کی۔

دوسرے دن جب وہ سب کینٹین کے کاؤنٹر پر قطار میں کھڑی تھیں تب میری نے ایلسی سے کہا۔ ''میں ذرا تھامپسن کے ساتھ بیٹھوں گی۔ اگر چاہو تو تم بھی آ جاؤ۔''

''نہیں! مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔'' ایلسی نے منہ بنایا۔

میری تھامپسن کے مقابل بیٹھ گئی اور ایک ٹک اُس کی طرف دیکھنے لگی جو گائے کی دم کے شوربے میں پنیر اور لیموں کے ٹکڑوں کی آمیزش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سیب چھیل چھیل کر ملغوبے میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابھی وہ ٹماٹو ساس کی بوتل بھی اس پر اُلٹنے ہی والا تھا کہ اس نے میری کو اپنی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے محسوس کیا۔ میری اچانک اُچھل پڑی اور ایسا ہی ردعمل تھامپسن کی طرف سے بھی ہوا۔

''کیا تم اس قدر گندے انداز میں کھانے سے کوئی خاص لذت محسوس کرتے ہو؟'' میری نے ماتھا سکیڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ مجھے تو خود یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ واقعی یہ ایک احمقانہ حرکت ہے۔'' تھامپسن نے بڑی سادگی سے کہا۔

''تب پھر اس حرکت سے تمہیں کیا مزہ ملتا ہے؟'' میری نے پوچھا۔

تھامپسن اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں کہنے لگا: ''میری بیوی بہت نفیس، خوبصورت اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ مجھے اُس پر بہت پیار آتا ہے اور میں اس سے شدید محبت کرتا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اُس کو کھانا پکانا بالکل نہیں آتا۔ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہے کہ اچھا پکائے مگر جب بھی وہ اس کام میں ہاتھ ڈالے تو کچھ کا کچھ بن جاتا ہے اور ایک نئی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے۔''

''مگر اس بات کا تمہارے اس طریقۂ کار سے کیا تعلق ہے؟'' میری نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں اُسے پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا یہاں نئے نئے تجربات کر کے اپنے لیے ایسا خراب اور غلیظ کھانا بناتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں بیوی کا بنایا ہوا کھانا غنیمت معلوم ہو۔ پھر میں اُس کو خوشی خوشی ہضم کر لیتا ہوں۔''

تھامپسن اس قدر معصومانہ اور محبت بھرے انداز میں اپنے دل کی بات کہہ رہا تھا کہ میری کو اُس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

''سچی محبت یہی ہوتی ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔'' میری نے ایک نظر تھامپسن پر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اپنی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کو پونچھا اور اُٹھ کر اپنی سہیلیوں کے درمیان آ بیٹھی۔ ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پیر علی راشدی نے جب جعلی اپوزیشن کا ڈراما رچایا

اختر بلوچ

پاکستان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں دو لفظوں سے خصوصاً آشنائی ہوتی ہے: سیاست اور سازش۔ جو لوگ سیاست کرتے تھے، وہ اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی کارروائی کو سازش قرار دیتے رہے۔ جن لوگوں کو وہ سازش کا مورد الزام ٹھہراتے، ان کا دعویٰ یہ رہا کہ سیاست دانوں کی بد دیانتیوں، بداعمالیوں، اقربا پروریوں اور ذاتی پسند و ناپسند کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ سیاست دانوں کو دیس نکالا دینا پڑا۔

اسی حوالے سے ایک ایسا کردار بھی ہے جس نے پاکستانی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا اور سیاسی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ دان انھیں کس حوالے سے یاد کرتے ہیں اور یہ بھی کہ سیاست اور سازش مورخین کی زبانی بیان کی جاسکے۔ پیر علی محمد راشدی سندھ کی سیاسی تاریخ کا ایسا کردار ہے جو ہر دور میں انمول رہے۔ وجہ ان کی اصولی سیاست نہیں بلکہ تقسیمِ ہند سے قبل اور اس کے بعد انگریزوں سمیت مسلمان حکمرانوں، خواہ وہ آمر ہوں یا جمہوریت پسند، کو دیے جانے والے ایسے مشورے تھے جن کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دے سکتے تھے۔

تقسیمِ ہند سے قبل پیر پگاڑا کے والد، سورھیہ بادشاہ (سید صبغت اللہ شاہ راشدی) کو انگریزوں سے سزائے موت دلوانے میں بھی انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ انگریز سے اس وفاداری کا مقصد ان سے محبت نہیں تھی، بلکہ ان کی نظریں پیر پگاڑا کی گدی پر تھیں۔ پیر پگاڑا کے پُرمزاح لہجے میں سیاسی انکشافات پر مبنی کتاب ''باتیں پیر پگاڑا کی'' کو معروف صحافیوں الیاس شاکر اور مختار عاقل نے مرتب کر کے جنوری 1992ء میں شائع کیا۔ کتاب میں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قومی سیاست کے ایک انوکھے اور یادگار کردار کی حیرت انگیز داستان

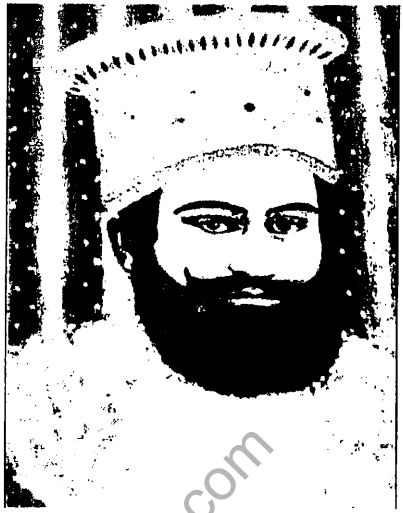

سیّد صبغت اللہ شاہ راشدی

طبع ایک انٹرویو میں شاہ مردان شاہ راشدی (پیر صاحب پگاڑا) نے اپنے والد سیّد صبغت اللہ شاہ راشدی (سورھیہ بادشاہ) کی سزائے موت میں علی محمد راشدی کے کردار کو یوں بیان کیا:

س: وہ کون صاحب تھے جنہیں انگریزوں نے اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا؟

ج: کیا اس کا نام بتانا ضروری ہے؟ اتنا کافی نہیں کہ وہ صاحب اور ان کے آقا اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

س: تاریخ درست رکھنے کے لیے ان کا نام اور دیگر متعلقہ واقعات ریکارڈ پر لانا ضروری ہیں۔ آپ خود بھی اس سے پیشتر تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے۔

ج: تو سن لیجیے وہ پیر علی محمد راشدی تھے جو چوتھی پشت میں ہمارے خاندان میں آ ملتے ہیں۔ انگریز نے پیر صاحب شہید کے خلاف مقدمے میں ان سے بہت کام لیا تھا۔ انھیں انگلش سرکار نے سرکاری گواہوں کے بیانات تیار کرنے اور انھیں مقدمے کے لیے تربیت دینے پر لگایا تھا۔ پیر علی محمد راشدی گواہوں کے بیانات پہلے خود سنتے، پھر فائنل پرفارمنس کے لیے عدالت بھیج دیتے۔ ہمارے والد کے وکیل نے ہمیں ان تمام واقعات سے آگاہ کیا کہ کیسے پیر علی محمد راشدی نے انگریزوں کی منشا کے مطابق گواہیاں بھگتائیں۔ انگریز اس خدمت کے صلے میں انھیں پیر پگاڑا کی گدی بخش دینا چاہتا تھا اور علی محمد راشدی کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن انھیں اور ان کے آقاؤں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ایسا کیا گیا تو انھیں پھر ایک نئے طوفان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح انھیں اس کی ہمت نہ ہوئی۔''

پیر صبغت اللہ شاہ راشدی اور علی محمد راشدی کا خاندان ایک ہی تھا۔ پیر صبغت کو پھانسی دے کر نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا تھا۔ ان کے دونوں بیٹوں یعنی بڑے بیٹے شاہ مردان شاہ اور چھوٹے بیٹے سیّد نادر شاہ کو انگریز سرکار نے پہلے علی گڑھ اور پھر برطانیہ منتقل کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد 1949ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے برطانیہ میں شاہ مردان شاہ سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ حکومتِ پاکستان انگریز سرکار کی جانب سے ان کی معزول گدی بحال کر دے گی۔ لیکن ایسا 1949ء نہیں بلکہ 1952ء میں ہوا۔ جب پیر پگاڑا شاہ مردان شاہ سے ایک انٹرویو میں اس کا سبب معلوم کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

''ہو سکتا ہے کہ ہمارے وہی مہربان جو پیر صاحب شہید (سیّد صبغت اللہ) کے زمانے میں انگریزوں کے دستِ راست اور معاونِ خصوصی تھے اور آج مسٹر بھٹو کے خصوصی مشیر ہیں، ہماری وطن آمد سے پریشان ہوں اور ان دنوں ایوانِ اقتدار میں انھیں جو رسائی حاصل تھی، اسے خود اپنی کھال بچانے کے لیے استعمال کر رہے ہوں۔''

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پیر علی محمد راشدی اپنی ان تمام سرگرمیوں کے باوجود انتقال سے قبل جب ایک بار پیر شاہ مردان شاہ سے ملاقات کے لیے پیر جو گوٹھ گئے تو ان سے اس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

خواہش کا اظہار کیا کہ انھیں پیرانِ پگاڑا کے قبرستان میں دفن کے لیے جگہ دے دی جائے۔ پیر صاحب نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ یہ بزرگوں کی جگہ ہے، ہمارا تمہارا اس میں کیا مقام۔

پیر علی محمد راشدی ذوالفقار علی بھٹو کے مشیرِ اطلاعات تھے۔ ضیاء حکومت نے مارچ 1977ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے طریق کار کے حوالے سے ایک دستاویز بنام ''1977ء کے انتخابات کے طریقہ کار پر قرطاسِ ابیض کا خلاصہ'' (مطبوعہ، حکومتِ پاکستان، راول پنڈی، جولائی 1978ء)'' جاری کی جسے بھٹو حکومت کی معزولی کے بعد منظرِ عام پر لایا گیا۔ اس دستاویز کے سرورق پر ایک دلچسپ جملہ تحریر ہے:

''اسے 25 جولائی 1978ء سے پہلے شائع نہ کیا جائے۔''

یہ دستاویز جس کا نام ''قرطاسِ ابیض کا خلاصہ'' ہے، اس کی تفصیلی رپورٹ ''قرطاسِ ابیض'' چھے سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی۔ اسے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں ایک ہزار سے زائد صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں شامل کی گئی تھیں۔ قرطاسِ ابیض کے خلاصے کے صفحہ نمبر دس پر ایک اقتباس ''راشدی منصوبہ'' کے عنوان سے درج ہے:

''مسٹر بھٹو کے مشیرِ اطلاعات، پیر علی محمد راشدی کی ذہانت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے مئی 1976ء میں ایک عملی تفصیلی پروگرام مرتب کیا۔ اس کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اپوزیشن کی طرف سے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی صورت میں ایک کٹھ پتلی اپوزیشن کو سامنے لایا جائے۔ یہ کٹھ پتلی امیدوار بظاہر پورے جوش و خروش سے مقابلہ کریں لیکن سرکاری امیدواروں کے مقابلے میں شکست کھانے کے بعد انھیں کسی نہ کسی صورت میں معاوضہ دے دیا جائے۔

''ان میں سے چند قابلِ اعتماد لوگوں کو ہمارے غیر اہم امیدواروں کے مقابلے میں کامیاب ہونے دیا جائے تاکہ وہ منتخب ہونے کے بعد اسمبلیوں میں ایک تعمیری، ذمے دار اور

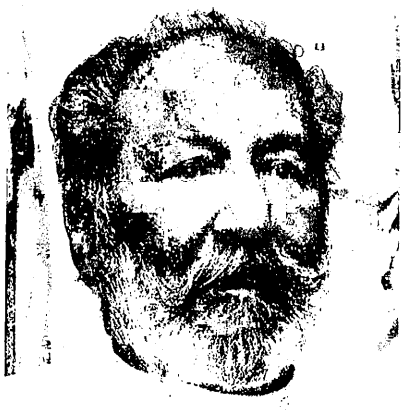

پیر صاحب پگاڑا

دوستانہ اپوزیشن کا کردار ادا کریں اور اس طرح جمہوری اقدار، پارلیمانی طریقوں اور ضابطوں پر عمل ہوتا رہے۔''

پیر صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کی طرف سے ٹی وی اور ریڈیو پر حزبِ مخالف کے لیے جتنا وقت دینے کا فیصلہ ہو، اس کا زیادہ تر حصہ ان کٹھ پتلی امیدواروں کو دیا جائے اور اسمبلیوں میں جعلی اپوزیشن قائم کر کے حزبِ اختلاف کے اہم امیدواروں کو منتخب ہونے سے روکا جائے۔ انھوں نے لکھا: ''ہمیں حساس حلقوں اور ایسے افراد کی فہرست تیار کرنی چاہیے جنہیں کسی صورت بھی منتخب نہ ہونے دیا جائے۔ اس طرح کے مخصوص انتخابی حلقوں میں انتخابات کروانے کے لیے ہمیں خصوصی پروگرام تیار کرنا ہوگا۔''

پیر علی محمد راشدی انتہائی موقع شناس اور زیرک سیاست دان تھے۔ انھیں حکمرانوں کے قریب رہنے کا ہنر بخوبی آتا تھا۔ گو انہوں نے اپنی کتابوں میں حکمرانوں کی قربت کو معیوب قرار دیا، لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ پیر صاحب نے حکمرانوں کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گورنر جنرل غلام محمد

قریب رہنے کے لیے ہر وہ عمل کیا جسے عام زندگی میں ناپسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

م ب خالد اپنی کتاب ''قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایوانِ صدر میں سولہ سال'' (مطبوعہ نظریہ پاکستان اکادمی، جولائی 2012ء) کے صفحہ نمبر تینتالیس پر ''سرکاری دورے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''گورنر جنرل غلام محمد جسمانی اعتبار سے ناتواں ہونے کے باوجود بھی سرکاری دوروں اور سیر و تفریح کے بڑے شوقین تھے۔ نمونہ مشتے از خروارے ایک اندرونِ ملک اور دو بیرونِ ملک دوروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ وہ صوبہ سندھ کے دورے پر تھے۔ حیدرآباد اور بھٹ شاہ سے ہوتے ہوئے موئن جودڑو اور لاڑکانہ پہنچے۔ سکھر میں گورنر جنرل کو دریائے سندھ میں کشتی کی سیر کروائی گئی۔ ایک بڑی کشتی میں گورنر جنرل اور ان کا عملہ، دوسری کشتی میں مقامی انتظامیہ، تیسری کشتی میں سکیورٹی اسٹاف اور چوتھی میں کھانے کی دیگیں رکھ دی گئیں۔

''ایک صوبائی وزیر جو پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے، گورنر جنرل کی میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے ہمراہ تھے۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو مقامی انتظامیہ کے ایک افسر نے وزیر صاحب کے کان میں کہا: ''سائیں مانی تیار آہے'' (کھانا تیار ہے)۔ چاروں کشتیاں جڑ گئیں اور وزیر صاحب نے مقامی افسروں کے ہمراہ بیرے خانساموں کے فرائض انجام دیے۔

''یہ وزیر صاحب جو بعد میں وفاقی وزیر اور آخر میں سفیرِ کبیر اور بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران مشیر بنے، بڑے کائیاں تھے۔ غلام محمد سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھے جسے ان کا ذاتی خدمت گار قاسم اتارتا اور پہنایا کرتا تھا مگر کیا مجال کہ وزیر صاحب نے قاسم کو ایک موقع بھی دیا ہو۔ وزیر صاحب تیر کی طرح کہیں نہ کہیں سے نکل آتے۔ گورنر جنرل صاحب کو جوتی پہناتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بوسہ دیتے۔''

''بے شمار خوبیوں کے علاوہ وزیر موصوف کی اضافی خوبی یہ تھی کہ سگریٹ نہ پیتے تھے، البتہ بیڑی پینے کا شوق تھا۔ بھرم رکھنے کے لیے ٹرپل فائیو (555) سگریٹوں کے ڈبے میں بیڑیاں رکھتے اور باربرداری کا کام اپنے سرکاری پرائیویٹ سیکریٹری سے لیتے۔ بیڑی کی طلب ہوتی تو پیچھے مڑ کر دیکھتے۔ پرائیویٹ سیکریٹری کامل تربیت یافتہ تھا، پھرتی سے آگے آتا، سر کو جھکاتا اور ادب سے کہتا: ''سائیں بیڑی!'' سائیں بیڑی کو سلگا چکتے تو پرائیویٹ سیکریٹری واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر سر دوبارہ ہلاتا جیسے خدا کا شکر بجالا رہا ہو۔ جب وزیر اتنا اچھا ہو تو اس کا پرائیویٹ سیکریٹری تو بہت ہی اچھا ہوگا۔''

ایوب خان کی بادشاہت کے حوالے سے صفحہ نمبر 179 پر لکھتے ہیں:

''البتہ ہمارے ایک سفیرِ کبیر جن کے نام کے ساتھ پیر کا لاحقہ بھی شامل تھا، بالکل پٹڑی سے اتر گئے۔ بجائے اس کے کہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ خارجہ پالیسی پر اظہارِ خیال فرماتے
جیسا کہ ان سے کہا گیا تھا، انہوں نے
خارجہ پالیسی پر ایک لفظ کہے بغیر بعد از
اداب آداب، آیتوں، روایتوں اور تاریخی
حکایتوں کے حوالے سے ایوب خاں کو
باور کروانے کی کوشش کی کہ نہ صرف
پاکستانی قوم بلکہ پوری امتِ مسلمہ اپنے
طبعی مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ ہی کسی
مردِ کامل کی محتاج رہی ہے اور آج وہ مردِ
کامل جنرل محمد ایوب خاں کی شخصیت میں
پاکستان کو میسر آچکا۔ چنانچہ وقت اور
حالات کا تقاضا ہے کہ آپ فی الفور پاکستان میں بادشاہت کے
قیام کا اعلان فرما کر اس ملک وقوم پر احسانِ عظیم فرمائیں وغیرہ
وغیرہ۔ یہ نبض شناس، مردشناس اور موقع شناس سفیرِ کبیر پیر علی محمد
راشدی تھے۔"

18 نومبر 1983ء کو روزنامہ ڈان میں الطاف گوہر کے
حوالے سے چھپنے والی ایک رپورٹ میں جولندن سے یحییٰ سید
نے بھیجی تھی، میں تحریر ہے:

"پیر علی محمد راشدی نے اپنے خط میں ایوب خان کو لکھا تھا
کہ انھیں اس امر کا مجاز ہونا چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں میں سے یا
اگر وہ بیٹوں کو اس قابل نہ سمجھیں تو باہر سے کسی کو اپنی جانشینی
کے لیے نامزد کردیں۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنے خط میں مزید
لکھا تھا کہ میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، پھر پاکستان کے سلسلے
میں اور حال ہی میں ون یونٹ کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر
چکا۔ میں ایک اور ایسی مہم کے لیے فلپائن سے آکر پاکستان میں
وقت نکال سکتا ہوں۔"

2 دسمبر 1983ء کو الطاف گوہر کے جواب میں پیر علی محمد
راشدی نے روزنامہ ڈان میں لکھا تھا: "یہ مشورہ کوئی نیا نہیں بلکہ
اس سے پہلے بھی جب 1955ء میں 56ء کا آئین لکھا جارہا تھا

ذوالفقار علی بھٹو

اور میں مرکزی کابینہ کا رکن تھا، میں نے آئین ساز کمیٹی میں
موجود اپنے رفقاء کو یہ مشورہ دیا تھا، لیکن انہوں نے مجھ سے
اتفاق نہیں کیا۔"

پیر علی محمد راشدی کے اس بیان کے بعد الطاف گوہر نے وہ
تمام دستاویزات، جن میں ایوب خان کو بادشاہت کا مشورہ دیا
گیا تھا، شائع کردیں۔ پیر علی محمد راشدی نے ان باتوں کا
اعتراف کرتے ہوئے ڈان میں اپنے مضمون میں لکھا تھا:
"میرے خیال میں آج کسی بھی شخص کے لیے جو متعدد منسوخ
شدہ آئینوں 1947ء، 1956ء، 1962ء، لیگل فریم آرڈر اور
تازہ ترین ڈھانچے کے ملبے پر ساکت وصامت بیٹھا ہوا ہے
اور پیمان کشی وحلف توڑنے کے متعدد واقعات کا شاہد ہے، یہ
کوئی نئی حیران کن اطلاع نہیں ہوگی کہ تقریباً چوتھائی صدی قبل
جب ملک میں آئینی خلا پایا جاتا تھا اور کسی نئے آئینی فارمولے
کی تلاش جاری تھی، تو مجھ سے سرکاری طور پر رجوع کیا گیا۔ میں
نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم برطانوی طرز کی آئینی بادشاہت کو
آزما سکتے ہیں جس کے تحت تمام اختیارات عوام کے ذریعے
منتخب ہونے والی پارلیمنٹ کے پاس ہوتے ہیں۔ سربراہِ مملکت
کو کسی آرائشی شے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جو ترقی سالمیت

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اور وقار کے لیے ایک جذباتی علامت بن جاتی ہے۔

راشدی صاحب کہتے ہیں: ''اس وقت کی صورتِ حال اتنی گمبھیر تھی کہ ایوب خان میرے پاس منیلا تشریف لائے، صرف ایک رات کے لیے تاکہ صورتِ حال پر سیر حاصل بحث ہو سکے۔ میں اُس وقت ایک وہاں ایک سفیر کے طور پر متعین تھا اور میرے پاس کوئی اختیار نہیں تھا کہ میں ان معاملات میں دخل دے سکوں۔''

''لیکن ایوب خان نے شاید میرے سیاسی پس منظر کی وجہ سے یہ سوچا ہو کہ میں ان کو ان مسائل پر کوئی کارآمد مشورہ دے سکتا ہوں، لہٰذا انہوں نے منیلا میں اپنا قیام ایک دن کے لیے بڑھا دیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں انھیں جلد ہی اپنی رائے سے آگاہ کروں گا جو کہ میں نے یکے بعد دیگرے دو یادداشتوں کے ذریعے انھیں پیش کی۔''

علی محمد راشدی صاحب کا دعویٰ ہے: ''روایتی طور پر جو شخص حاکم وقت ہو، اسے عام آدمی کی نظر میں ایک تقدس حاصل ہوتا ہے۔ کسی مطلق العنان شخص کو قتل کرنا باعثِ ثواب ہے۔ اس کے برعکس بادشاہِ وقت کو قتل کرنے والا بہت بڑا مجرم ہے۔ اس کا سبق ہمیں اسلامی تاریخ سے وافر مقدار میں ملتا ہے۔ آئینی بادشاہت عملی طور پر بے ضرر ہوتی ہے۔ اس کی خود ستائشی کی خواہش سجے سجائے دفاتر سے پوری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مفاد کی خاطر جمہوریت اور اس سے وابستہ اداروں کو حیل و حجت کے بغیر کام کرنے دیتا ہے۔''

ان کا یہ مزید دعویٰ ہے: ''آئینی بادشاہت، جمہوریت کو رد نہیں کرتی۔ جیسا کہ سیکڑوں سال کے انسانی تجربے سے ثابت ہے۔''

م ب خالد نے وزیر موصوف کی سرگرمیوں کا مزید احوال اپنی کتاب میں یوں درج کیا ہے: ''1960ء میں ایوب خان کو لائف پریزیڈنٹ یا بادشاہ بننے کا مشورہ دینے والے بزرگ 1958ء میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے زندہ سلامت تھے۔ حاضری لگوانے اور نمبر بنانے کا شوق اور فن قدرت کی طرف سے ودیعت تھا۔ ان بزرگ کو 1953ء میں غلام محمد کو جوتیاں پہناتے اور پہنا کر اپنے ہاتھ چومتے اور چوم کر جھومتے دیکھنے کا راقم عینی شاہد ہے۔ یہ مردم شناس ہی نہیں موقع شناس بھی تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ ان سے چوک ہوگئی ہو۔ ان صاحب یا اس قماش کے دوسرے صاحبان کو سانپ تو نہیں سونگھ گیا ہوگا کہ وہ گھر میں چپ سادھے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہے ہوں۔ اقتدار سے وفاداری یا ''انسانیت'' بھی تو کوئی چیز ہے۔''

میں یہ نہیں جانتا کہ پیر علی محمد راشدی کو محقق کہوں، سیاست دان یا ادیب کہوں، دانشور کہوں یا شاعر لکھوں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک کمال ہوشیار انسان تھے۔ وہ آمروں کی حمایت کرتے تھے اور جمہوری اداروں کے ساتھ بھی ہوتے۔ صحافیوں اور ادیبوں کے لیے بھی بہت ہمدردی رکھتے تھے اور ادب کے فروغ کے لیے بھی انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

ان کی کتاب ''اھی ڈینھن اھی شینھن'' (وہ دن وہ لوگ)، ''روداد چمن'' اور اس کے علاوہ بے شمار مضامین جو انہوں نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے لکھے، ان مضامین کے حوالے آج بھی دیے جاتے ہیں۔

لیکن تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ پیر پگاڑا سید صبغت اللہ شاہ کو سزائے موت دلوانے میں انہوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔ ایوب خان کو بادشاہت قائم کرنے کا مشورہ دیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو ایک خود ساختہ حزبِ اختلاف بنانے کی بھی تجویز دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابوں میں تاریخ کے ایسے گوشے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا سایہ بھی ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ علی محمد راشدی دانشور تھے، ادیب تھے، تاریخ دان تھے۔ لیکن یہ سوال بہر حال اپنی جگہ ہے کہ ان کے یہ گرانقدر مشورے کیا سیاست کے زمرے میں آتے ہیں یا سازش کے؟ ◆◆◆

www.pakistanipoint.com

مرنے کی دعائیں

زندگی سے بیزار اور انتظارِ مرگ میں بیٹھے مرد و زن کے لیے خوش آگہی

گلزار احمد خان

امریکہ: ریاست کیلیفورنیا کی اسمبلی میں ایک نیا قانون منظور ہوا۔ اس میں ڈاکٹروں کی مدد اور مشورے سے ’’مساعداتی خودکشی‘‘ کی باقاعدہ اجازت دے دی گئی۔ اسے انھوں نے ’’Assisted Suicide‘‘ کے قانون کا نام دیا۔ امریکا کی چار ریاستوں میں یہ قانون پہلے سے موجود ہے اور یوں یہ پانچویں ریاست تھی جو اس کارِخیر میں شامل ہوگئی۔

اُمید کی جا سکتی ہے کہ جمہوریت سے لبالب بھرے اس ملک کی بقیہ ریاستیں بھی عنقریب اس قانون کا نفاذ کر دیں گی۔ یوں جملہ امریکیوں کو اس کارِخیر میں شامل کر کے بقیہ عالمی مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوں گی۔ ورنہ تو اس قوم سے چھٹکارے کا اور کوئی حل نہیں آتا۔ مقصد اس قانون کا یہ ہے کہ جو لوگ طویل بیماری یا لمبی عمر کے ہاتھوں زندگی سے تو عاجز آ چکے مگر ملک الموت ابھی ان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، وہ اس کی روشنی میں ڈاکٹر سے مشورہ کر کے بلکہ قائل کر کے دوائی، انجکشن یا کسی دوسرے مناسب آلے کے استعمال سے خود کو ہمیشہ کے لیے اپنے روگ سے آزاد کر لیں۔

لامحالہ یہ خیال آتا ہے کہ اگر وطنِ عزیز میں بھی کوئی ایسا قانون رائج کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ پہلی بات تو یہ کہ اپنے

اشتہار برائے زندگی سے چھٹکارا

’’کیا آپ اپنی لاعلاج بیماری سے واقعی تنگ آ چکے؟ اور مزید علاج کے لیے پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں؟ تو فکر نہ کریں۔ بس ہمارے لیے تھوڑے سے پیسے بچائیے اور ہمارے پاس تشریف لائیے۔ بین الاقوامی ماہر ڈاکٹر کی مدد سے آپ ہمیشہ کے لیے اس مشکل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز بونس کے طور پر ہم آپ کے کفن دفن اور جنازے کے اخراجات بھی ادا کریں گے۔ خود بھی تشریف لائیے اور اپنے جیسے دوسرے احباب کو بھی لائیے۔

دو مریضوں کے پیکج پر قل کا کھانا بھی مہیا کیا جائے گا‘‘

بھولی فیملی اسپتال

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہاں واحد جرم جو صرف ناکامی کی صورت میں قابل دست اندازی پولیس ٹھہرتا ہے، وہ یہی ناکام اقدام خودکشی ہے۔ یعنی جو مرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، پولیس اُسے دھر لیتی ہے کہ کیوں کچا کام کیا؟ امریکی قانون کے نفاذ سے کم از کم اس پریشانی سے نجات تو مل جائے گی کیونکہ ڈاکٹر کبھی کچا کام نہیں کرتے بلکہ وہ تو کبھی کبھی، جسے نہ بھی مارنا ہو اسے بھی مار دیتے ہیں۔

اب ہمارے ہاں چونکہ ہر کام کے لیے اشتہارات کے استعمال کا چلن بہت زور پکڑ چکا، تو اس کام کی ترغیب بھی اشتہاروں کے ذریعے عام کی جائے گی۔ بالخصوص پرائیویٹ اسپتال اور ڈاکٹر تو بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیں گے۔ پھر اس قسم کے اشتہار اخباروں، رسالوں اور ٹی وی پر دیکھنے کو ملیں گے:

''طویل بیماری سے ہمیشہ کے لیے نجات پائیے۔ ہمارے ہاں تشریف لائیے اور ماہر ڈاکٹری زیر نگرانی اگلے جہان کو سدھا رئیے۔ معمولی فیس لے کر اور مکمل رازداری کے ساتھ آپ کے جملہ مسائل کا حل صرف ہمارے ہاں ہی ممکن ہے۔''

المشتہر:۔ جانکی دیری اسپتال

ایک اور اشتہار:

''کیا آپ اپنی لاعلاج بیماری سے واقعی تنگ آ چکے؟ اور مزید علاج کے لیے پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں؟ تو فکر نہ کریں۔ بس ہمارے لیے تھوڑے سے پیسے بچائیے اور ہمارے پاس تشریف لائیے۔ بین الاقوامی ماہر ڈاکٹر کی مدد سے آپ ہمیشہ کے لیے اس مشکل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز بونس کے طور پر ہم آپ کے کفن دفن اور جنازے کے اخراجات بھی ادا کریں گے۔ خود بھی تشریف لائیے اور اپنے جیسے دوسرے احباب کو بھی لائیے۔ دو مریضوں کے پیکج پر قل کا کھانا بھی مہیا کیا جائے گا''

بھولن دیوی اسپتال

ایک اور اشتہار:

زندگی سے عاجز اور طویل عمر والے مریضوں کے لیے خوشخبری:

''اگر آپ لمبی عمر اور بچوں کی بے مروتی سے تنگ آ چکے اور زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تو ناامید نہ ہوں، ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ یہاں امریکا سے 25 سالہ تجربہ رکھنے والے ڈاکٹر آپ کی جملہ مشکلات کا حل مناسب معاوضے پر پیش کرتے ہیں۔ ہر قسم کی حکومتی رکاوٹ کا بھی سدِ باب گارنٹی کے ساتھ کیا جائے گا اور آپ نہایت سکون اور اطمینان سے دل کی مراد پالیں گے۔''

سرجمنا داس اسپتال

اسی قسم کا ایک اور اشتہار:

کیا آپ خاندان والوں کے رویے سے تنگ ہیں؟ یا بچوں کی بے مروتی کے شاکی؟ اس وجہ سے آپ کے دل میں دنیا سے کوچ کر جانے کا خیال تو آتا ہے مگر جوانی میں مکمل اعتدال اور ورزشی زندگی گزارنے کی پاداش میں کوئی بھی جان لیوا بیماری آپ کے قریب نہیں پھٹک رہی بلکہ صحت مند جان و جثہ کی بدولت امراض تو دور بھاگے جا رہے ہیں لیکن غم اور پریشانیاں آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتیں تو ان سے گلو خلاصی کیسے ہو؟ ایسی صورت میں پریشان نہ ہوں اور ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ ہمارے تجربے کار ڈاکٹر آپ کو غیر محسوس طریقے سے ملکِ عدم کے پُرسکون راستے پر گامزن کرنے میں مکمل امداد فراہم کریں گے اور آپ تمام غموں سے چھٹکارا پا لیں گے:

بھولی فیملی اسپتال، گوراقبرستان روڈ

آن لائن اشتہار

آج کل آن لائن بزنس بھی زور شور سے جاری ہے۔ قانون منظور ہوتے ہی اس کام میں بھی یہ لوگ آگے آئیں گے اور کچھ اس قسم کے اشتہار دیکھنے کو ملیں گے۔

''اگر آپ کسی بھی وجہ سے دنیا سے رخصت ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں لیکن کم ہمتی یا بزدلی کی وجہ سے مروجہ طریقۂ موت مثلاً اُونچی بلڈنگ سے چھلانگ لگانا، ریل کی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

لوگوں کو ستانے کی طاقت

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مصر میں دو امیر زادے رہتے تھے۔ ایک نے علم حاصل کیا اور دوسرے نے مال و دولت جمع کیا۔ آخر کار ایک زمانے کا بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرے کو مصر کی بادشاہت مل گئی۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے اس عالم کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا "میں حکومت تک پہنچ گیا اور تیری قسمت میں غربت و مسکینی آئی۔"

عالم نے کہا "اے بھائی! مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر تجھ سے زیادہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ میں نے پیغمبروں کا ورثہ یعنی علم پایا اور تو نے فرعون و ہامان کی میراث یعنی مصر کی حکومت پائی۔ کجا خود شکر ایں نعمت گزارم کہ زور مردم آزاری ندارم۔" (میں اس نعمت کا شکر کیسے ادا کروں کہ لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی بنی نوع انسان کو مجھ سے فائدہ پہنچتا ہے اور تجھ سے نقصان، پس دیکھ لے خدا کا فضل کس پر زیادہ ہے۔)

پٹڑی پر سر رکھنا یا کنوئیں میں چھلانگ لگانا وغیرہ انجام نہیں دے پاتے تو گھر بیٹھے ہماری خدمات سے فائدہ اُٹھائیں۔ ہمارے ماہرین اموات آپ کے گھر آ کر آپ کو ہمیشہ کے لیے دوسری دنیا بھجوانے کا کام نہایت احسن طریقے سے انجام دیں گے۔ آپ کے دیرینہ دوست یا مہمان بن کر آئیں گے اور آپ کو آسان طریقہ سے اور بغیر تکلیف پہنچائے اگلے جہان رخصت کریں گے۔ آن لائن ہم سے رابطہ کریں اور مقررہ فیس ایڈوانس ادا کر کے دل کی مراد پائیں۔ اپنا شناختی کارڈ نمبر، مکمل پتا، نام معہ ولدیت ہمیں ای میل کریں اور آپ کو گھر بیٹھے گوہر مراد حاصل ہو جائے گی۔

ای میل۔ www.Moutonline.pk

المشتہر DEATH SQUAD HOSPITAL

ایک ایسا اشتہار بھی نظر آنا ممکن ہے جس میں بدعنوانی کرنے والے ارباب اقتدار کی سہولت کے لیے کوئی ڈاکٹر یا اسپتال اپنی خدمات پیش کرنے کا سوچ لے۔ یہ کچھ یوں ہوگا:

"شرمندہ ہیں تو کیوں زندہ ہیں؟ اگر ناسمجھی یا لالچ میں آپ کوئی غبن وغیرہ کر چکے اور اب پکڑے جانے کا احتمال واثق ہے تو ایسی صورت میں پریشان نہ ہوں۔ آپ خود اپنی زندگی کے ساتھ جو چاہیں سلوک کر سکتے ہیں لیکن خیال رہے کہ ہاتھ پکا ڈالنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ناکامی کی صورت میں تھانہ، کچہری بھگتنے پڑ جائیں۔ یوں بھی غبن کا الزام تو آپ کو وہاں لے ہی جائے گا اور اس طرح سے دوہری مصیبت بن جائے گی۔

البتہ اگر آپ کے لواحقین موجود ہیں اور ان کا خیال بھی آپ کے دل میں موجود ہے کہ بعد میں ان کے لیے ندامت کا سامان نہ بن جائے تو ایسی صورت میں ہمارے ہاں تشریف لائیں۔

ہم آپ کے جملہ مسائل کا حل معمول سے کچھ زیادہ فیس لے کر حل کرنے کی ضمانت دیتے ہیں۔ ہمارے ماہر ڈاکٹر آپ کو زندگی سے چھٹکارا دلانے کے علاوہ آپ کے لواحقین کو ہر طرح کی شرمندگی سے بچانے کے لیے نہایت مناسب سرٹیفکیٹ بھی تیار کر کے دیں گے۔ اس میں آپ کی بیماری اور نتیجے میں موت کی وجہ ایسی دکھائی جائے گی کہ عام پولیس کا تو ذکر ہی کیا، خفیہ والے بھی پاؤں پٹختے رہ جائیں گے اور تہہ تک نہ پہنچ پائیں گے۔ مزید شرمندہ نہ ہوں اور تشریف لائیں۔"

رئیل سروسز اسپتال۔ جیل روڈ

◆◆◆

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

فلمیں جن کا اختتام ذہن گھما دے

سعدیہ امام

دنیا میں ہر سال سیکڑوں ہزاروں فلمیں ریلیز ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے اکثر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا اختتام کیسا ہوگا۔ مگر کچھ فلمیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اختتام ایسے انداز سے ہوتا ہے کہ ذہن گھوم کر رہ جاتا ہے اور منہ سے بے ساختہ واہ نکلتا ہے۔ ہم کچھ ایسی ہی انگریزی فلموں کا ذکر کر رہے ہیں جو آخری لمحات تک آپ کو نشست پر بے چین رکھتی ہیں۔ خاص طور پہ آخری لمحوں کا ''ٹوئیسٹ'' ذہن گھما دیتا ہے۔

دی سکسٹھ سنس (The Sixth Sense)

اگر آپ نے یہ فلم نہیں دیکھی تو ایک بار ضرور دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے کہ شروع سے آخر تک آپ کو دلچسپ تو لگے مگر اسے بہترین قرار دینا مشکل ہو۔ لیکن جب اس کا اختتام ہوتا ہے تو آپ کے لیے یقین کرنا کٹھن مرحلہ بن جاتا ہے کہ آپ نے فلم کی کہانی کو سمجھا بھی تھا یا نہیں۔ ہم اختتام تو نہیں بتاتے مگر 1999 کی یہ فلم ایک ماہر نفسیات اور ایسے بچے کے گرد گھومتی ہے جو مردوں کو دیکھنے اور بات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ماہر نفسیات بچے کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنی مصیبت سے نجات پا سکے۔ مشہور اداکار، بروس ویلز نے یہ کردار خوبی سے نبھایا۔

آخری لمحات تک تجسس و بے چینی برقرار رکھنے والی فلموں کا دلچسپ تذکرہ

بریڈ پٹ اور مورگن فری مین فلم سیون کے ایک منظر میں

سورس کوڈ (Source Code)

یہ ایک سائنس فکشن فلم ہے جو 2011ء میں سامنے آئی۔ جب آپ فلم دیکھنا شروع کرتے ہیں تو فوری طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ یہ انتہائی منفرد کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل ہی مختلف تصوراتی دنیا کو پیش کرتی ہے، جس میں نہ صرف حال اور ماضی کے واقعات کو دکھایا جاتا ہے بلکہ اس کا اختتام بھی انتہائی انوکھا ہے جو لوگوں کو اپنی نشست سے ہلنے نہیں دیتا۔

سا (Saw)

یہ 2004ء میں بننے والی ڈراؤنی فلم ہے۔ فلم میں بار بار آنے والے دہشتناک موڑ دیکھنے والوں کا خوف آخر تک بڑھاتے رہتے ہیں۔ موت کے جالوں سے بھرپور یہ سائیکو تھرلو فلم دیکھتے ہوئے آپ کو کئی بار پیچ و تاب کھانا پڑ سکتے ہیں۔ مگر اس کے بعد ہنسی بھی آسکتی ہے۔ پھر آپ پر جلد دہشت کی ایک لہر کا غلبہ ہونے لگتا ہے جو فلم میں مشکلات کا سامنا کرنے والے افراد کو دیکھ کر مزید بڑھ جاتا ہے۔

میمینٹو (Memento)

اگر آپ کو تجسس بڑھانے والی فلمیں پسند ہیں تو یہ کسی تحفے سے کم نہیں۔ مگر اسے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی پوری توجہ اس پر مرکوز رہے، کیونکہ اس میں دو مختلف سیکونس یا مناظر چلتے ہیں۔ ایک بلیک اینڈ وائٹ میں جس میں ماضی کا احوال ہوتا ہے جبکہ دوسرا کلر سیکونس جو حال سے پیچھے کی جانب جاتا ہے۔ یہ دونوں اختتام پر ملتے ہیں اور صحیح معنوں میں ذہن گھما دینے والی کہانی سامنے آتی ہے۔ اس فلم کا ہی مرکزی خیال عامر خان کی فلم ''گجنی'' میں بھی پیش کیا گیا۔ یہ تھرلر فلم 2000ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

سیون (Seven)

اگر یہ کہا جائے کہ 1995ء میں بننے والی یہ فلم چند بہترین مسٹری اور تھرلر فلموں میں سے ایک ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس میں بریڈ پٹ اور مورگن فری مین نے مرکزی کردار کیے ہیں۔ یہ پولیس کے دو اہلکاروں کی کہانی ہے جو ایک سیریل کلر کی تلاش کرتے ہیں۔ فلم کا اختتام ایسے ٹوئیسٹ پر ہوتا ہے جو آپ کو طویل عرصے تک بھول نہیں سکے گا۔

سائیکو (Psycho)

الفریڈ ہچکاک کی یہ فلم ہوسکتا ہے کافی پرانی لگے مگر اس کی کہانی آپ کو بالکل بھی بیزار نہیں ہونے دے گی۔ بلکہ اس کا اختتام ایسا ہے جس کی توقع آپ نے کبھی نہیں کی ہوگی۔ یہ فلم ایک موٹیل کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک لڑکی پہنچتی ہے۔ اس کے بعد کہانی میں یکے بعد دیگرے غیر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

متوقع موڑ آنے لگتے ہیں۔ یہ 1960ء میں ریلیز ہونے والی نفسیاتی وڈراؤنی فلم ہے۔

شٹر آئی لینڈ (Shutter Island)

ڈائریکٹر مارٹین اسکورسیز کی یہ سائیکلوجیکل تھرلر فلم لیونارڈو ڈی کیپریو کی بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔ اس کی کہانی کے لیے 2003 میں شائع ہونے والے ڈینیس لیہانے کے اسی نام کے ناول کا انتخاب کیا گیا۔ فلم میں لیونارڈو نے ایک امریکی مارشل کا کردار ادا کیا ہے جو شٹر آئی لینڈ کے سائیکاٹرک ادارے کی تفتیش کرتا ہے۔ جب اس فلم کا اختتام ہوگا تو نوے فیصد امکان ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور یقین کرنا مشکل ہوجائے گا۔ یہ فلم 2010ء میں بنائی گئی۔

برئیڈ (Buried)

2010ء کی یہ فلم ایسے امریکی ڈرائیور کی کہانی ہے جو عراق میں کام کرنے جاتا ہے۔ ایک حملے کے دوران وہ بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش پر آنے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تابوت میں ڈال کر دفن کردیا گیا ہے۔ وہاں سے نکلنے کے دوران اسے متعدد نفسیاتی دوروں کا سامنا ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی بچانے کے لیے بہت زیادہ جسمانی کوششیں کرنا پڑتی ہے، مگر جب وہ تابوت کھولتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ وہ لمحہ ہے جو ذہن گھما دیتا ہے۔

دی ادرز (The Others)

یہ فلم ایک ایسے خاندان کے گرد گھومتی ہے جو ایک نئے گھر میں منتقل ہوتے ہیں۔ وہ مکان آسیب زدہ ہوتا ہے اور یہ لوگ ماورائی سرگرمیوں سے دہشت زدہ ہوجاتے ہیں۔ آپ کو آخر تک اندازہ نہیں ہوتا کہ درحقیقت یہ ماجرا کیا ہے اور ہوسکتا ہے بہت بڑا صدمہ اختتام پر آپ کا منتظر ہو۔ یہ فلم 2001ء میں بنی تھی۔

اولڈ بوائے (Old Boy)

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کو پندرہ سال تک قید میں رکھا جاتا ہے۔ ایک دن اچانک اسے وجہ بتائے بغیر رہا کردیا جاتا ہے۔ پوری فلم آدمی کی اس جستجو کے گرد گھومتی ہے کہ آخر کیوں اسے قید میں رکھا گیا؟ اس کا جو جواب سامنے آتا ہے وہ ذہن گھما ڈالتا ہے۔ ◆◆◆

شیر بہت بیمار ہے

ایک شیر بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ بھوک سے جب برا حال ہوا تو کسی لومڑی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا: "فکر نہ کرو، میں تمھارے لیے شکار کا بندوبست کردوں گی۔" یہ کہہ کر لومڑی نے پورے جنگل میں مشہور کردیا کہ شیر بہت بیمار ہے اور بچنے کی کوئی امید نہیں۔ یہ خبر سنتے ہی جنگل کے جانور اس کی عیادت کو آنے لگے۔ شیر غار میں سر جھکائے پڑا رہتا اور عیادت کے لیے آنے والے جانوروں کا شکار کرکے اپنی بھوک مٹاتا۔ ایک دن لومڑی شیر کا حال احوال پوچھنے کے لیے آئی اور غار کے دہانے پر کھڑی ہوگئی۔ اتفاقاً اس دن کوئی جانور نہ آیا تھا جس کی وجہ سے شیر بھوکا تھا۔ اس نے لومڑی سے کہا: "باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ اور مجھے جنگل کا حال احوال سناؤ۔"

لومڑی نے جواب دیا: "نہیں میں اندر نہیں آسکتی۔ میں یہاں باہر سے آنے والے پنجوں کے نشان دیکھ رہی ہوں لیکن واپسی کے نہیں۔"

حاصل کلام: انجام پر ہمیشہ نظر رکھنے والے ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

عبدالقدیر رشک

ڈاکٹر خان صاحب کا قتل

خان لیاقت علی خان کے سیاسی قتل سے ٹھیک چھے سال بعد پاکستان کے ایک دوسرے سیاست دان اور صوبہ سرحد کے سابق وزیراعلیٰ، ڈاکٹر خان صاحب زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ 9 مئی 1958ء کی بات ہے، یہ بزرگ صبح کے وقت اپنی کوٹھی واقع 16/ایکسمین روڈ جی او آر، لاہور پر پھولوں اور بہاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک سانولے رنگ کا ایک نوجوان اجنبی نمودار ہوا۔ اس کا حلیہ اور لباس سو فیصد دیہاتی تھا۔ اس پراسرار اجنبی نے کسی نجی معاملے میں ڈاکٹر خان صاحب سے مدد مانگی لیکن وہ ایک کھرے آدمی تھے۔ وعدہ فردا کے قائل تھے نہ ان کی پٹھانی طبیعت کو سبز باغ دکھانا آتا تھا۔ وہ اجنبی کو ٹکا سا جواب دے کر کوٹھی کے برآمدے میں آ بیٹھے۔ ابھی اخبار کی سرخیوں پر نظر بھی نہ ڈال پائے تھے کہ وہی نوجوان پھر نمودار ہوا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے انکار میں گردن ہلائی۔ پُراسرار نوجوان نے خنجر نکال لیا۔

ڈاکٹر خان صاحب بوڑھے ہونے کے باوجود نہایت صحت مند آدمی تھے مگر تنہا آدمی تیز دھار چاقو کا کب تک

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایک ہنگامہ خیز کیس کی ڈرامائی داستان جس نے علامہ عنایت اللہ مشرقیؒ اور مولانا مودودیؒ جیسے چوٹی کے نامور علما کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

مقابلہ کرسکتا تھا؟ پُراسرار آدمی نے اس سرعت سے چاقو کے پے در پے وار کیے کہ ڈاکٹر خان صاحب آن واحد میں لہو لہان ہوگئے۔ شدید زخمی ہونے پر بھی ان کی پٹھانی ہمت سرد نہ ہوئی۔ وہ قاتل کے تعاقب میں پوری رفتار کے ساتھ بھاگے لیکن گیٹ پر پہنچ کر زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے گر گئے۔

صبح کے کھٹے میٹھے موسم میں وہ نوجوان شاید ایکسین روڈ کی کسی کوٹھی یا جھاڑی میں چھپ جانا چاہتا تھا لیکن لوگوں کا شور مچاتا ہجوم اس کے تعاقب میں رواں دواں تھا۔ ہر طرف سے پکڑو پکڑو کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھرتیلا نوجوان تعاقب کرنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ ایکسین روڈ کا موڑ کاٹ کر اگلی کوٹھیوں، جھاڑیوں اور باغوں میں روپوش ہونا چاہتا تھا۔

قاتل کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے سعد اللہ خاں کا ہوشیار ڈرائیور تازی خیل اُچک کر گاڑی میں سوار ہوا اور قاتل کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ جب پُراسرار اجنبی کو احساس ہوا کہ موٹر گاڑی موت کا فرشتہ بن کر اس کا تعاقب کر رہی ہے تو اُس نے سڑک کے ساتھ بل کھاتے راستے پر بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ ہر حالت میں بچ نکلنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر خان صاحب کا نمک حلال موٹر ڈرائیور اپنے مالک پر جان قربان کرنے کا ارادہ لیے اندھا دھند گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی کبھی کسی جھاڑی سے ٹکراتی اور کبھی گیلے کچے راستے میں دھنس کر جھٹکے کھاتی سیدھی ہو جاتی۔ بالآخر وفا شعار ڈرائیور گاڑی کو قاتل سے ٹکرانے اور اسے زخمی حالت میں گرا دینے میں کامیاب ہوگیا۔

پُراسرار اجنبی کے کپڑے زخموں کی وجہ سے لہولہان ہو چکے تھے۔ پٹھان ڈرائیور اور تعاقب میں آنے والے لوگوں نے اسے قابو کر لیا۔ لوگوں کو علم نہیں تھا کہ یہ نوجوان کہاں سے آیا ہے اور اسے گاڑی سے ٹکر مار کر زخمی کیوں کیا گیا؟ اس راز سے ڈاکٹر خان صاحب کی کوٹھی کا صرف وہ مالی واقف تھا جو دور لان میں پودوں کی آبیاری کر رہا تھا۔ جب اس نے ایک نوجوان کو خان صاحب پر خنجر زنی کرتے دیکھا تو ان کی مدد کے لیے سرپٹ دوڑا لیکن اس دوران بھیانک سین بدل چکا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب قاتل کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے گیٹ کے قریب گر کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

جب قتل کا یہ دردناک واقعہ رونما ہوا تو میں لاہور کے ایک انگریزی روزنامے کا وقائع نگار خاص تھا۔ اخباری نمائندوں اور بالخصوص اخبار رپورٹروں کی راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ قتل کے روز میں اپنے مکان واقع لاہور چھاؤنی پر لمبی تان کر سویا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہڑبڑا کر چونگا اُٹھایا۔ ٹیلیفون پر اے پی پی کے خلیل بٹالوی مجھ سے ہمکلام تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خان صاحب، جو ان دنوں پاکستان ری پبلکن پارٹی کے سربراہ تھے، کسی گمنام قاتل کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ پولیس ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے جا رہی ہے۔ تم بھی پہنچو تاکہ قتل کی اس تازہ واردات سے قلمی انصاف کیا جائے۔

قاتل عموماً بڑے ترش مزاج، مردم بیزار اور چڑچڑے ہوتے ہیں۔ آپ اُس قاتل کے مزاج کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس نے ڈاکٹر خان صاحب کے ذرا سے انکار پر خنجر نکال لیا۔ صرف چند منٹ میں پاکستان کی ایک ایسی شخصیت موت کے گھاٹ اُتر گئی جس نے برطانوی دور میں صوبہ سرحد میں اہم سیاسی زندگی گزاری اور اقتدار دیکھا تھا۔

جب میں ڈاکٹر خان صاحب کے مبینہ قاتل، عطا محمد سابق پٹواری سے ملا تو اسے بڑا ہنس مکھ اور ملنسار پایا۔ اگرچہ اس کا بازو زخمی تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ یہ قاتل عام قاتلوں سے مختلف تھا۔

پانچ دریاؤں کی سرزمین پر قتل کی وارداتیں دیرینہ عداوت کا تلخ و ترش پھل سمجھی جاتی ہیں۔ زر، زمین اور زن جیسے معاشرتی اور اقتصادی مسائل قتل اور لرزہ خیز واقعات کو جنم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دیتے ہیں۔ پنجاب میں ایسے علاقے موجود ہیں جہاں عداوت، انتقام اور جوابی قتل کا تحفہ نسل در نسل چلتا ہے۔ جب انتقام کی آگ بجھتی ہے تو بسا اوقات کئی ہنستے بستے خاندان تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

لیکن 16/ ایمکین روڈ کا قتل ایسا پُراسرار اور خلافِ توقع قتل تھا جس میں قاتل اور مقتول زندگی میں پہلی بار ملے تھے۔ وہ اس سے قبل ایک دوسرے کی شکل سے بھی ناآشنا تھے۔ مقتول اتمان زئی کے ممتاز پٹھان قبیلہ کا فرد تھا لیکن قاتل میانوالی کا ملک اور دونوں میں کوئی وجۂ عداوت موجود نہ تھی۔ دونوں ایک ملاقات کے نتیجے میں یکجا ہوئے۔ اس ملاقات نے ایک ایسی واردات کو جنم دیا جو پاکستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے دوسرا سیاسی قتل تھی۔

میری صحافتی چھٹی حس بتاتی تھی کہ ایک ممتاز سیاسی شخصیت کا قتل کوئی تعجب انگیز رُخ ضرور اختیار کرے گا۔ ملک کو جس نوعیت کے حالات درپیش تھے، ان کا تقاضا تھا کہ اس قتل سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے۔ اگر حکومت کا طرزِ عمل یہی ہو تو پولیس اپنی جگہ مجبور ہوتی ہے اور بالآخر قتل کی کہانی تک تبدیل کر دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قتل سے صرف ایک ماہ قبل لاہور میں عجیب و غریب واقعات رُونما ہوئے جن کا تعلق خاکسار قیادت اور خاکسار تحریک سے تھا۔ جب سے پاکستان آزاد ہوا ہے، برصغیر کی سب سے بڑی مسلم ریاست جموں و کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین متنازع رہی۔ یہ ریاست تہذیبی، ثقافتی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا قدرتی جزو ہے۔ ایک موقع پر بھارت نے اقوامِ متحدہ کے ذریعے کشمیر کے نوّے لاکھ عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا تھا لیکن استصواب کی نوبت آنے سے پہلے ہی بھارتی حکومت اپنے بین الاقوامی وعدے سے منحرف ہو گئی۔

ڈاکٹر خان صاحب قتل کیس سے صرف ایک ماہ قبل علامہ عنایت اللہ مشرقی نے اعلان کیا کہ جو سیاسی فریضہ چوہدری غلام عباس ادا نہ کر سکے، وہ ان کے خاکسار ادا کریں گے۔ علامہ صاحب نظریاتی مؤقف کے لحاظ سے بڑے سخت گیر تھے۔ وہ ہر چیز ترک کر دیتے تھے مگر اپنا نصب العین ترک نہ کرتے۔ انھوں نے خاکساروں کو حکم دیا کہ وہ پاکستان میں واقع مقبوضہ کشمیر کی سرحد پر کیمپ لگائیں اور جونہی ان کے لیڈر اشارہ کریں، تمام مصلحتوں کو نظرانداز کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ خاکساروں نے تمام تر پیش بندیوں کے باوجود سرحدوں پر کیمپ قائم کر لیے۔

جس سال یہ واقعات رونما ہوئے، سکندر مرزا پاکستان کے صدر تھے۔ بعدازاں ان کی ڈرامائی تنزلی پر یہ بات واضح ہوئی کہ وہ برطانیہ کے آدمی تھے۔ وہ ہر اس مصلحت کو مقدم جانتے جسے برطانیہ پسند کرتا تھا۔ کانگرس، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور دیگر انگریز حکمرانوں کا گٹھ جوڑ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اس تاریخی پس منظر کی روشنی میں جب سکندر مرزا کو خاکسار تحریک کے فیصلے کا علم ہوا تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ اس مسئلے کا ایک غیر آئینی حل یہ تھا کہ خاکسار تحریک کی قیادت کو غیر متعین عرصے تک تشویش انگیز اور رسوا کن معاملے میں الجھا دیا جائے۔ چنانچہ ایک نئی سازش کا ڈول ڈالا گیا۔

خاکسار لیڈر علامہ عنایت اللہ مشرقی سرحدی خلاف ورزی اور تعزیراتِ پاکستان کی دیگر دفعات کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی گرفتاری سے قبل چوہدری غلام عباس بھی اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے لیکن ان کی پشت پر کوئی بڑی تحریک کارفرما نہ تھی۔ حکومت نے ان کے خلاف سخت کارروائی سے گریز کیا لیکن علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی ملک کے پرانے آزمودہ سپاہی تھے۔ ان کے خاکسار مسلمانوں کے بہترین مفاد کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے اگلے روز جب عوام شاہراہِ قائداعظم پر شام کی سیر کو نکلے تو ''ایوننگ ٹائمز'' کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

علاوہ روزنامہ ''نوائے وقت'' ''پاکستان ٹائمز'' اور ''کوہستان'' کے ضمیمے بک رہے تھے۔ ان کی سرخیاں اس طرح تھیں: ''علامہ مشرقی اور ان کے ساتھی ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کیس میں گرفتار کر لیے گئے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے مبینہ قاتل کے سنسنی خیز انکشافات۔''

زندہ دلانِ لاہور جن کی جہاں دیدہ آنکھوں نے کئی قومی تحریکوں کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے، اخبارات کی سرخیاں پڑھ کر حیران رہ گئے۔ لاہور کا کوئی شہری تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی جیسی شخصیت قتل جیسے سنگین جرم میں ملوث ہو گی اور وہ شاندار تاریخ اپنا سر پیٹ کر رہ جائے گی جس نے علامہ صاحب کی قیادت میں عوام کی آزادی کے راستے پر بڑھتے اُبھرتے دیکھا تھا لیکن یہ سب کچھ خواب نہیں، ایک تلخ حقیقت تھا۔ برصغیر کی خاکسار تحریک کے قائد اور بانی ڈاکٹر خان صاحب قتل کیس میں ملوث ہو چکے تھے۔

قتل کے مقدمات میں قاتل کے ارادے اور نیت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ عطا محمد قتل جیسی واردات کا مرتکب کیوں ہوا؟ قاتل اور مقتول کے درمیان دشمنی یا عداوت ثابت کرنا پولیس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک ایسی استغاثہ کہانی سامنے لائی گئی جو مبینہ طور پر قاتل کے ابتدائی بیان سے مختلف تھی۔ قتل کہانی کی کڑیاں اس طرح جوڑی گئی تھیں کہ وہ اچھا خاصا ڈراما معلوم ہوتی تھیں۔

استغاثہ کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کا مبینہ قاتل مسائل میں گھرا ہوا ایک غریب آدمی ہے۔ مسائل کے ساتھ ساتھ وہ فکری لحاظ سے ایک نہایت جذباتی انسان تھا۔ اس کے جذبات قدم قدم پر مجروح ہوئے تھے۔ جب اس نے لاہور میں اپنے مسائل کے سلسلے میں کئی ٹھوکریں کھائیں تو وہ علامہ صاحب کے دفتر خاکسار ہیڈ کوارٹر واقع اچھرہ گیا۔ علامہ صاحب نے وہاں مبینہ طور پر اسے ڈاکٹر خان صاحب کو قتل کرنے کی تحریک دی۔

بعد ازاں عطا محمد جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک درس میں شریک ہوا۔ جب مولانا درس سے فارغ ہوتے تو کئی لوگ ان سے سوال پوچھتے۔ عطا محمد نے بھی کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر مولانا سے سوال پوچھا جو غالباً عقائد کی روشنی میں انسانی قتل کے متعلق تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں اس کا جواب دیا۔

استغاثہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ عطا محمد نے علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کی تحریک پر برسراقتدار جماعت، پاکستان ری پبلکن پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر خان صاحب کو قتل کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے سوال پوچھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کا دینی جواز تلاش کیا جائے مگر مبینہ قاتل مولانا مرحوم کے عالمانہ دلائل کے پیش نظر ایسا نہ کر سکا۔

قتل کے جن مقدمات میں کوئی عینی شاہد موجود نہ ہو، پولیس ملزموں میں سے کسی ایک ملزم کو وعدہ معاف گواہ بنا لیتی ہے۔ یہ قانون کی زبان میں سلطانی گواہ کہلاتا ہے۔ 16/ ایکمین روڈ کے مالی، سعد اللہ خاں کے موٹر ڈرائیور تازی خیل اور مرحوم کی بہو بیگم صوفیہ سعد اللہ خاں نے ڈاکٹر خان صاحب کو خون میں لت پت دیکھا لیکن استغاثہ کے پاس کوئی ایسا گواہ موجود نہ تھا جس نے ملزم کو قتل کرتے دیکھا ہو۔

استغاثہ کے یہ تینوں گواہ اس وقت موقع واردات پر تب پہنچے جب ڈاکٹر خان صاحب کا مبینہ قاتل قاتلانہ حملے کے بعد 16/ ایکمین روڈ کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ ان حالات میں سلطانی گواہ کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ پولیس نے ایک معروف خاکسار خورشید خالد کو ڈاکٹر خان صاحب قتل کیس میں سلطانی گواہ بنایا۔ جیل کے اندر اس سے اقبالی بیان لکھوایا گیا جس میں اس نام نہاد سازش کا انکشاف ہوا جو ڈاکٹر خان صاحب کے مبینہ قتل کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ جب خاکسار تحریک کا اپنا مخلص کارکن بحیثیت سلطانی گواہ قتل کے متعلق اہم اور سنسنی خیز انکشاف کرے گا تو دنیا حیران

ششدر رہ جائے گی۔

اخبار نویسوں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر خان صاحب قتل کیس کے وعدہ معاف گواہ سے ملاقات کریں۔ اگر سلطانی گواہ سے بات چیت ممکن نہ ہو تو اس بات کی تسلی کر لی جائے کہ پولیس نے بیان دلوانے کے لیے اس کا حلیہ خراب نہیں کیا۔ پولیس افسر اخبار نویسوں سے بڑے تپاک سے ملتے لیکن جب سلطانی گواہ کا تذکرہ ہوتا تو فوراً گفتگو بند کر دیتے۔ جب سے ڈاکٹر خان صاحب قتل ہوئے تھے کسی کو سلطانی گواہ کے ساتھ ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس اخبار نویسوں سے فخریہ کہتی تھی کہ آپ وعدہ معاف گواہ کی زبانی علامہ صاحب کے خلاف بیان سن کر حیران رہ جائیں گے۔ بس ذرا انتظار کیجیے۔

قتل اور دیگر وارداتوں کے مقدمات کی سماعت عموماً عام اور کھلی عدالتوں میں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب کا قتل کیس بھی عام مقدمہ تھا۔ اصولی طور پر یہ مقدمہ پہلے کھلی نچلی عدالت پھر سیشن کورٹ میں زیر سماعت آنا چاہیے تھا لیکن انتظامیہ نے عین موقع پر لاء اینڈ آرڈر کا مفروضہ کھڑا کر دیا۔

آخر طے یہ پایا کہ ڈاکٹر خان صاحب کیس کی سماعت لاہور سینٹرل جیل کے ایک کمرے میں کی جائے۔ پہلے اسپیشل مجسٹریٹ پھر لاہور کے سیشن جج صحافیوں کو جیل میں داخل ہونے کا اجازت نامہ جاری کریں۔ جن اخبار نویسوں کو اجازت نامے جاری کیے گئے ان میں ''پاکستان ٹائمز'' کے شمیم رضوی، ''اے۔ پی۔ پی'' کے فاروق نثار، ''کوہستان'' کے سعادت خیالی، ''نوائے وقت'' کے یحییٰ جاوید اور ٹائمز آف کراچی کے راقم الحروف شامل تھے۔

استغاثہ کی طرف سے ایک سینئر سرکاری وکیل، خان عشتاق احمد خاں اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی طرف سے اعجاز بٹالوی بطور وکیل صفائی پیش ہوئے۔ انھیں دو جونیئر وکلاء کا تعاون حاصل تھا۔ پہلے اس مقدمے کی سماعت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایم۔ ایف۔ رضوی کی عدالت میں ہوئی۔ انھوں نے مختصر سماعت کے بعد مقدمہ سیشن کے سپرد کر دیا۔

جب ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کا مقدمہ سیشن کورٹ میں پیش ہوا تو پاکستان سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس انوار الحق لاہور کے سیشن جج تھے۔ شیخ صاحب نہ صرف اخبار نویسوں کو جانتے تھے بلکہ مجھ سے ان کی خاصی یاد اللہ تھی۔ جب لاہور ہائی کورٹ میں بطور جج ان کا تقرر ہوا تو سب سے پہلے میں نے خان بشیر الدین احمد سابق چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ کی موجودگی میں ترقی کی خوشخبری سنائی تھی۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قاتل، عطا محمد کا کردار حیرت انگیز تھا۔ جب ملزم عدالت میں حاضر ہوتا تو اس کی جھولی میں موتیا اور گلاب کے پھول ہوتے۔ جیب خوشبودار الائچیوں سے بھری ہوتی۔ وہ کٹہرے میں کھڑا ہونے سے پہلے ایک ایک اخبار نویس سے ہاتھ ملاتا اور ان میں پھول اور الائچیاں تقسیم کرتا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران امریکا کی ایک خاتون اخبار نویس الزبتھ بھی ہماری ٹیم میں شامل ہو گئی۔ یہ محترمہ ایشیا اور بالخصوص برصغیر کے سماجی اُمور پر کتاب لکھنا چاہتی تھیں۔ وہ ایشیا میں زیر سماعت مقدمات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عطا محمد اس خوبرو امریکی خاتون کو باقاعدگی سے پھولوں کا تحفہ پیش کیا کرتا۔

امریکی خاتون برا ماننے کے بجائے وارفتگی سے پھولوں کو سونگھتی اور اس قیمتی تحفے کو اپنے پرس میں محفوظ کر لیتی۔ ان کی دیانتدارانہ رائے تھی کہ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی میں اس قدر ہنس مکھ ملزم نہیں دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکا اور انگلستان کے ملزم عموماً بڑے کرخت ہوتے ہیں۔ وہ اخبار نویسوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔

ڈاکٹر خان صاحب قتل کیس کے ملزم کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس نے ایک مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا ہے اور اس کی یہ کارروائی تا قیامت یاد رکھی جائے گی۔ ملزم کو یقین تھا کہ اگر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس نے عدالت میں پولیس کے حسب منشاء بیان دیا تو سزائے موت ہونے پر بھی سکندر مرزا اسے معاف کر دیں گے۔

ایک روز ملزم میرے اور ''پاکستان ٹائمز'' کے شمیم رضوی کے پاس کھڑا تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل تقریباً بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا اور بڑی گھبراہٹ کے عالم میں کہا: ''ملک صاحب! سامنے کمرے میں چلیے۔ آپ کے لیے فون ہے۔''

ملک صاحب نے پوچھا: ''ہمیں ٹیلیفون پر کون یاد کر رہا ہے؟''

جواب ملا: ''پریذیڈنٹ سکندر مرزا!'' ملزم کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ خوشی اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنی حرکات سے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میرا کیا مقام ہے۔

جس روز جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودودیؒ کی گواہی تھی، فاضل جج نے مجھے اپنے ریٹائرنگ روم میں بلایا اور بتایا کہ وہ مقدمے کی صحیح نوعیت جاننا چاہتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ کھرے اور سچے مسلمان ہیں۔ ان کی گواہی میں کوئی کھوٹ نہیں ہوگا اور قتل کے واقعات معلوم کرنے میں مدد ملے گی۔ اس سے قانون کا تقاضا پورا ہوگا۔

یہ برصغیر کا ایک دلچسپ اور اہم مقدمہ تھا۔ ایک سیاسی جماعت، پاکستان ری پبلکن پارٹی کا سربراہ، ڈاکٹر خان قتل ہو چکا تھا۔ پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹی، خاکسار تحریک کے لیڈر اور بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکے تھے۔ پاکستان کی تیسری پارٹی، جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ گواہی کے لیے عدالت میں طلب کیے گئے تھے۔ بیک وقت پاکستان کی تین سیاسی جماعتیں عدالت میں کھڑی تھیں۔ ایسے واقعات تاریخ میں کم ہی ہوئے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ چاہتے تو مدمقابل جماعت خاکسار تحریک کے سربراہ کو پھنسا اور الجھا سکتے تھے۔ ان کی گواہی کو بڑی اہمیت حاصل تھی، مگر انھوں نے عدالت میں خدا لگتی بات کہی۔ بقول ان کے نہ انھوں نے درس کے موقع پر ملزم کا چہرہ دیکھا نہ کسی رنگ میں خاکسار تحریک کے لیڈر، علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کا تذکرہ ہوا۔ انھیں صرف ایک چٹ کا علم تھا، جو استفسار کے لیے ان کے پاس بھیجی گئی تھی۔

بالآخر اس تاریخ کا سورج طلوع ہوا جب لاہور پولیس نے سلطانی گواہ خوشید خالد کو وہ سنسنی خیز بیانات قلمبند کرانے کے لیے عدالت میں پیش کرنا تھا۔ اس کے چرچے پولیس حلقوں میں سننے میں آ رہے تھے۔ لاہور سیشن کورٹ کے فاضل جج اس مقدمے کو جلد سے جلد نمٹانا چاہتے تھے۔ توقع تھی کہ وعدہ معاف گواہ کی شہادت کے بعد فیصلہ سنا دیا جائے گا اور وہ کمرہ عدالت جس نے بڑی خون آشام روایات کو جنم دیا تھا، ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

دن کے قریباً نو بجے لاہور سینٹرل جیل کے آہنی پھاٹک پر اچانک شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پولیس کی پوری گارڈ جو رائفلوں کے علاوہ سنگینوں سے مسلح تھی، سلطانی گواہ کو اپنے جلو میں لیے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی جیسے اس پر اچانک حملہ ہونے والا ہو اور وہ ہر ممکن پیش بندی کرنا چاہتی ہو۔ لاہور کے ایس پی مسٹر رندھاوا پولیس دستے سے آگے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس انسپکٹروں کی فوج ظفر موج رواں دواں تھی۔

سلطانی گواہ کو بڑے ڈرامائی انداز میں سیشن کورٹ کے کٹہرے میں لایا گیا۔ جج صاحب نے وعدہ معاف گواہ کی ہتھکڑی کھولنے کا حکم دیا اور گارڈ کے سپاہیوں کو عدالت سے باہر چلے جانے کے لیے کہا گیا۔ جب ابتدائی کارروائی مکمل ہو گئی تو فاضل جج نے سلطانی گواہ کو قسم اٹھا کر حلفیہ بیان دینے کا حکم دیا۔ یہ لمحہ عدالت، پولیس، ملزموں اور قومی پریس کے لیے بڑا نازک تھا۔

میں نے اپنی صحافتی زندگی میں کئی مقدمات کی رُوداد سنی

www.pakistanipoint.com

کیا کروں......!!

☆ایک شخص اپنے دوست سے ملنے گیا دیکھا کہ دوست کچھ اُداس بیٹھا ہے۔ اس نے اداسی کی وجہ دریافت کی تو دوست نے کہا: "کیا بتاؤں بیوی نے آج پچیس ہزار روپے کی ایک ساڑی خریدی ہے، کیا کروں کچھ کہا نہیں جاتا ......!" دوسرے دن وہی شخص جب دوست سے ملنے گیا تو اسے خلافِ توقع بہت ہی خوشگوار موڈ میں پایا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔ اس نے اس تبدیلی اور خوشی کی وجہ دریافت کی تو دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "کل میری بیوی نے جو ساڑی پچیس ہزار روپئے کی خریدی تھی آج وہ تمہاری بیوی کو دکھانے گئی ہے......!!"

نیٹ ورک......!

☆ہمارے بچپن میں نہ 3G تھے نہ 4G، صرف اماں G، ابا G اور استاد G ہوتے تھے اور ایک ہی تھپڑ میں نیٹ ورک آجاتا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اور قلمبند کی ہے لیکن ایسا سناٹا زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جو سلطانی گواہ کی آمد اور بیان شروع ہونے کے موقع پر وہاں چھایا ہوا تھا۔ پولیس والے بڑی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ سلطانی گواہ سے وہ سب کچھ کہلوانا چاہتے تھے جس کا چرچا کیا جارہا تھا۔

آخر سلطانی گواہ نے جرأت مندی سے پہلے علامہ صاحب پھر قومی پریس کی طرف دیکھا۔ اس نے پوری طاقت سے سلیوٹ مارا اور اس کی آواز کمرۂ عدالت میں گونجی:

"میرے امیر اور قومی پریس کو میرا سلام پہنچے۔"

اس آواز کے ساتھ ہی اخبار نویسوں کی انگلیاں حرکت میں آگئیں۔ سلطانی گواہ کا بیان قلمبند ہونے لگا۔ خورشید خالد نے حلف اُٹھانے کے بعد تشدّد کے وہ طریقے بیان کیے جو اس سے بیان دلانے کے لیے برتے گئے تھے۔ انھوں نے علامہ صاحب پر کیے گئے تشدّد کے جو واقعات بیان کیے، انھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

جب سلطانی گواہ کے بیان میں حیرت انگیز روانی آئی تو پولیس کے تمام بڑے افسر کمرۂ عدالت سے باہر نکل گئے۔ سرکاری وکیل، خان مشتاق احمد خاں، حکومت کا نمائندہ ہونے کے باوجود بڑے دردمند انسان تھے۔ وہ اپنی کرسی پر پتھر کی مورت بنے سلطانی گواہ کا بیان سن رہے تھے۔

کمرہ عدالت میں ہر شخص حیران و ششدر اور ہر چیز دم بخود تھی۔ بیان کے دوران ذرا سا التواء ہوا تو باہر سے اطلاع آئی کہ ایک موٹر کار ملزم کو لے گئی ہے۔

سلطانی گواہ کی شہادت کے بعد فاضل جج نے قریباً ایک گھنٹہ کے وقفہ سے فیصلہ صادر کر دیا۔ انھوں نے باآواز بلند کہا:

"علامہ صاحب کی ہتھکڑی کھول دی جائے۔ استغاثہ ان کے خلاف قتل کا جرم ثابت نہیں کرسکا۔ البتہ مقدمے کے ملزم عطا محمد کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت سزائے موت دی جاتی ہے۔"

◆◆◆

سلیم انور

آخری شرط

ایک ذہین وکیل کا عجب فسانہ، وہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا تھا مگر پھر...

کیری ہرمن سیارہ زہرہ کے زیریں علاقے میں رہنے والا ایک وکیل تھا۔ آج وہ اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے زہرہ کے فضائی موسمی اسٹیشن میں داخل ہوا۔ برک مکنٹائر ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ زیادہ تر اسی پرواز کرتے ہوئے موسمی اسٹیشن پر ہوتا۔ اپنی خودکار کرسی پر بیٹھے ہوئے اس کے کانوں پر باریک تار کی طرح مائیکرو اسپیکر اور منہ کے سامنے اسی طرح کا مائیکروفون لگا ہوا تھا۔

وہ موسمی اسٹیشن سے ٹکرانے والی ہواؤں کی آواز سن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ زہرہ کے موسم کا تجزیہ بھی کر رہا تھا۔ اسے بہترین سپر کمپیوٹر اور دیگر میکانکی آلات کی مدد حاصل تھی۔ خشک خوراک بھی اچھی خاصی مقدار میں یہاں موجود تھی۔ وقتاً فوقتاً ادارے کے افراد یہاں خوراک فراہم کرتے رہتے تھے۔

''تمہارے پاس دس منٹ اور ہیں۔'' ہرمن بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کتنی مشکل سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔''

مکنٹائر اپنے بھاری جسم اور بڑی آنکھوں کے ساتھ مخصوص دانشورانہ انداز میں بولا: ''مشکل؟ لگتا ہے کہ تم زیریں علاقے کے باشندے اپنے ''جنتی باغ'' کو خوب استعمال کر چکے۔ تب ہی ایسی بات کر رہے ہو۔ دس منٹ بعد ہم انتہائی بلندی پر ہوں گے، اس صورت میں نیچے جانے پر کھوجی پارٹیوں کو تمہاری ہڈیاں تک ایک جگہ نہیں ملیں گی۔''

ہرمن بے یقینی کے عالم میں ہنسا: ''میں تو صرف ایک جھٹکے سے اچانک یہاں آیا ہوں۔ میری زندگی کا ایک اہم قاعدہ بھی یہ ہے کہ جو کام کرنا ہو بالکل اچانک کرو۔ اسی لیے میرا وجود اس قدر بے چین رہتا ہے۔''

Nasir Azeem
www.pakistanipoint.com

''اور تم بہت جلد قبرستان میں ہو گے۔'' مکنٹائر نے جواب دیا۔

''درحقیقت تم ناعاقبت اندیش ہو۔'' ہرمن بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ ''تم بھی تو بہت بور انسان ہو۔ تم میرا مذاق اُڑانے کے بجائے مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ کہ تم اس قدر گوشہ نشین کیوں ہو؟ آخر تم کرتے کیا ہو؟''

''میں اپنی میز پر ہوتا اور موسمی ڈیٹا تیار کرتا ہوں۔ یہ سب ڈیٹا میں نیچے شہر میں قائم موسمیاتی مرکز کو نشر کر دیتا ہوں۔ یہاں اسٹیشن پر ایک مشاہداتی مشین موجود ہے، جو مجھے مختلف باتوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ ہم یہاں پر جو دماغ استعمال کرتے ہیں، وہ حرفِ آخر ہے۔ یہ مشاہدات حاصل کر کے انھیں واضح کرتا ہے۔ آسان حسابات میں تبدیل کرتا اور اس طرح بالکل صحیح نتائج اخذ کر کے ہمیں مطلع کر دیتا ہے۔ میرا کام ان تمام نتائج کے ذریعے موسم کی ایک تصویر بنانا ہے۔ یہ تصویر مکمل کر کے میں زیریں علاقے کی جانب بھیج دیتا ہوں۔

مزید یہ کہ دماغ (کنٹرول سسٹم) حرارت اور روشنی کے پلانٹ بھی چلاتا ہے۔ یہ خودکار طور پر اسٹیشن کی مرمت بھی جانچتا رہتا ہے۔ یہ ہدایات سنتا اور ان میں رہ جانے والی خامیوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اس میں ایک علیحدہ حصہ نظریاتی مسائل حل کرتا ہے۔''

''گویا یہ ایک چھوٹا سا دیوتا ہوا۔ کوئی غلطی نہیں، ناقابلِ شکست۔'' ہرمن بے یقینی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ''بالکل، تم یہ کہہ سکتے ہو۔'' مکنٹائر نے جواب دیا۔

ہرمن نے کہا: ''چھوڑو یار، کوئی مشین بھی مکمل نہیں۔ صرف بے انتہا باریک تاروں پر مشتمل اور انسان کے بنائے ہوئے ہزاروں پیغامات لیے ہوتی ہیں۔''

مکنٹائر اس مشین کی حمایت میں بولا: ''یہ پیم کنکشن کے استعمال سے اپنے اندر نظم وضبط قائم رکھتی ہے۔ اس میں کوئی تار نہیں۔ مرمت خودکار طور پر انجام پاتی ہے۔ اس مشین میں اتنا کام ہوتا ہے کہ جیسے بہت وسیع ادارہ ہو۔ اس میں بیس مختلف حصے ہیں جو مختلف کام کرتے ہیں لیکن ہر حصہ بیک وقت بھی تمام اسٹیشن کو سنبھال سکتا ہے۔ حرارتی نظام سے حسابی عمل تک، سارا کام یہ مشین خود کرتی ہے۔ اگر صرف ایک حصے کا مشاہدہ کرو گے، تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ اسٹیشن کا دماغ کتنا زیادہ کام کرتا ہے۔ یہ دماغ ہر طرح کے حالات سے نمٹ سکتا ہے۔''

''ہوں۔'' کیری ہرمن نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کوئی بات ایسی ہوگئی، جو اس دماغ کے بیسیوں حصوں پر بھاری ہوئی تو کیا یہ مشین خود کو تباہ نہیں کر لے گی، یا پھر چپ ہو کر بیٹھ جائے گی۔''

''اسے بھول جاؤ کیری، انسان تو کیا دیوتاؤں کے بس میں بھی اس مشین کی کارکردگی متاثر کرنا نہیں۔ کوئی چیز بھی اسے اس کی فرائض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔''

ہرمن کی آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ بولا: ''اگر میں تمہاری مشین کو چکرا دوں تو؟''

''زیادہ سنجیدہ مت ہو کیری۔ اگر تم یہ سوچتے ہو کہ توڑ پھوڑ مچا یا غلط بٹن دبا کر اس مشین کو دھوکا دے سکتے ہو، تو میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی اور طریقے سے تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔''

''میں تم سے پانچ ہزار کریڈٹس کی شرط لگاتا ہوں۔'' ہرمن دھیمے لہجے میں بولا، ''اگر تم مجھے صرف ایک منٹ کے لیے اس مشین کے ساتھ تنہا چھوڑ دو تو میں اسے بے کار کر دوں گا۔''

''کیری، مجھے علم ہے کہ پانچ ہزار کریڈٹس میری سالانہ تنخواہ کے برابر ہیں مگر پھر بھی میں تم سے قطعاً کوئی شرط لگانا نہیں چاہتا۔ تم اس مشین کی پشت پر موجود ٹیکنالوجی سے ذرا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بھی واقف نہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں اتنا پُریقین کیوں ہوں۔ شرط لگانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں، مگر یہ سراسر تم پر ڈاکا ہوگا۔'' مکنٹائر نے ہرمن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''شرط اب بھی موجود ہے۔'' ہرمن نے جیسے کوئی اثر نہیں لیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' مکنٹائر بھی غصے میں آ گیا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ عدم ادائیگی کے مقدمات بھگتو اور اپنی بے عزتی کرواؤ تو مجھے یہ شرط منظور ہے۔''

ہرمن، مکنٹائر کے پیچھے چلتا ہوا سٹنگ روم سے باہر آ گیا، جس کی کھڑکی سے باہر سفید آسمان جھانک رہا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ دھاتی دیواروں والی ایک راہداری میں آ گئے۔ راہداری کے سرے پر ایک بڑا کمرا موجود تھا۔ اس کی دیواریں اور دروازہ سب کچھ شیشے کے تھے۔

مکنٹائر یہاں آ کر رک گیا۔ ''وہ رہی مشین۔'' اس نے شفاف دیوار کے پار ایک سمت اشارہ کیا۔ ''اگر تمہیں مشین سے کوئی بات کرنی ہے تو وہاں بنی جالی کے سامنے جا کر بولنا۔ لیکن میں تمہیں ایک تنبیہہ کر دوں کہ اگر تمہارے ذہن میں اب بھی توڑ پھوڑ کا کوئی خیال ہے تو اسے ترک کر دو، کیونکہ حرارت اور روشنی کے نظام میں کوئی ایمرجنسی کنٹرول نہیں۔ یہ نظام ایک چھوٹے ایٹمی ری ایکٹر سے چلتے ہیں، جسے قابو کرنا صرف اس مشین کے بس میں ہے۔''

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی چیز تباہ نہیں کروں گا۔ دیکھو نہ میرے دائیں ہاتھ میں کچھ ہے اور نہ بائیں ہاتھ میں۔ نہ ہی میں نے اپنے کپڑوں میں کوئی چیز چھپائی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر ہرمن نے اپنے ہاتھ اُوپر کر دیے۔

''جلدی جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے ساتھ کافی پینا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری شکست پر دعوت ہو جائے۔'' مکنٹائر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر ہرمن شفاف دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے، سن نہیں سکتے تھے۔ مکنٹائر نے سگریٹ سلگایا اور ہرمن کو دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مشین کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مکنٹائر نے سوچا کہ آدھ منٹ بعد ہی وہ باہر نکل کر اپنی شکست تسلیم کرے گا۔ ہرمن کی ایک عادت مکنٹائر کو سب سے زیادہ کھلتی تھی۔ وہ کسی کو برتر ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ پُرسکون انداز میں سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مکنٹائر نے سوچا کہ اب ہرمن اس مشین کو برتر ماننے پر مجبور ہو جائے گا جو اس کی یقینی شکست اور میری فتح ہوگی۔

سارے نظام اس قدر پُرسکون تھے، جتنا کہ مکنٹائر خود، اسے اپنی جیت کا یقین تھا۔ تیس سیکنڈ گزر گئے اور صرف تیس سیکنڈ باقی رہ گئے۔

مکنٹائر اپنے خیالوں میں مست تھا کہ اچانک اسٹیشن کی تمام روشنیاں بجھ گئیں اور حرارتی نظام بند ہو گیا۔ ایٹمی ری ایکٹر بے کار ہو گیا۔ ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور دیگر مواصلاتی نظام بالکل مردہ ہو گئے۔

راہداری میں ہلکی سی لال روشنی اور انٹر کام صرف اس لیے چل رہے تھے کہ ان کا تعلق ایک علیحدہ بیٹری سے تھا۔ مکنٹائر کنٹرول پینل پر آیا اور چیخا: ''کیری تم نے مشین کے ساتھ کیا کیا؟''

''فکر نہ کرو، مشین اب بھی مکمل طور پر آپریٹ کی جا سکتی ہے۔'' ہرمن نے جواب دیا۔

مکنٹائر تیزی سے کمپیوٹر پینل پر جھکا تاکہ مشین کو سارے نظام بحال کرنے کی ہدایت دے، لیکن پینل خود بھی بے جان تھا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا؟'' وہ ہرمن پر چیخا۔

''پہلے تم میری فتح تسلیم کرو، پھر میں یہ سب تمہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں شکست کھا چکا۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اقوال زریں

"جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں، کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔" (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

جس کسی نے مجھے ایک لفظ بھی پڑھایا، وہ میرا استاد ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ)

"جو علم دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے، علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔" (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ)

"جب خلقت کے پاس آؤ تو زبان کی نگہداشت کرو۔" (حضرت لقمان)

"اللہ تعالیٰ نے اشیا کی حقیقت کا علم تم سے چھپالیا ہے۔ اس لیے کوئی چیز تمہیں اچھی لگے یا نہ لگے، اس کے خلاف نہ کہو۔ (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

"بعض اوقات اللہ کا بندے کی درخواست کو قبول نہ کرنا بندے پر شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

"دین کی اصل عقل، عقل کی اصل علم اور علم کی اصل صبر ہے، لہٰذا صبر کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑو۔" (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

''تمہاری مشین کام کے اعتبار سے تو بہترین ہوسکتی ہے، مگر منطق کے لیے بے کار ہے۔ ایک معمولی سے تناقص نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔''

مکنٹائر بھونچکا رہ گیا۔

''ہاں تناقص نے۔ یہ میرے منطق کے نصاب میں شامل چھوٹا سا حصہ ہے، اپی مندیس کا تناقص۔ جب تم باہر میرا انتظار کر رہے تھے تو میں نے مشین کے پاس جا کر کہا: ''جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، تم اسے مسترد کر دینا کیونکہ میرا ہر بیان جھوٹا ہے۔''

مشین نے میرا جملہ سنا اور فیصلہ کیا کہ اسے مسترد کر دے، لیکن اگر وہ میری بات درست مانتی تب ہی ایسا کر سکتی تھی۔ حالانکہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ جھوٹ ہے۔ یعنی اگر مشین میرا جملہ درست مانتی تو وہی جملہ اسے مسترد کرنا پڑتا۔ اور اگر وہ میرا جملہ مسترد کرتی، تو وہی جملہ اسے درست ماننا پڑتا۔ تمہاری مشین میرے بیان میں اُلجھ کر رہ گئی اور اس کے اندرونی نظام بیکار ہو گئے، کیونکہ تمام ہدایات شاید یہی ''دماغ'' جاری کرتا ہے۔''

مکنٹائر نے شدید غصے کے عالم میں کہا: ''تم نے مشین تو بے کار کر دی مگر اب وہ کام کس طرح کرے گی؟ جبکہ وہ بالکل گونگی، بہری اور اندھی ہو چکی۔''

پورے اسٹیشن پر سناٹا چھا گیا۔ زہرہ پر ہواؤں کے جھکڑ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے۔ آوازیں بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں۔ دونوں نے خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اسٹیشن کا درجۂ حرارت بڑی تیزی سے گرتا جا رہا تھا۔

◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نصیر احمد سلیمی

قائد کے سچے ترجمان

پروفیسر شریف المجاہد بھی اپنے اس ابدی سفر پر روانہ ہوئے جس پر ہم سب ہی کو جلد یا بدیر جانا ہے۔ رب کریم اپنی کریمی سے ان کی تین نسلوں کی علمی و تحقیقی شعبے میں تربیت اور ملّی و قومی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے، بشری کمزوریوں اور لغزشوں سے درگزر کا معاملہ فرما کر ان کی قبر کو اپنے نور سے بھر دے اور روزِ حشر شافع محشر کے دستِ مبارک سے آبِ کوثر سے سرفراز کردے۔ (آمین)

پروفیسر شریف المجاہد کی ذات برصغیر کی جدید تاریخ میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کا معتبر حوالہ ہی نہیں بلکہ قائداعظم کی قیادت میں حصول پاکستان کی تاریخ ساز جدوجہد میں شامل آخری چشم دید گواہ کی بھی ہے۔ مرحوم ایک ایسے ماہر تعلیم، محقق، مصنف اور مستند تاریخ دان تھے جنہوں نے شعوری زندگی کا ایک ایک لمحہ تعلیم و تدریس، تحقیق و تصنیف میں صرف کیا۔ ان کے شاگردوں اور اکتساب فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو ملک اور بیرون ملک اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔

یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ جس نے دلجمعی سے ان سے اکتساب فیض کیا وہ ان کے دبستان سے کندن بن کر نکلا۔ پروفیسر شریف المجاہد کو بین الاقوامی سطح پر اعلیٰ ترین علمی و تحقیقی درس گاہوں کی شہرت رکھنے والے اداروں میں برصغیر میں آزادی کی چلنے والی تحریکوں پر مستند محقق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی رحلت سے پاکستان ایک بلند قامت علمی و تحقیقی شخصیت سے محروم ہوگیا۔ اُن جیسی علمی قدوقامت کا کوئی دوسرا شخص دور دور تک نظر نہیں آتا۔ وہ چورانوے برس کی عمر میں شدید علالت اور کولہے کی ہڈی ٹوٹنے کے سبب معذوری اور شدید علالت کے باوجود لکھنے پڑھنے کی مصروفیات سے جڑے رہے جس سے ان کے علمی انہماک اور تحقیقی ذوق و شوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر شریف المجاہد کو جنہوں نے تعلیم و تربیت اور تحقیق و تصنیف کا کام کرتے دیکھا ہے، وہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ فنافی

ایک منفرد محقق و مورخ کا دلنشیں تذکرہ جو سیاری زندگی فنافی العلم رہے

العلم اور فنافی التحقیق تھے۔ وہ یکم جولائی 1926ء کو مدراس (اب چنائے) کے ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو ملّی اور قومی تحریکوں کی سرگرمیوں میں متحرک اور فعال تھا۔ ان کی والدہ کے ماموں تحریکِ خلافت کی مدراس شاخ کے رضاکاروں کے کمانڈر تھے۔ خود شریف المجاہد کا بیان ہے کہ انھوں نے 13 سال کی عمر میں اخبارات کے مطالعے سے آزادی کی تحریکوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی تھی۔

انھوں نے پھر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1941ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں ہوا تھا' اس وقت پروفیسر شریف المجاہد مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن مدراس کے جوائنٹ سیکرٹری تھے اور اسی حیثیت میں انھوں نے 1941ء کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ یہ ان کی قائداعظم سے پہلی ملاقات تھی۔ شریف المجاہد قائداعظم کی سیاسی بصیرت اور فہم و فراست سے حد درجہ متاثر تھے۔ ان کے نزدیک یہ قائداعظم کی بصیرت ہی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ اجلاس جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں پر مشتمل الگ وطن کا مطالبہ کیا جانے والا تھا' وہ 1940ء میں مسلم اکثریتی صوبے کے صدر مقام لاہور میں منعقد ہوا۔

ایک سال بعد 1941ء میں مطالبے کی رائے عامہ سے تائید کے لیے مسلمانوں کے اقلیتی صوبہ مدراس کا انتخاب کیا گیا جہاں پاکستان نہیں بننا تھا۔ قائداعظم کی اس بصیرت نے حصول پاکستان کی تحریک کو برصغیر کے تمام مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کے محور و مرکز میں تبدیل کر دیا۔ ابتدا میں اس تحریک کا زیادہ زور ان علاقوں میں ہوا جو مسلم اکثریتی علاقے نہیں تھے۔

پروفیسر شریف المجاہد نے 1945 کے زمانہ طالب علمی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ قبل ازیں ان کے بڑے بھائی اخبارات و جرائد میں تحریک پاکستان کے حق میں مضامین لکھ رہے تھے۔ ان کا پورا گھرانا حصول پاکستان کی جدوجہد میں شامل تھا۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میں عملی طور پر فعال اور متحرک ہونے کے باوجود شریف المجاہد نے تعلیم کے تمام مدارج امتیاز کے ساتھ مکمل کیے۔ ان کے علمی و فنی کمالات و محاسن کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کالم میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ اور دبستان تھے۔ وہ ایسی علمی و تحقیقی شخصیت تھے، جن پر بلا مبالغہ یہ بات صادق آتی ہے کہ کسی تعلیمی و تحقیقی ادارے کا سربراہ ہونا ان کے لیے اعزاز نہیں تھا بلکہ اس ادارے کے لیے یہ اعزاز تھا جس کے سربراہ وہ رہے۔ انھوں نے 1949ء میں مدراس یونیورسٹی سے (جو برصغیر کی اعلیٰ ترین جامعات میں شمار ہوتی تھی) بی اے آنرز کیا۔ اور 1950ء میں تاریخ میں ایم اے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان آ گئے۔

پاکستان آنے سے پہلے ہی وہ اخبارات و جرائد کے لیے لکھتے رہے۔ پاکستان آنے کے بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ساتھ بطور نمائندہ خصوصی وابستہ رہے۔ ایک سال بعد فل برائٹ اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے۔ 1952ء میں جہاں سے انھوں نے اسٹینڈ فوڈ یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے کم ریکارڈ مدت میں یعنی صرف 9 ماہ میں ایم اے جرنلزم کی تعلیم مکمل کی۔ جب کہ میک گل یونیورسٹی کینیڈا سے 1954ء میں ایم اے اسلامک اسٹیڈیز کی ڈگری حاصل کی جہاں کچھ عرصہ وہ تدریس اور مختلف اخبارات و جرائد سے وابستہ رہے۔

1955ء میں پاکستان واپس آ کر جامعہ کراچی میں شعبہ ابلاغ عامہ کے بانی چیئرمین کی حیثیت سے تدریس کا آغاز کیا جہاں 1976ء میں قائداعظم اکیڈمی کے بانی سربراہ کے طور پر اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ شب و روز کی محنت سے اس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ادارے کو بین الاقوامی سطح کی تحقیقی اداروں کے صف میں لا کھڑا کیا۔

پروفیسر شریف المجاہد (مرحوم) نے براڈر یونیورسٹی اور بفلیو کی اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں بحیثیت وزیٹنگ ایشین پروفیسر جنوبی ایشیا کے موضوع پر تدریس کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اپنے دیرینہ دوستوں پروفیسر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (مرحوم) ڈاکٹر انوار حسین صدیقی (جو اُس وقت وائس چانسلر تھے) اور پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد (مرحوم) کی خواہش پر اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کچھ وقت گزارا۔

ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ''Quaid-i-Azam Studies in Interpretation:Jinnah'' (قائداعظم ایک توضیحی مطالعہ) قائداعظم پر شائع ہونے والی کتابوں میں اہل علم کے نزدیک سب سے زیادہ مستند کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس پر انھیں صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ ان کی دیگر اہم تصانیف میں انڈین سیکولرازم اور بنیادی حقوق ہے جس کا عربی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کی دیگر انگریزی تصانیف اور درجنوں مقالات جو بین الاقوامی تحقیقی جرنلز میں شائع ہوئے تھے عربی، فرانسیسی، ملاوی، پرتگیزی اور ہسپانوی زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر شریف المجاہد کی ایک بڑی اہم خوبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے قائداعظم کی شخصیت کو جیسی تھی، ویسے ہی اجاگر کیا۔ انھوں نے قائداعظم کی تقاریر اور بیانات سے ان کے نظریہ سیاست کو مرتب کر کے پاکستان کی وہ حقیقی تصویر پیش کر دی جو بانیٔ پاکستان کے پیش نظر تھی۔ وہ بار بار یہ بات لکھتے اور کہتے رہے کہ قائداعظم کے ویژن کے مطابق پاکستان ایک فلاحی اسلامی جمہوری ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا ہے اور یہی نظریہ پاکستان ہے۔ مرحوم کی تحقیق کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے جہاں تحریک پاکستان کے عوامل کا علمی اور تاریخی تجزیہ کیا، وہاں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کا معاشرتی اور نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔

قائداعظم کی حیات و خدمات کا جب بھی تاریخ میں تذکرہ کیا جائے گا تو اسے مرتب کرنے والوں میں پروفیسر شریف المجاہد کا نام سرفہرست ہوگا۔ پروفیسر شریف المجاہد نے ہی قائداعظم کی ۱۱ اگست 1947ء والی تقریر کے بارے میں پیدا کیے جانے والے ابہام کو دور کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ اس کا مطالعہ کریں تو یہ میثاق مدینہ کے بنیادی تصور کا عملی پرتو ہے۔

یہ انہی کی جرأت تھی کہ انھوں نے بعض نادان افراد کی طرف سے ''اسم پاکستان کے خالق'' چودھری رحمت علی (مرحوم) کے کردار پر غلط پروپیگنڈے پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہا تھا کہ جس طرح قائداعظم سے یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ یہ ملک اُن کی قیادت میں حاصل کیا گیا ہے اسی طرح چودھری رحمت علی سے بھی یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ قائداعظم کے پاکستان کے اِسم کے خالق چودھری رحمت علی ہیں۔

پروفیسر شریف المجاہد نے بھرپور زندگی گزاری۔ اپنی طویل عمری میں انھوں نے اپنے وقت کا نہایت مفید استعمال کیا۔ خود کو فنافی العلم اور فنافی التحقیق رکھا۔ ان جیسی شخصیت جس نے اپنی محنت اور ریاضت سے علم و تحقیق کی دنیا میں کارہائے نمایاں کیے، مشکل سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی سے اہلِ علم کے لیے سیکھنے اور سمجھنے کے ہزار پہلو ہیں۔ خداوند تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے اور شریف المجاہد جیسی مایہ ناز شخصیت کے کارناموں کو سراہنے اور ان کی قدر کرنے کا جذبہ عطا فرمائے۔ (آمین) ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سُنہرا ناتا

سعادت حسن منٹو

"آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر یہ واقعہ جو میں آپ کو سنانے والا ہوں، بالکل صحیح ہے۔"

یہ کہہ کر شیخ صاحب نے بیڑی سلگائی۔ دو تین زور کے کش لے کر اسے پھینک دیا اور اپنی داستان سنانا شروع کی۔ شیخ صاحب کے مزاج سے ہم واقف تھے، اس لیے ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ درمیان میں ان کو کہیں بھی نہ ٹوکا۔ آپ نے واقعہ یوں بیان کرنا شروع کیا:

گولڈی میرے پاس پندرہ برس سے تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کا رنگ سنہری مائل تھا۔ بہت ہی حسین کتا تھا۔ جب میں صبح اس کے ساتھ باغ کی سیر کو نکلتا تو لوگ اس کو دیکھنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لارنس گارڈن کے باہر میں اسے کھڑا کر دیتا اور کہتا:

"گولڈی کھڑے رہنا یہاں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں باغ کے اندر چلا جاتا۔ گھوم پھر کر آدھے گھنٹے بعد واپس آتا تو گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا ہوتا۔ اسپنیل ذات کے کتے عام طور پر بڑے اطاعت

ایک بے زبان کا حیران کن قصہ جس کی مانگی دعا بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگئی

گزار اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ مگر میرے گولڈی میں یہ صفات بہت نمایاں تھیں۔

جب تک اسے اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دوں نہیں کھاتا تھا۔ دوست یاروں نے میرا مان توڑنے کے لیے لاکھوں جتن کیے مگر گولڈی نے ان کے ہاتھ سے ایک دانہ تک نہ کھایا۔ ایک روز اتفاق کی بات ہے کہ میں لارنس کے باہر اسے چھوڑ کر اندر گیا تو ایک دوست مل گیا۔ گھومتے گھومتے کافی دیر ہوگئی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی لے گیا۔ مجھے شطرنج کھیلنے کا مرض تھا۔ بازی شروع ہوئی تو میں دنیا مافیہا بھول گیا۔ کئی گھنٹے بیت گئے۔ دفعتہً مجھے گولڈی کا خیال آیا۔ بازی چھوڑ کر لارنس کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا تھا۔ مجھے اس نے عجیب نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو:

''دوست، تم نے آج اچھا سلوک کیا مجھ سے۔''

میں بے حد نادم ہوا چنانچہ آپ یقین جانیں میں نے شطرنج کھیلنا چھوڑ دی۔ معاف کیجیے گا۔ میں اصل واقعے کی طرف ابھی تک نہیں آیا۔ دراصل گولڈی کی بات شروع ہوئی تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق مجھے جتنی باتیں یاد ہیں، اسے سنا دوں۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ میرے مجرد رہنے کا ایک باعث اس کی محبت بھی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ آنے والی سوتن بن کر اُسے نکال دے گی۔

کئی بار میں نے سوچا، اگر میں مر گیا تو یہ کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ کچھ دیر میری موت کا اثر اس پر رہے گا۔ اس کے بعد مجھے بھول کر اپنے نئے آقا سے محبت کرنا شروع کر دے گا۔ جب میں یہ سوچتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے اپنی موت کی آمد کا پورا یقین ہو گیا تو گولڈی کو ہلاک کر دوں گا۔ آنکھیں بند کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔

گولڈی کبھی ایک لمحے کے لیے مجھ سے جدا نہیں ہوا۔ رات کو ہمیشہ میرے ساتھ سوتا۔ میری تنہا زندگی میں وہ ایک روشنی تھی۔ میری بے حد پھیکی زندگی میں اس کا وجود ایک شیرینی تھا۔ اس سے میری غیر معمولی محبت دیکھ کر کئی دوست مذاق اڑاتے تھے:

''شیخ صاحب گولڈی کتیا ہوتی تو آپ نے ضرور اس سے شادی کر لی ہوتی۔''

ایسے ہی کئی اور فقرے کسے جاتے لیکن میں مسکرا دیتا۔ گولڈی بڑا ذہین تھا۔ اس کے متعلق جب کوئی بات ہوتی تو فوراً اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ میرے ہلکے سے ہلکے اشارے کو بھی وہ سمجھ لیتا تھا۔ میرے موڈ کے سارے اتار چڑھاؤ اسے معلوم ہوتے۔ اگر کسی وجہ سے رنجیدہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ چہلیں شروع کر دیتا۔ مجھے خوش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا۔ ابھی اس نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا نہیں سیکھا تھا یعنی ابھی کم سن تھا کہ اس نے ایک برتن کو جو خالی تھا، تھوتھنی بڑھا کر سونگھا۔ میں نے اسے جھڑکا تو دم دبا کر وہیں بیٹھ گیا۔

پہلے اس کے چہرے پر حیرت سی پیدا ہوئی تھی نہیں یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ دیر تک گردن نیوڑھائے بیٹھا رہا جیسے ندامت کے سمندر میں غرق ہے۔ میں اٹھا۔ اٹھ کر اس کو گود میں لیا۔ پیار اچکارا۔ بڑی دیر بعد جا کر اس کی دم ہلی۔ مجھے بہت ترس آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے ڈانٹ دیا۔ اس روز رات گئے تک غریب نے کھانے کو منہ نہ لگایا۔ وہ بڑا حساس کتا تھا۔

میں بہت بے پروا آدمی ہوں۔ میری غفلت سے اس کو ایک بار نمونیہ ہو گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے پاس دوڑا۔ علاج شروع ہوا مگر اثر ندارد۔ متواتر سات راتیں جاگتا رہا۔ اُسے بہت تکلیف تھی۔ سانس بڑی مشکل سے آتا تھا۔ جب سینے میں درد اٹھتا تو وہ میری طرف دیکھتا جیسے یہ کہہ رہا ہو:

''فکر کی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

www.pakistanipoint.com

کئی بار میں نے محسوس کیا کہ صرف میرے آرام کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تکلیف کچھ کم ہے۔ وہ آنکھیں میچ لیتا تاکہ میں تھوڑی دیر آنکھ لگالوں۔ آٹھویں روز خدا خدا کر کے اس کا بخار ہلکا ہوا اور آہستہ آہستہ اتر گیا۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں تیرتی نظر آئی۔ نمونیے کے ظالم حملے کے بعد دیر تک اس کو نقاہت رہی۔ لیکن طاقت ور دواؤں نے اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ ایک لمبی غیر حاضری کے بعد لوگوں نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا تو طرح طرح کے سوال کرنے شروع کیے:

''عاشق و معشوق کہاں غائب تھے اتنے دنوں؟''

''آپس میں کہیں لڑائی تو نہیں ہوگئی تھی؟''

''کسی اور سے تو نظر نہیں لڑ گئی تھی گولڈی کی''

میں خاموش رہا۔ گولڈی یہ باتیں سنتا تو ایک نظر میری طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا کہ بھونکنے دو کتوں کو۔ وہ مثل مشہور ہے: کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر بہ کبوتر باز بہ باز۔ لیکن گولڈی کو اپنے ہم جنسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دنیا صرف میری ذات تھی۔ اس سے باہر وہ کبھی نکلتا ہی نہیں تھا۔

گولڈی میرے پاس نہیں تھا جب ایک دوست نے مجھے اخبار پڑھ کر سنایا۔ اس میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ آپ سنیے بڑا دلچسپ ہے۔ امریکہ یا انگلستان مجھے یاد نہیں کہاں، ایک شخص کے پاس کتا تھا۔ معلوم نہیں کس ذات کا۔ اس شخص کا آپریشن ہونا تھا۔ اُسے ہسپتال لے گئے تو کتا بھی ساتھ ہولیا۔ اسٹریچر پر ڈال کر اس کو آپریشن روم میں لے جانے لگے تو کتے نے اندر جانا چاہا۔ مالک نے اس کو روکا اور کہا، باہر کھڑے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ کتا حکم سن کر باہر کھڑا ہو گیا۔

اندر مالک کا آپریشن ناکام ثابت ہوا۔ اس کی لاش دوسرے دروازے سے باہر نکال دی گئی۔ کتا کئی ماہ تک وہیں کھڑا اپنے مالک کا انتظار کرتا رہا۔ پیشاب پاخانے کے لیے کچھ دیر وہاں سے ہٹتا۔ پھر وہیں کھڑا ہو جاتا آخر ایک روز موٹر کی لپیٹ میں آ گیا اور بُری طرح زخمی ہوا۔ مگر اس حالت میں بھی وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں پہنچا جہاں مالک نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ آخری سانس اس نے اسی جگہ لیا۔

یہ بھی لکھا تھا کہ ہسپتال والوں نے اس کی لاش میں بھس بھر کے اُسے وہیں رکھ دیا جیسے وہ اب بھی اپنے آقا کے انتظار میں کھڑا ہے۔ میں نے یہ داستان سنی تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اوّل تو مجھے اس کی صحت ہی کا یقین نہیں تھا۔ لیکن جب گولڈی میرے پاس آیا اور مجھے اس کی صفات کا علم ہوا تو بہت برسوں کے بعد میں نے یہ داستان کئی دوستوں کو سنائی۔ سناتے وقت مجھ پر رقت طاری ہو جاتی اور میں سوچنے لگتا: ''میرے گولڈی سے بھی کوئی ایسا کارنامہ وابستہ ہونا چاہیے۔ گولڈی معمولی ہستی نہیں۔''

گولڈی بہت متین اور سنجیدہ تھا۔ بچپن میں اس نے تھوڑی شرارتیں کیں مگر جب اس نے دیکھا کہ مجھے پسند نہیں تو ان کو ترک کر دیا۔ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر لی جو تادمِ مرگ قائم رہی۔

''میں نے تادمِ مرگ کہا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔'' شیخ صاحب رک گئے انکی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ ہم خاموش رہے۔ تھوڑے عرصے بعد انھوں نے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کہنا شروع کیا:

یہی میری زیادتی ہے کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن شاید اس لیے زندہ ہوں کہ انسان ہوں۔ مر جاتا تو شاید گولڈی کی توہین ہوتی۔ جب وہ مرا تو رو رو کر میرا بُرا حال تھا۔ لیکن وہ مرا نہیں تھا میں نے اس کو مروا دیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی موت کی آمد کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ایسا پاگل نہیں جیسا کہ عام پاگل کتے ہوتے ہیں۔ اس کے مرض کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اس کو سخت تکلیف تھی۔ جانکنی کا سا عالم اس پر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

طاری تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا، اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کو مروادو۔

میں نے پہلے سوچا نہیں۔ لیکن وہ جس اذیت میں گرفتار تھا، مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں مان گیا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں برقی جھٹکا پہنچا کر ہلاک کرنے والی مشین تھی۔ میں ابھی اپنے نحیف دماغ میں اچھی طرح کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ وہ اس کی لاش لے آئے..... میرے گولڈی کی لاش۔ جب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو میرے آنسو ٹپ ٹپ اس کے سنہرے بالوں پر گرنے لگے جو پہلے کبھی گرد آلود نہیں ہوئے تھے۔

ٹانگے میں اسے گھر لایا۔ دیر تک اس کو دیکھا کیا۔ پندرہ سالہ رفاقت کی لاش میرے بستر پر پڑی تھی۔ قربانی کا مجسمہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کو نہلایا۔ کفن پہنایا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ زمین میں دفن کروں یا جلادوں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے کیوں اس کو غرق دریا کرنا چاہا۔ میں نے اس کے متعلق اب بھی کئی بار سوچا ہے مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

خیر میں نے ایک نئی بوری میں اس کی کفنائی ہوئی لاش ڈالی۔ دھودھا کر بٹے اس میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب کشتی دریا کے درمیان میں پہنچی اور میں نے بوری کی طرف دیکھا تو گولڈی سے پندرہ برس کی رفاقت و محبت بہت ہی تیز تلخی بن کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں نے اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کانپتے ہاتھوں سے بوری اٹھائی اور دریا میں پھینک دی۔ بہتے ہوئے پانی کی چادر پر کچھ بلبلے اٹھے اور ہوا میں حل ہوگئے۔ کشتی واپس ساحل پر آئی۔ میں اتر کر دیر تک اس طرف دیکھتا رہا جہاں میں نے گولڈی کو غرقِ آب کیا تھا۔ شام کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا جیسے وہ گولڈی کو اپنی گود میں سلا رہا ہے۔

یہ کہہ کر شیخ صاحب خاموش ہوگئے۔ چند لمحات کے بعد ہم میں سے ایک نے ان سے پوچھا:

''لیکن شیخ صاحب آپ تو خاص واقعہ سنانے والے تھے۔''

شیخ صاحب چونکے: ''اوہ معاف کیجیے گا۔ میں اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ میں ابھی عرض کرتا ہوں:

پندرہ برس ہوگئے تھے ہماری رفاقت کو۔ اس دوران میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ میری صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی، لیکن جس دن میں نے گولڈی کی پندرھویں سالگرہ منائی اس کے دوسرے روز میں نے اعضا شکنی محسوس کی۔ شام کو یہ اعضا شکنی تیز بخار میں تبدیل ہوگئی۔ رات سخت بے چین رہا۔ گولڈی جاگتا رہا۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے مجھے دیکھتا رہتا۔ پلنگ پر سے اتر کر نیچے جاتا۔ پھر آکر بیٹھ جاتا۔ زیادہ عمر ہوجانے کے باعث اس کی بینائی اور سماعت کمزور ہو گئی تھی لیکن ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ چونک پڑتا اور اپنی دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا اور جیسے یہ پوچھتا:

''کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

اس کو حیرت تھی کہ میں اتنی دیر تک پلنگ پر کیوں پڑا ہوں، لیکن وہ جلد ساری بات سمجھ گیا۔ جب مجھے بستر پر لیٹے کئی دن گزر گئے تو اس کے سالخوردہ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتا تھا۔ بیماری کے آغاز میں تو میں اس کو کھانا دیتا رہا۔ جب نقاہت بڑھ گئی تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ وہ صبح شام گولڈی کو کھانا کھلانے آجایا کرے۔ وہ آتا رہا مگر گولڈی نے اس کی پلیٹ کی طرف منہ نہ کیا۔

میں نے بہت کہا لیکن وہ نہ مانا۔ ایک مجھے اپنے مرض کی تکلیف تھی جو دور ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے گولڈی کی فکر تھی جس نے کھانا پینا بالکل بند کردیا تھا۔ اب اس نے پلنگ پر بیٹھنا لیٹنا بھی چھوڑ دیا۔ سامنے دیوار کے پاس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کمبل میرے لیے ہے

ایک بار ہندوستان کے ممتاز علمائے کرام، مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا ابوالکلام آزاد اکٹھے ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نوجوان تھے اور برصغیر میں مشہور نہیں ہوئے تھے۔ گاڑی کے جس ڈبے میں داخل ہوئے، وہاں کوئی خالی نشست نہ پا کر مولانا آزاد نے اپنے کندھے سے کمبل اتار کر فرش پر بچھا دیا اور بولے: "آیئے مفتی صاحب، تشریف رکھیے۔"

مفتی صاحب نے حیرت سے کہا: "مولانا، اتنا قیمتی اور عمدہ کمبل آپ نے فرش پر بچھا دیا!"

مولانا نے کہا: "مفتی صاحب، کمبل میرے لیے ہے، میں کمبل کے لیے نہیں۔"

سارا دن اور ساری رات خاموش بیٹھا اپنی دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہتا۔ اس سے مجھے اور بھی دکھ ہوا۔

وہ کبھی ننگی زمین پر نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا لیکن نہ مانا۔ وہ بہت زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غم واندوہ میں غرق ہے۔ کبھی کبھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آتا۔ عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا اور گردن جھکا کر واپس دیوار کے پاس چلا جاتا۔ ایک رات لیمپ کی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ گولڈی کی دھندلی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ اس کے چہرے سے حزن وملال برس رہا تھا۔ مجھے بہت دکھ پہنچا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ لمبے لمبے سنہرے کان ہلاتا وہ میرے پاس آیا۔ میں نے بڑے پیار سے کہا:

''گولڈی میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم دعا مانگو۔ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔''

یہ سن کر اس نے بڑی اداس آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر سر اوپر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا جیسے دعا مانگ رہا ہو۔ کچھ دیر وہ اس طرح کھڑا رہا۔ میرے جسم پر جھرجھری سی طاری ہوگئی۔ ایک عجیب وغریب تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ گولڈی سچ مچ دعا مانگ رہا تھا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں، وہ سرتاپا دعا تھا۔ میں کہنا نہیں چاہتا لیکن تب میں نے محسوس کیا کہ اس کی روح خدا کے حضور پہنچ کر گڑگڑا رہی ہے۔

میں چند ہی دنوں میں اچھا ہو گیا لیکن گولڈی کی حالت غیر ہوگئی۔ جب تک میں بستر پر تھا وہ آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ میں ہلنے جلنے کے قابل ہوا تو میں نے اس کو کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس کو اب کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ دعا مانگنے کے بعد جیسے اس کی ساری طاقت زائل ہوگئی تھی۔ میں کہتا، میری طرف دیکھو گولڈی۔ میں اچھا ہو گیا ہوں۔ خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے، لیکن وہ آنکھیں نہ کھولتا۔

میں نے دو تین دفعہ ڈاکٹر بلایا۔ اس نے انجکشن لگائے پر کچھ نہ ہوا۔ ایک دن میں ڈاکٹر لے کر آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔ میں اٹھا کر اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کو برقی ضرب سے ہلاک کرا دیا۔ مجھے معلوم نہیں بابر اور ہمایوں والا قصہ کہاں تک صحیح ہے لیکن یہ واقعہ حرف بہ حرف درست ہے۔ (6 جون 1950ء) ◆◆◆

www.pakistanipoint.com

ارشاد حسین ناصر

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے

قیام پاکستان کی تحریک اگرچہ بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، مگر اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ 23 مارچ 1940ء کے تاریخ ساز دن ہی پہلی بار بہت بڑے اجتماع میں مسلمانانِ ہند کے علیحدہ وطن کا باقاعدہ مطالبہ سامنے آیا۔ اس کو بانیانِ پاکستان نے لاہور کے تاریخی منٹو پارک (مینار پاکستان گراؤنڈ) میں پوری شدت اور جذبہ و تحریک سے پیش کیا۔ منٹو پارک میں ہونے والا اجتماع آل انڈیا مسلم لیگ کا چونتیسواں سالانہ اجلاس تھا، جو 22 سے 24 مارچ 1940ء کو منٹو پارک میں منعقد ہوا، جسے آج کل گریٹر اقبال پارک کہا جاتا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اجلاس کی صدارت فرمائی، جس میں نواب سر شاہ نواز ممدوٹ نے استقبالیہ خطبہ دیا اور اے کے فضل الحق نے تاریخ ساز قراردادِ لاہور پیش کی۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

''ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نوعیت کا نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس کو اسی لحاظ سے حل کرنا چاہیے۔ جب تک اس اساسی اور بنیادی حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، جو دستور بھی بنا، وہ چل نہیں سکے گا اور نہ صرف

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نئی نسل پر قراردادِ لاہور کا مفہوم و مقصد عیاں کرتا دل افروز قلمی تحفہ

مسلمانوں بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے بھی تباہ کن اور مضر ثابت ہوگا۔''

23 مارچ 1940ء کو لاہور کے وسیع میدان منٹو پارک میں ایک لاکھ انسانوں کے سامنے اور قائداعظمؒ کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے تقسیمِ ہند کی معروف و مشہور قرارداد منظور کی تھی جس نے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام پایا۔ اسی قرارداد کی رو سے پاکستان کی مملکت وجود میں آئی۔ آج جب ہم اس تقریب کی سالگرہ منا رہے ہیں، آیئے اس مبارک دن کی یاد تازہ کریں، جب اسلامیانِ ہند کے نمائندوں نے ایک ساتھ اور جمع ہو کر یہ مصمم، عزم عالیشان باندھا تھا کہ وہ برصغیر میں ایک آزاد و مقتدر سلطنت قائم کر کے رہیں گے۔

21 مارچ کی صبح قائداعظمؒ لاہور تشریف لائے۔ اسی شام غروب آفتاب کے بعد لیگ کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں جنرل سیکرٹری کی رسمی رپورٹ کے بعد ضابطے کے مطابق مجلس انتخابِ مضامین (سبجیکٹس کمیٹی) کے چند ارکان نامزد کیے گئے۔ ان میں پنجاب سے ڈاکٹر محمد عالم اور میاں فیروز الدین احمد کو جگہ ملی۔ سر سکندر مرحوم اس جلسے میں شریک تو ہوئے لیکن خلاف معمول بہت پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے تمام ارکان بھی پچھلی کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ قائداعظمؒ نے لاہور پہنچتے ہی اخباری نمائندوں کو بیان دیا تھا کہ لیگ اس اجلاس میں ایک انقلاب آفرین اقدام کرے گی۔ ان کے اس ارشاد پر طرح طرح کی چہ مگوئیاں اور قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ ہندو اخباروں نے بھی بڑے بڑے حاشیے چڑھائے لیکن بات کی تہ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

قارئین، ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ ''23 مارچ'' کی وطنِ عزیز کی تاریخ میں کیا اہمیت ہے؟ یہ اہم تاریخ دراصل وطنِ عزیز کے عالمی نقشے پر اُبھرنے کے خدوخال ترتیب دینے کا دن ہے۔ یہ اس قرارداد کے منظور ہو جانے کی تاریخ ہے جس کے چند سال بعد ہی مسلمانانِ برصغیر نے عملاً ہندوؤں اور انگریزوں کے ظلم و زیادتیوں سے نجات حاصل کر لی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اکابرین قوم نئی نسل کو بتائیں، سمجھائیں کہ اس قرارداد کا ماخذ کیا تھا؟ مفہوم اور مقاصد کیا تھے تاکہ وہ صحیح معنوں میں تاریخ پاکستان کی تفصیل سے آگاہ ہو سکے۔ انھی نوجوانوں کے لیے اقبالؒ نے کہا تھا کہ فکر و تدبر کیا کرو اور یاد کرو کہ.....

؎ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال نے اس خطے کے نوجوانوں میں عقابی روح بیدار کر دی تھی۔ نتیجے میں انھوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ وہ استعمارِ برطانیہ سمیت متعصب ہندوؤں سے آزادی چھین لینے کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار ہو گئے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی انتھک اور مخلص قیادت میں اپنا تاریخی مطالبہ منٹو پارک میں منظور کرانے والی تحریک صرف سات برس کی قلیل مدت میں کامیاب ٹھہری۔ پاکستان کی شکل میں ایک عظیم اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پہ مُنصّہ شہود پر آ گئی۔

ہمارے تاریخ دان وہ حالات و واقعات سپردِ قلم کر کے نوجوانانِ ملت کی راہنمائی کریں، کیونکر نوبت یہاں تک پہنچی کہ تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا اور دو قومی نظریہ پیش کرنا پڑا۔ ہندو اس دور میں نہایت متعصب ہو گئے تھے۔ موجودہ دور میں بھی ان کا تعصب آسمان کی بلندی چھو رہا ہے۔ مودی دورِ حکومت میں بھارتی مسلمان ظلم و جبر کا شکار ہیں۔ مسلمانانِ ہند آج جن مشکلات کا شکار ہیں، وہ قابلِ بیان نہیں۔ کبھی گائے ماتا کے نام پر ان کا شکار کیا جاتا ہے تو کبھی کسی اور نام پہ۔

ہمیں ان رویوں کا جائزہ ضرور لینا ہوگا، تاکہ ہم اپنی اگلی نسلوں تک اس امانت کو درست طرح سے پہنچا دیں۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے سب سے اہم حقیقت اور حوالہ ہمیں یہ یاد رکھنا ہے کہ قرارداد پاکستان تک پہنچنے کے لیے مسلمان

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

قوم کو تعلیم کی نہایت ضرورت تھی۔ وہ تو خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے سرسید احمد خان کو، جن کی دوررس نگاہوں نے ڈیڑھ صدی پہلے ادراک کر لیا تھا کہ ہندو اور مسلمان قدم قدم پہ جس طرح مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر متصادم ہیں، اس کا واحد توڑ تعلیم کے میدان میں آگے بڑھ کر ہندو اور انگریزوں کے برابر کھڑے ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے پر توجہ صرف کرنا ہے۔ انھوں نے پہلی بار برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ''قوم'' کا لفظ استعمال کیا۔

تجارت کے بہانے برصغیر پر قبضہ کرنے والے انگریزوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو جس طرح بطورِ خاص اپنے عتاب کا نشانہ بنایا، جاگیریں ضبط کیں اور پھانسیوں پر لٹکایا، یہ سب حقائق تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس مسلم کش پالیسی میں ہندوؤں نے بھی جی بھر کر مسلمانوں کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کیا اور کھلم کھلا انگریزوں کا ساتھ دیا، جس کے صلے میں ان پر ملازمتیں اور نوازشیں عام ہوگئیں جبکہ مسلمان بلاواسطہ طور پر ہر سطح پر کچلے گئے۔ وہ تعلیمی و تجارتی لحاظ سے بھی بہت پیچھے تھے۔ ایسے نازک موقع پر سرسید احمد خاں ان کی راہنمائی کے لیے آگے بڑھے، وقتی طور پر انھیں عملی سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور پوری توجہ حصول علم پر مرکوز کرنے کے لیے کہا۔ علی گڑھ تحریک چلائی، سکول اور کالج کھولے، اہم کتابوں کے اُردو ترجمے شائع کیے، سائنٹیفک سوسائٹی بنائی، یوں مسلمان دھڑا دھڑ تعلیم حاصل کرنے لگے۔

یہ ایک دوررس اور طویل المعیاد منصوبہ تھا، تاہم بے حد کامیاب رہا۔ مسلمانوں کو پڑھی لکھی قیادت نصیب ہوئی۔ دیکھا جائے تو یہ تمام کوششیں آخرکار قراردادِ پاکستان تک پہنچنے کے لیے حتمی محرک ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کو قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا تھا، انگریز اور ہندو مل کر ان کا راستہ روک رہے تھے، جبکہ ''ہیوم'' نامی ایک انگریز نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی تاکہ ہندوستان کے عوام انگریزوں سے محاذ آرائی کے بجائے اس سیاسی پلیٹ فارم پر دلوں کا غبار نکال لیا کریں۔ اس جماعت میں بے شمار ہندو شامل ہوگئے۔ جنھوں نے اب اپنی عددی اکثریت کے زور پر اپنی تہذیب وثقافت مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اس پر مسلمان بجا طور پر سیخ پا ہوگئے۔ انھوں نے بھی اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ بنالی، جسے 1913ء میں قائداعظمؒ نے اپنا کر اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انھی کی کوشش سے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان میثاقِ لکھنؤ کے نام سے ایک سمجھوتہ طے پایا، جس کی رو سے پہلی بار کانگرس نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کیا۔

اسی دوران تحریک خلافت بھی شروع کی گئی۔ ''تحریک عدم تعاون'' بھی چلائی گئی۔ یہ تحریک انگریزی مصنوعات اور ان کی تجارت سے بائیکاٹ کے لیے چلی، جس سے انگریز کارخانہ داروں کو بھاری مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ترجیح دینے لگے جبکہ 1928ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوگئی، جس میں جان بوجھ کر ان شقوں کو رد کر دیا گیا، جو مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے تھیں۔ یہ رپورٹ قائداعظمؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے۔ اس پر ہندوؤں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور فرقہ وارانہ فسادات شروع کر دیے۔

غالباً اسی میں اللہ کی مصلحت تھی کہ علامہ اقبالؒ نے اس تہذیبی وثقافتی اور مذہبی انتشار کو بنیاد بنا کر 1930ء میں الٰہ آباد کے خطبے میں واضح طور پر دوقومی نظریہ پیش کر دیا اور فرمایا کہ ہندو مسلم ہر لحاظ سے دو الگ قومیں ہیں اور مسلمانوں کو الگ وطن کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ وہ تمام تر حقائق و محرکات تھے، جو 23 مارچ کی قراردادِ پاکستان کی بنیاد بنے۔ یہ جلسہ قائداعظمؒ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں انتہائی باریک بینی سے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا جائزہ لیا گیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مسلم لیگ ہر سطح پر تیزی سے متحرک ہوئی اور آخر کار پاکستان بننے کا معجزہ وجود میں آیا۔ اگر ہم اپنی عظیم اور تاریخ ساز مملکت کے وجود کی خاطر دی جانے والی قربانیوں سے آگاہی حاصل کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ پاک سرزمین کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے قیام و وجود کے مقاصد اب بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اتنی تاریخی جدوجہد اور لازوال قربانیوں کا یہ ثمر...... پاکستان آج مسائل کی دلدل میں پھنسا دکھائی دیتا ہے۔ اسے کرپشن اور لوٹ مار کی علامت بنا کر رکھ دیا گیا۔ جس جمہوریت کے لیے قربانیاں دی گئیں، اسے مارشل لاء اور آمر حکمرانوں نے کچھ ہی برسوں بعد دولخت کر دیا۔ طالع آزماؤں کی اقتدار کی ہوس نے ہم سے مشرقی پاکستان جسے آج دنیا بنگلہ دیش کے نام سے پہچانتی ہے، جدا کر ڈالا۔ ہندو بنیے کی سازشوں کا سلسلہ قیامِ پاکستان سے پہلے سے شروع ہوا تھا جو آج تک جاری ہے۔ انھی سازشوں کے نتیجہ میں ہم سے مشرقی پاکستان چھینا گیا۔ اس کے بعد سرزمین پر نفرتوں کے بیج بوئے گئے، تاکہ پاکستانی ایک قوم کے بجائے پنجابی، بلوچی، سندھی، پختون بن کر رہیں۔ اپنی اسلامی و قرآنی شناخت کے بجائے اپنی علاقائی و لسانی شناخت کو اپنائیں اور ٹکڑوں میں بٹ کر اس خطے میں مزید پاکستان بنا دیں، مگر تمام تر سازشوں کے باوجود ہمارے ادارے اور قومی سلامتی کے ذمہ داران اس جانب متوجہ دکھائی دیتے ہیں کہ ایسے عناصر کو کسی صورت کامیاب نہ ہونے دیا جائے، جو ملکی سلامتی کے لیے خطرہ ہوں۔

اگرچہ مشکلات ہیں، تعصب، تنگ نظری، استحصال اور حقوق کی پائمالی کا عمل جاری ہے، مگر یہ پاک سرزمین اپنے قیام کے مقاصد کے لیے اس دنیا کے نقشے پر روز بروز ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنے میں کسی سے بھی پیچھے نہیں۔

خدا کرے کہ دنیا میں امن و استحکام ہو، سلامتی و سکھ ہوں، ہریالی و سبزہ ہو، ہمارے پاک وطن میں بھی ہر سو امن و سلامتی اور چین کا بول بالا رہے، لوگوں کو ان کے حقوق میسر ہوں، عدل و انصاف کا بول بالا ہو، کرپشن اور لوٹ مار کرنے والے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں اور وہ دن اب آ ہی جائے، جب ہم اپنے وطن کی قیادت پر فخر کرسکیں۔ ایسی قیادت جو واقعی علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کی طرح مخلص اور دور بین نگاہیں رکھتی ہو۔ جس کا ویژن ہو، جو دنیا پر حکمرانی کے آداب اور ڈھنگ سے آگاہ ہو، جس میں امتِ مسلمہ کی قیادت کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور جو یہاں کے چپے چپے کی حفاظت کو اپنا ایمان سمجھتی ہو۔ ایسی قیادت کی ضرورت ہے، جو امتِ مسلمہ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے اور اس کا کھویا ہوا مقام دلوانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا سکے۔

پاکستان ایک معجزہ ہے۔ اب ایسی ہی معجزاتی و کرشماتی قیادت کی ضرورت ہے۔ افسوس کہ ہم اس قیادت سے قائداعظمؒ کی وفات کے بعد سے محروم ہیں۔ ستر برس سے ہم آزادی کے گیت گا رہے ہیں، مگر ہماری آزادی کبھی کبھی ادھوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب ہمارا کوئی بونا قسم کا لیڈر اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی استعماری و سامراجی ملک کے سربراہ کے سامنے بھیگی بلی بنا تابع فرمان دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ کیا ہم ایک مسلم ایٹمی طاقت ہیں؟ ایسی ایٹمی قوت کا کیا کرنا جس کے ساتھ غیرت و حمیت اور ویژن و آگہی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ دعا ہے کہ پاکستان اور اس کے باسیوں کی یہ مشکل حل ہو اور قیادت کا بحران ٹل جائے۔ ایک دیانت دار اور اہل قیادت ہی اب اس ملک کی صحیح معنوں میں حفاظت کر سکتی ہے۔ ایسی قیادت کے ہوتے ہوئے ہم میں یگانگت، وحدت، اتحاد اور بھائی چارہ کے گلستان آباد ہو سکیں گے...... انشاء اللہ۔ ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کیبن نمبر 24 کا مسافر

اگاتھا کرسٹی

موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح میں نے اخبار کی سرخیاں دیکھتے ہوئے اپنے سراغ رساں دوست ہرکیول پائرو سے کہا:

''یار، میرا خیال ہے ہمیں اپنا موجودہ پیشہ چھوڑ کر ڈاکا زنی شروع کر دینی چاہیے۔ چوروں نے آج کل کچھ ایسے طریقے ایجاد کر لیے ہیں کہ پولیس ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اب اسی خبر کو دیکھو، لکھا ہے کہ لندن اسکاٹش بینک نے اولمپیا جہاز پر دس ہزار ڈالر کے لبرٹی بانڈ نیویارک بھیجے، لیکن اس سے پہلے کہ جہاز منزل مقصود پہنچے، بانڈ یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔''

پائرو ہنستے ہوئے بولا: ''اچھا، تو تمہارا خیال ہے کہ پولیس اس جرم کا سراغ نہیں لگا سکتی.....؟''

''بھئی تم ہی سوچو، ان حالات میں پولیس بیچاری کیا کرے۔ اسے نجوم کا علم تو ہے نہیں، آخر مجرموں کا پتا چلانے کے لیے تھوڑا بہت سراغ ملنا ضروری ہے۔''

پائرو بولا: ''مصیبت یہ ہے کہ بحری سفر میں میرا جی متلانے لگتا ہے ورنہ میں بآسانی یہ معمہ حل کر سکتا تھا۔''

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر بعد مالکہ مکان کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک عورت جس کا نام ایسی فرکور ہے، ہم سے ملاقات کی خواہشمند ہے۔ پائرہ نے اسے اندر بھیجنے کا اشارہ کیا۔

ملاقاتی عورت کی عمر پچیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ قیمتی لباس، خوبصورت چہرہ۔ گفتگو اور حرکات سے نفاست ظاہر ہوتی تھی۔ پائرہ نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے میرا تعارف کرایا: ''یہ میرے دوست کیپٹن ہیسٹنگز ہیں۔

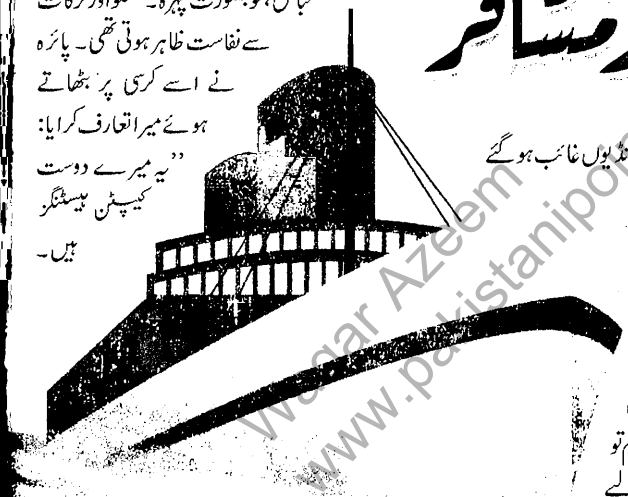

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بحری جہاز سے بیش قیمت بانڈ چُرا لیے گئے مگر پولیس سے شاطر چور کا دامن پکڑا نہ جا سکا

ان کی موجودگی میں آپ بلاتکلف گفتگو کر سکتی ہیں۔ یہ ایک حصے سے میرے شریک کار ہیں۔''

''شکریہ جناب۔'' ایسمی فرکور نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر ذرا سنبھل کر بولی: ''موسیو پائرو، میں آپ سے ایک ضروری معاملے میں مدد لینے حاضر ہوئی ہوں۔ آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہوگا اور اس میں دس ہزار ڈالر کے بانڈ چرائے جانے کی خبر بھی نظر سے گزری ہوگی.....؟''

''جی، جی ہاں، لیکن آپ.....''

''میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرا اس کیس سے براہ راست تعلق نہیں ہے، البتہ مسٹر فلپ رجوائے میرے منگیتر ہیں۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ فلپ رجوائے کون صاحب ہیں.....؟''

''لبرٹی بانڈ مسٹر فلپ کی نگرانی میں تھے۔ اور وہ انھیں لے کر نیو یارک جا رہے تھے۔ ان پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا، وہ ہیں بھی معصوم اور بے قصور، لیکن وہ خود کو ایک طرح سے نقصان کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی طبیعت ضرورت سے زیادہ حساس ہے۔''

''علاوہ ازیں انھیں اپنے چچا سے بھی ڈر لگتا ہے جو بہت خفا ہیں۔ چچا کا خیال ہے کہ فلپ نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ اس نے یقیناً کسی کلب یا ہوٹل میں اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر شیخی بگھاری ہوگی کہ میں دس ہزار ڈالر کے بانڈ لے کر نیو یارک جا رہا ہوں۔ بات پھیل گئی اور چالاک مجرموں کے کسی گروہ نے اس پیشگی اطلاع سے فائدہ اٹھالیا۔''

''مسٹر فلپ کے چچا کیا کرتے ہیں.....؟''

''آپ مسٹر جانسن ویواسر کو نہیں جانتے، لندن اینڈ اسکاٹش بینک کے جنرل مینیجر ہیں۔''

''محترمہ، کیا آپ تفصیل سے واقعہ مجھے سنا سکتی ہیں؟''

''شاید آپ جانتے ہوں کہ لندن اینڈ اسکاٹش بینک کی ایک شاخ امریکا میں کھلنے والی تھی۔ اس مقصد کے لیے ابتدائی سرمائے کے طور پر دس ہزار ڈالر کے لبرٹی بانڈ نیو یارک بھیجنے کا منصوبہ تیار ہوا۔ جنرل مینیجر جانسن نے اس کام کے لیے اپنے بھتیجے فلپ رجوائے کو منتخب کیا۔ فلپ خود اس بینک میں ایک بڑے عہدے پر کام کر رہا ہے۔ وہ اولمپیا جہاز پر سوار تھا جو گزشتہ ماہ 23 تاریخ کو لیور پول کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ بانڈ اس صبح بینک کے دوسرے جنرل مینیجر، مسٹر جانسن کی موجودگی میں اسے دیے گئے۔ اس نے سربمہر لفافہ جس میں بانڈ تھے، فوراً ہی اپنے ٹرنک میں رکھا اور اسے مقفل کر دیا۔''

''کیا ٹرنک میں جوتالا استعمال کیا گیا، بازار سے خریدا گیا تھا؟'' پائرو نے سوال کیا۔

''جی نہیں، اسکاٹش بینک نے یہ تالا خاص طور پر اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر رہی تھی، فلپ نے بانڈ نہایت احتیاط سے دونوں جنرل مینیجروں کے سامنے ٹرنک میں مقفل کیے اور جہاز پر سوار ہوگیا۔ لیکن جہاز کے نیو یارک پہنچنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ لفافہ چرالیا گیا۔ جہاز پر موجود سب مسافروں کی تلاشی لی گئی، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔''

''لیکن بانڈ کہاں اور کیسے غائب ہوگئے.....؟'' پائرو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اخبار میں لکھا ہے کہ مصدقہ اطلاع کے مطابق جہاز کے نیو یارک پہنچنے کے نصف گھنٹہ بعد بازار میں مختلف مقامات پر یہ بانڈ تھوڑی تھوڑی مقدار میں فروخت ہوتے دیکھے گئے۔''

''یہ صحیح ہے، لیکن پولیس کوشش کے باوجود پتا نہ چلا سکی کہ بانڈ فروخت کرنے والے کون لوگ تھے۔ غالباً انھوں نے خطرہ محسوس کر لیا تھا اور کہیں غائب ہوگئے۔''

''مس ایسمی، آپ کا بہت بہت شکریہ، میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کے منگیتر کی مشکل آسان کر سکوں۔ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں.....؟''

''ضرور ملیے، آج دوپہر کا کھانا ہم چیشائر ریستوران

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

میں کھائیں گے، آپ بھی وہاں آ جائیں، تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”آپ مطمئن رہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ پائرہ نے جواب دیا۔

ایسمی کوفر رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت ہم ریستوران پہنچے، تو مسٹر فلپ اور ایسمی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ایسمی نے ہمارا تعارف کرایا اور صبح کی ملاقات کا ذکر کیا۔ فلپ نے بڑی گرمجوشی سے پائرو کا ہاتھ دبایا اور بیرے کو آرڈر دیتے ہوئے بولا:

”موسیو پائرو، میں نہیں جانتا آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ یقین مانیے کہ مجھے کئی راتوں سے نیند نہیں آئی۔“

”آپ فکر نہ کریں، ہم اپنی طرف سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مگر بہتر ہوگا کہ ہم کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں کریں۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی زبان سے مجھے پورا واقعہ سنائیں۔“

”بہت بہتر جناب۔“ فلپ بولا اور ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔

کھانے سے فارغ ہو کر فلپ نے اپنی داستان بیان کی۔ تقریباً وہی باتیں تھیں جو ہم ایسمی فرکور کی زبانی سن چکے تھے۔

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا، تو پائرو نے سوال کیا:

”آپ کو سب سے پہلے اس چوری کا علم کیسے ہوا......؟“

”اس وقت جب میں نے ٹرنک دیکھا جو کیبن سے باہر پڑا تھا۔ حالانکہ میں نے اسے بہت سنبھال کر کیبن میں رکھا تھا۔ ٹرنک کے قفل پر اس طرح کے نشان تھے جیسے کسی نے اسے لوہے کی سلاخ یا اوزار سے کھولنے کی کوشش کی ہو۔“

”کیا قفل ٹوٹ چکا تھا......؟“

”قفل ٹوٹا نہیں تھا، لیکن اس پر جو نشان تھے، ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ شروع میں چور نے کسی اوزار سے کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں شاید اسے ٹرنک کھولنے کا کوئی اور ذریعہ ہاتھ آ گیا۔“

پائرو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا:

”بہت خوب، آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور نہایت احمق واقع ہوا تھا، اس نے اپنے وقت کا خاصا بڑا حصہ ایک ایسے کام پر ضائع کیا جس کا کوئی فائدہ نہ تھا اور پھر اچانک اسے خیال آیا کہ چابی تو اس کے پاس ہے، قفل توڑنے سے کیا فائدہ......؟ نہیں صاحب میں یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا۔“

”لیکن موسیو پائرو، چابی اس کے پاس کہاں سے آئی......؟ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ چابی میرے پاس تھی اور میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنے سے الگ نہیں کیا۔ قفل اس قسم کا تھا کہ اس میں کوئی دوسری چابی نہیں لگ سکتی تھی۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ دنیا میں اس قفل کی صرف ایک ہی چابی ہے؟“

”قفل کی باقی دو چابیاں مسٹر جانسن اور مسٹر شا کے پاس تھیں۔ اس بات کی تک واقعی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب چور کے پاس کوئی ایسی چابی تھی جس سے اس نے بعد میں قفل کھولا، تو پہلے قفل پر زور آزمائی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”مسٹر فلپ آپ صحیح خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ ایک مرتبہ پھر سوچ لیجیے، کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ آپ نے ٹرنک کھلا چھوڑ دیا یا سوتے وقت چابی کہیں رکھ دی ہو۔“

”ہرگز نہیں۔“

”بانڈ ٹرنک میں سے چوری کیے گئے، لیکن انھیں چرانے کے بعد چور کا اگلا قدم کیا تھا؟ آپ نے بتایا ہے کہ

جہاز کے سب مسافروں کی تلاشی لی گئی۔ اس صورت میں چور نے بانڈ کہاں چھپائے اور وہ انھیں لے کر جہاز سے اترنے میں کیسے کامیاب ہوا.....؟''

فلپ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ چور کہاں غائب ہو گیا.....؟ میں نے نیویارک پہنچنے پر سب سے پہلے کسٹم کے حکام کو خبر دی تھی۔ انھوں نے خاص طور پر ہر مسافر کی دوبارہ تلاشی لی۔ وہاں کی پولیس نے بھی جہاز کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن بانڈ ملے نہ ان کا کوئی نشان۔''

''مسٹر فلپ، بانڈ یقیناً کسی لفافے یا پیکٹ میں ہوں گے.....؟''

''جی ہاں، ایک پیکٹ میں تھے۔''

''کیا یہ پیکٹ جوتے، قمیص کے کالر یا بیگ کی تہہ میں چھپایا جا سکتا تھا.....؟''

''جی نہیں، پیکٹ خاصا بڑا تھا۔''

''اور یہ بانڈ جہاز کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے نصف گھنٹہ بعد بازار میں فروخت ہونے لگے.....؟''

''جی ہاں، یہ بات واقعی حیران کن ہے۔ ایک دلال نے تو حلفیہ بیان دیا کہ اس نے جہاز کی آمد سے پہلے بھی چند بانڈ فروخت ہوتے دیکھے۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ جہاز کے لنگر انداز ہونے سے پہلے کچھ مسافر کشتی کے ذریعے ساحل تک پہنچ گئے ہوں؟''

''کچھ لوگ ایک کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی طرف گئے ضرور تھے، لیکن ان کی اکثریت جہاز کے حکام اور پولیس افسروں پر مشتمل تھی۔ ساحل پر ان کی بھی تلاشی لی گئی..... دیکھو پائرو، یہ حادثہ میرے لیے بڑا تکلیف دہ ہے۔ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ میری پوزیشن بہت نازک ہے، خدا کے لیے کچھ کیجیے۔''

''کیا پولیس نے آپ کی تلاشی نہیں لی؟''

اگاتھا کرسٹی

''میں نے خود اصرار کر کے پولیس کو تلاشی دی تھی، اس کے باوجود لوگوں کو شک ہے کہ اس چوری میں میرا ہاتھ ہے۔''

''مسٹر فلپ، بہت بہت شکریہ، اب ہمیں اجازت دیجیے، ہم بینک جا کر آپ کے چچا سے ملنا چاہتے ہیں۔'' پائرو نے کہا۔

فلپ نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور پائرو کو دیتے ہوئے بولا:

''آپ یہ کارڈ چچا کو دیں گے، تو وہ فوراً آپ کو بلوا لیں گے، میری ضرورت پڑے، تو حاضر ہوں۔ جس وقت حکم دیں پہنچ جاؤں گا۔''

☆☆☆

لندن اینڈ اسکاٹش بینک پہنچ کر ہم نے جنرل مینجر کے کمرے میں فلپ کا دیا ہوا کارڈ بھجوایا۔ اگلے ہی لمحے اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ دونوں جنرل مینجر موجود تھے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

انھوں نے خندہ پیشانی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ خاصے عمر رسیدہ تھے۔ مسٹر جانسن کی ڈاڑھی بھی تھی۔ وہ بولے:

''معلوم ہوتا ہے، آپ کی تحقیق خالص ذاتی نوعیت کی ہے، کیونکہ جہاں تک اس چوری کا تعلق ہے، ہم یہ کیس اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور سراغ رساں انسپکٹر میک نیل کے حوالے کر چکے۔ بہرکیف آپ کو فلپ نے بھیجا ہے، اس لیے تشریف رکھیے اور جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیے۔''

''بہت بہت شکریہ جناب۔'' پائرو نے کہا۔

''سب سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس ٹرنک کے لیے خاص قسم کے قفل کا آرڈر کس نے دیا تھا.....؟''

''یہ کام میں نے خود کیا تھا۔ دراصل کام اتنا اہم تھا کہ میں نے کسی ملازم پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔'' مسٹر شا بولے۔

''قفل کی کل کتنی چابیاں بنوائیں گئیں؟''

''تین..... ایک فلپ کو دی گئی تھی، دوسری مسٹر جانسن کے پاس تھی، تیسری میرے پاس۔''

''کیا بینک کے کسی ملازم کو معلوم تھا کہ آخری دو چابیاں کس جگہ رکھی ہیں؟''

''جی نہیں، یہ دونوں چابیاں ہمارے سیف میں تھیں۔ اتفاق سے مسٹر شا دو ہفتے قبل، غالباً اسی روز جب فلپ جہاز پر سوار ہوا، بیمار پڑ گئے تھے۔ ابھی چار دن ہوئے صحت یاب ہو کر آئے ہیں۔''

''گویا جب بانڈ چوری ہوئے، تو دونوں چابیاں آپ کے پاس تھیں.....؟''

''جی ہاں، مجھے یقین ہے چابیاں سیف میں تھیں اور ابھی تک وہیں رکھی ہیں۔''

''کیا آپ ہر روز یہ چابیاں اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دوران میں کوئی ایک چابی غائب ہو گئی ہو۔''

''میں نے ہر روز انھیں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، مجھے یقین ہے چابیاں ابھی تک محفوظ ہیں۔ جس سیف میں چابیاں رکھی تھیں، اس کی چابی میرے یا مسٹر شا کے سوا کسی کے پاس نہیں۔''

مسٹر جانسن نے بات ختم کی، تو مسٹر شا بولے:

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ انہی دنوں میری طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھے دمے کی بیماری ہے۔ اچانک دورہ پڑا اور چھے سات روز بستر سے نہ اٹھ سکا۔ میری غیر موجودگی میں مسٹر جانسن نے بڑی خوش اسلوبی سے سارا کام سنبھالا، لیکن یہ بانڈ نہ جانے کہاں چلے گئے.....؟''

پائرو نے چند سوال اور کیے جن سے اندازہ ہوا کہ وہ مسٹر جانسن اور اس کے بھتیجے کے مابین تعلقات کا جائزہ لے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ فلپ نہایت ایماندار نوجوان ہے اور بینک کے قابل اعتماد افسروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسے کسی طرح کی مالی پریشانی نہیں..... وہ اس واقعے سے قبل کئی بار ایسی ہی بڑی بڑی رقمیں لے کر سفر کرتا رہا ہے۔ آخر میں پائرو نے دونوں منیجروں کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آ گئے۔

☆☆☆

پائرو بجھ سا گیا تھا۔ میں نے پوچھا:

''کیا جوابات سے مطمئن نہیں ہو؟''

''تم غلط سمجھے، قصور جنرل منیجر کا نہیں، میرا ہے جو ایسے کیس ہاتھ میں لینے پر رضامند ہو جاتا ہوں۔ بھائی.....! میں اس کیس سے بڑا مایوس ہوا۔''

''آخر بات کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں سمجھا تھا واقعی مشکل کیس ہے اور شاید نیویارک جانا پڑے، لیکن یہ تو بہت ہی معمولی قصہ ہے۔ چور واقعی احمق ہے، غالباً اس نے زندگی میں پہلی بار یہ حرکت کی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو.....؟ میں تو ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ مجرم کون ہے، تم جانتے ہو بانڈ کس نے چرائے ہیں.....؟''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''ہاں۔''

''کون ہے وہ.....؟''

''اتنی بے صبری اچھی نہیں۔ میں اولمپیا جہاز کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ جونہی اولمپیا ساحل سے آ کر لگے گا، میں چور کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میں نے کمپنی سے پتا کیا ہے، اولمپیا منگل کی صبح لیورپول پہنچ جائے گا۔''

''لیکن تم مجرم کو گرفتار کیوں نہیں کرواتے.....؟''

''میرے دوست، قدرت نے ہر شخص کو ایک جیسا ذہن عطا نہیں کیا۔ مثال کے طور پر انسپکٹر میک نیل اس وقت تک میری بات پر اعتبار نہیں کرے گا جب تک میں ٹھوس ثبوت نہ پیش کر دوں۔''

میں نے بڑی کوشش کی، مگر پائرو نے مزید کچھ کہنے سے انکار کر دیا اور گفتگو کا رخ بدل دیا۔

منگل کی صبح ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے لیورپول کی طرف جا رہے تھے۔ بندرگاہ کے احاطے میں پہنچ کر پائرو نے اولمپیا کے خلاصیوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

ہر خلاصی سے اس نے ایک سوال کیا:

''کیا تم نے جہاز پر کوئی ایسا ناتواں اور کمزور مسافر دیکھا جو گہرے شیشوں کی عینک لگاتا اور سفر کے دوران میں زیادہ تر اپنی کیبن میں رہا ہو۔''

کوئی شخص تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ پائرو نے اپنی کوشش جاری رکھی اور آخر ایک خلاصی سے ہمیں اس شخص کا سراغ مل گیا۔ اس کا نام مسٹر وینٹر تھا اور وہ جہاز کے کیبن نمبر 24 میں مقیم تھا۔

اتفاق سے یہ کیبن مسٹر فلپ کے کیبن سے متصل تھی۔

میں حیران تھا کہ پائرو نے اس مسٹر وینٹر کو کہاں سے تلاش کر لیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے وینٹر کا حلیہ کیسے معلوم ہوا جب کہ زندگی میں کبھی اسے نہ دیکھا تھا۔ میں نے سوچا وہی

کوئل پائرو

شخص مجرم ہوگا۔ اس دریافت نے طبیعت میں جوش پیدا کر دیا۔ ایک خلاصی سے پوچھا:

''کیا مسٹر وینٹر سب سے پہلے جہاز سے اترے تھے.....؟''

''جی نہیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے سب سے آخر میں جہاز چھوڑا۔''

میں نے مڑ کر پائرو کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا:

''یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ اگر وینٹر ہی وہ شخص ہے جس کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں، تو اسے سب سے پہلے جہاز سے اتر کر ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پائرو ہنستے ہوئے بولا: ''ہیسٹنگز، تم بہت بھولے ہو، ہمیشہ غلط خطوط پر سوچتے ہو۔ خلاصی کے آخری جواب سے پتا چل گیا کہ میرے خدشات سو فیصد درست ثابت ہوئے۔''

''وہ کیسے.....؟''

''یہ میں لندن چل کر بتاؤں گا۔''

لیورپول سے واپس لندن آکر پائرو نے کاغذ کے ایک پرزے پر چند سطریں لکھیں اور اسے ایک لفافے میں بند کرتے ہوئے بولا:

''ہم پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ چلیں گے اور یہ لفافہ اپنے ذہین اور قابل دوست انسپکٹر میک نیل کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ریستوران چیشائر میں جائیں گے، ایسی فرکورو وہاں ہماری منتظر ہوگی۔''

''کیا مسٹر فلپ بھی وہاں ہوں گے یا.....؟''

''میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ شروع میں تمہاری طرح میں بھی یہی سمجھا تھا کہ فلپ رجوائے مجرم ہے، لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ وہ بیگناہ ہے۔''

''پھر مجرم کون ہے.....؟''

''ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر پائرو مزے سے سگریٹ پینے لگا۔

حسب توقع مسٹر میک نیل اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دفتر میں نہ مل سکے۔ غالباً وہ اسی کیس پر تحقیقات کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ ہم نے لفافہ ان کی میز پر چھوڑا اور ٹرین کے ذریعے چیشائر ریستوران کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں پائرو بولا:

''اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ چوری کس طرح اور کب ہوئی۔ حالات سے پتا چلتا ہے کہ بانڈ مقفل ٹرنک میں سے اڑائے گئے اور پھر ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ کیونکہ جہاز میں سب مسافروں کی تلاشی لینے کے باوجود ان کا پتا نہ چل سکا۔ لیکن ہوا میں تحلیل ہونے والی بات اس سائیٹفک دور میں قبول نہیں کی جاسکتی، لہٰذا دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں:

''اول یہ کہ بانڈ جہاز میں کسی جگہ چھپا دیے گئے، دوم یہ کہ انھیں سمندر میں پھینک دیا گیا۔''

''میں سمجھ گیا، تمہارا مطلب ہے چور نے بانڈ موم جامے میں لپیٹے اور کسی کارک کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینک دیے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، اگر بانڈ سمندر میں پھینک دیے جاتے، تو اولمپیا کے پہنچتے ہی انھیں نیویارک میں کیونکر فروخت کیا جاسکتا تھا۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟''

''میرے دوست، جہاز کے نیویارک پہنچنے کے نصف گھنٹہ بعد بانڈ فروخت ہونے لگے اور ہم یہ تسلیم کر چکے کہ بانڈ سمندر میں نہیں پھینکے گئے اور نہ کسی مسافر کے پاس تھے۔ کیونکہ ہر مسافر کی دوبارہ تلاشی لی گئی۔ اس کا مطلب یہ کہ بانڈ سرے سے اس ٹرنک میں تھے ہی نہیں۔''

''وہ کیسے.....؟''

''آخر فلپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ٹرنک میں بانڈ تھے؟ اسے سربمہر پیکٹ ملا تھا اور اس نے کھولے بغیر ٹرنک میں رکھ لیا۔ ہوسکتا ہے پیکٹ خالی ہو یا اس میں سادہ کاغذ بھرے ہوں۔ اب اس بات پر غور کرو کہ بانڈ نیویارک کسی طرح پہنچے، کیونکہ اگر وہ اولمپیا جہاز پر نہ تھے، تو کسی اور ذریعے سے نیویارک پہنچے ہوں گے۔

''میں نے جہاز راں کمپنیوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ جس روز اولمپیا جہاز لیورپول سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا، اسی روز ایک دوسرے جہاز ''جائی جنٹک'' نے بھی نیویارک جانے کے لیے سفر کا آغاز کیا تھا۔ جائی جنٹک تیز رفتار جہاز ہے، وہ اولمپیا سے ایک دن پہلے نیویارک پہنچ گیا۔ چنانچہ ہمارے پاس اس بات کا یقین کرنے کی خاصی وجوہ موجود ہیں کہ بانڈ دراصل جائی جنٹک جہاز کے ذریعے نیویارک پہنچے۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''بہت خوب، پھر کیا ہوا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہر بات واضح ہے۔ واقعات میرے نظریے کی تائید کر رہے ہیں۔ سر بمہر پیکٹ محض ایک فریب تھا۔ بانڈ بینک کے دفتر ہی میں غائب کر دیے گئے تھے اور تم بخوبی سمجھ سکتے ہو کہ دونوں منیجر یعنی مسٹر جانسن اور مسٹر شا بآسانی یہ کام انجام دے سکتے تھے۔ لیکن قیاس یہ بتاتا ہے کہ ان میں سے ایک نے بانڈ چرائے اور جائی جنٹک جہاز کے ذریعے نیویارک بھیج دیے۔ وہاں کسی خاص دلال کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جونہی اولمپیا جہاز ساحل پر پہنچے، بانڈ مارکیٹ میں فروخت کر دیے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس دلال نے بے احتیاطی سے کام لیا اور اولمپیا کی آمد سے پہلے ہی بانڈ فروخت کرنے لگا۔ بہرکیف ڈراما مکمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک شخص اولمپیا جہاز پر چوری کی مصنوعی واردات کرے۔''

''وہ کیوں.....؟''

''اس لیے کہ اگر یہ واردات نہ کی جاتی تو فلپ نیویارک پہنچ کر بانڈ والا پیکٹ کھولتا اور اسے پتا چل جاتا کہ پیکٹ خالی ہے۔ اس صورت میں وہ یقیناً دو شخصوں کو مجرم سمجھتا جنہوں نے اسے سربمہر پیکٹ دیا تھا۔ ظاہر ہے چور، جو ظاہری زندگی میں یقیناً شریف اور معزز ہے، یہ پسند نہ کرتا تھا کہ اس پر شبہ کیا جائے۔ چنانچہ کیبن نمبر 24 کے اس پُراسرار مرد مسٹر وینٹر نے اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ ٹرنک کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے موقع ملتے ہی ٹرنک کھولا اور وہ پیکٹ جس میں بانڈ کے بجائے سادہ کاغذ بھرے تھے، نکال کر سمندر میں پھینک دیا اور قفل پر چند ایسے نشان لگا دیے جس سے ہر شخص یہ سمجھے کہ اسے کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاز ساحل پر پہنچا، تو وہ پُراسرار مرد اطمینان سے اترا اور اپنی راہ لی۔ ظاہر ہے اداکاری کے لیے گہرے شیشوں والی عینک کی ضرورت تھی تاکہ کوئی اسے بآسانی شناخت نہ کر لے۔ علاوہ ازیں اس نے خود کو بوڑھا اور بیمار بھی ظاہر کیا ہوگا تاکہ کھانے کے کمرے میں یا باہر کھلی جگہ آنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے کیبن ہی میں چھپا رہے۔ تم نے دیکھا کہ میں نے یہ خصوصیات بیان کیں، تو خلاصیوں نے فوراً اس شخص کی نشاندہی کر دی۔''

''نیویارک اتر کر اس نے کیا کیا.....؟''

''وہاں اسے کوئی خاص کام نہیں تھا، بانڈ فروخت کرنے سے جو رقم ملی، وہ محفوظ جگہ رکھوا کر وہ اگلے جہاز سے لندن آ گیا۔''

ریل رک گئی تھی۔ پائرو جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور پلیٹ فارم پر اترتے ہی بے تابی سے پوچھا: ''آخر وہ کون تھا.....؟''

''یہ پُراسرار آدمی وہی شخص تھا جس کے پاس ٹرنک کی چابی تھی، جس نے مخصوص قفل تیار کرایا اور بیماری کا بہانہ کر کے لندن سے غائب ہو گیا تاکہ جائی جنٹک کے ذریعے نیویارک جا سکے۔''

''تمہارا مطلب بینک کے جنرل منیجر مسٹر شا سے ہے.....؟''

''سو فیصد۔''

میں اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ◆◆◆

قابلِ غور

تین کام کسی کے دل میں آپ کی عزت کو بڑھاتے ہیں.... سلام کرنا، کسی کو جگہ دینا، اچھے نام سے پکارنا۔

دولت، رتبہ اور اختیار ملنے سے انسان بدلتا نہیں اس کا اصلی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔

خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش رہے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محسن فارانی

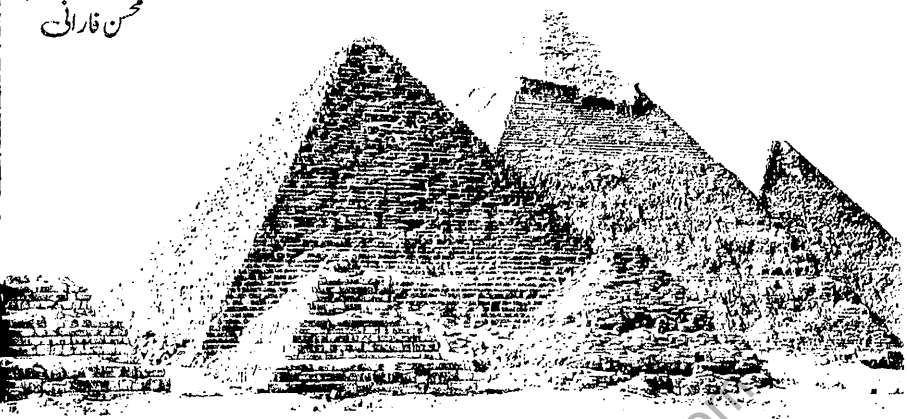

قدیم مصر کے عجائبات

مصر شمالاً جنوباً وادیٔ نیل کے اس حصے پر مشتمل ہے جو بحیرۂ روم میں نیل کے ڈیلٹا سے اسوان اور وادی حلفا (سوڈان) تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں مصر بحیرۂ احمر (بحیرہ قلزم) کے ساحل تک چلا جاتا ہے اور مغرب میں اس کی حدود لیبیا تک وسیع ہیں۔ دریائے نیل کے مشرق میں ساحل بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ صحرائے شرقیہ واقع ہے جبکہ مغرب میں وسیع و عریض صحرائے غربیہ جو دراصل عظیم افریقی صحرائے اعظم (The Sahara) کا مشرقی حصہ ہے۔ صحرائے غربیہ میں سیوہ، فرافرہ اور الداخلہ اور الخارجہ نامی واحات (نخلستان) ہیں۔ لیبیا کی سرحد پر بحر الرمال الاعظم (ریت کا بحرِ اعظم) نامی ریگستان واقع ہے۔ شمال مشرق میں صحرائے سیناء بھی مصر میں شامل ہے۔

قدیم مصری زبان میں اس علاقے (وادیٔ نیل) کو کیمٹ (Kemet) کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''سیاہی مائل زمین''۔ اس کے برعکس نیل کے مغرب میں صحرائے غربیہ میں بکھری پہاڑی چٹانیں نکلتے سورج کی روشنی کے انعکاس سے گلابی نظر آتی تھیں، اس لیے صحرا کو ڈیشرٹ (deshret)، یعنی ''سرخ زمین'' کہا گیا۔ غالباً اسی سے ریگستان کے لیے لاطینی لفظ ڈیزرٹس (desertus) اور انگریزی ڈیزرٹ (desert) وجود میں آئے۔ وادیٔ نیل کی پوری لمبائی ساڑھے پانچ سو میل (900 کلومیٹر) ہے۔ جنوب میں اس کی چوڑائی کا اوسط بارہ میل کے قریب ہے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پونے تین ہزار سالہ فرعونی ادوار میں دنیا کی ایک اولین تہذیب پروان چڑھ رہی تھی

ابتدا میں وادی کے دو حصے تھے: ایک ڈیلٹا، یعنی مصر زیریں (Ta-Mehu)، دوسرا اصل وادی، یعنی مصر بالا یا مصر صعید (Shemau)۔ بادشاہ مینس کے زمانے (3100 ق م) میں دونوں کے اتحاد سے متحدہ سلطنت وجود میں آئی۔ اس سے پہلے دونوں حصوں میں دو جداگانہ سلطنتیں قائم تھیں۔ پانچویں صدری ق م کے یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے مصر کو ''عطیۂ نیل'' قرار دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا

یہ ایک صحرائی خطہ ہے۔ مصر کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ مصر کے مجموعی رقبے کا چھے فیصد ہے۔ اسے ارض فیروز کہا جاتا ہے۔ جزیرہ نمائے سینا کا سیاسی و تہذیبی مرکز شہر عریش ہے۔ یہ جزیرہ نما دو صوبوں اور تین منطقوں میں منقسم ہے۔ شمال میں مرکز عریش، وسط میں بلاذیہ (جس کا مرکز نخل ہے)، جنوب میں مرکز طور جہاں بلند پہاڑ واقع ہیں، جن میں جبل موسیٰ (بلندی 2285 میٹر) اور جبل کترینہ (سینٹ کیتھرائن) نمایاں ہیں۔ جبل کترینہ مصر کا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی 2638 میٹر ہے۔ دیر سینٹ کیتھرائن اسی پہاڑ پر ہے۔ یہ قدیم گرجا گھر مخطوطوں سے مالا مال ہے۔ اسے رومی بادشاہ جسٹینین نے 527ء میں تعمیر کیا تھا۔

قدیم فراعنہ اور اہرام مصر

پہلے شاہی خانوادے کے بانی شاہ مینس نے 3100 ق م کے لگ بھگ دریائے نیل کے مغربی کنارے پر دارالسلطنت ممفس (Memphis) کی بنیاد رکھی تھی۔ پہلا فرعون شاہ مینس ہی کو کہا جاتا ہے۔ 2890 ق م میں دوسرے خانوادے کا آغاز ہوا اور پھر 2686 ق م میں تیسرے خانوادے سے قدیم بادشاہت شروع ہوئی۔ مصر قدیم میں شمسی سال 365 دن کا مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے اجرا کی اغلب تاریخ 2781 ق م ہے۔ تحریر کا کام تصویروں سے لیا جاتا تھا، پھر کچھ نشانات مقرر ہوگئے۔ ہیرو غلفی (Hierogylphic) اور شکستہ خط کا دستور ابتدائی زمانے

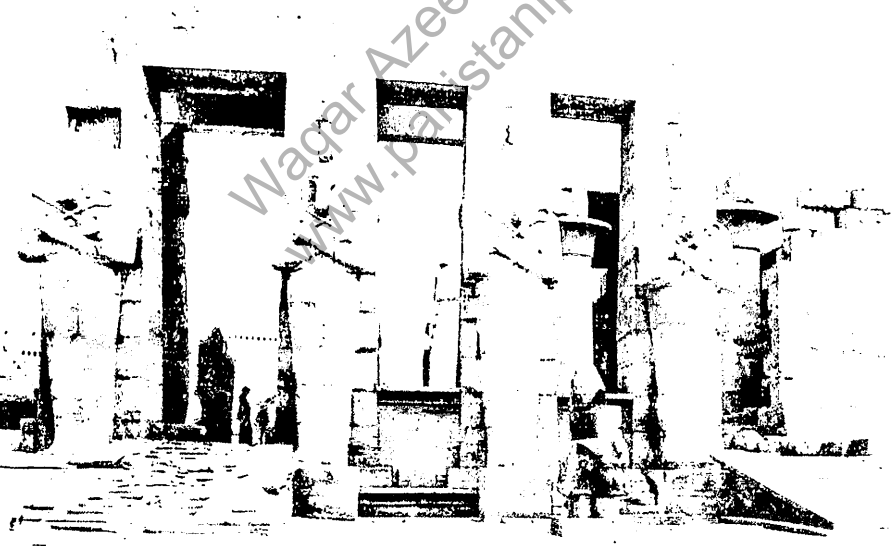

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے چلا آتا تھا۔ ہیروغلفی تصویری رسم الخط تھا۔ قدیم بادشاہی کے دور (2686 تا 2100 ق م) میں فرعون کو خدا مانا جاتا تھا، زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ لفظ فرعون ''پراؤ'' (Per-o) یعنی ''خانوادۂ اعظم'' سے مرکب ہے۔ اولیں فرعونوں کے معماروں نے شمالی مصر میں جیزہ اور سقارہ میں بڑے بڑے اہرام، شاندار ستونوں والے محل اور مندر تعمیر کرنے شروع کیے۔ (انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 37-35/2)

جیزہ میں فرعون خوفو (Khufu) کا ہرم سب سے بڑا ہے۔ یہ 486 فٹ (148 میٹر) اونچا اور تقریباً 23 لاکھ حجری سلوں سے بنا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض سلیں 14 ٹن تک وزنی ہیں۔ اس کا اصل دروازہ زمین سے 15 میٹر کی بلندی پر ہے۔ نیچے ایک دروازہ ہے جسے سیاح استعمال کرتے ہیں۔ وہ خلیفہ مامون الرشید کے حکم پر بنایا گیا۔ صدر دروازے سے ایک راہداری تہ خانے کو اور دوسری اوپر گرینڈ گیلری کی طرف نکلتی ہے۔ گیلری ''شاہی چیمبر'' میں کھلتی ہے۔ گیلری کی راہداری 8.5 میٹر اونچی اور 47 میٹر لمبی ہے۔ مصری بادشاہوں کی نعشوں کو خاص مسالے لگا کر اہرام میں دفن کیا جاتا تھا اور ان کے مقبروں میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ زندگی کے دیگر لوازمات بھی رکھے جاتے تھے۔ مصریوں کے خیال کے مطابق موت کے بعد روح کا ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اجسام کو محفوظ کر کے اور زندگی کے لوازمات ساتھ رکھ کر وہ اس روحانی سفر میں جسم کو بھی ساتھ دینے کے قابل بنا رہے ہیں۔

مصری دیوتا اور آفتاب پرستی

ابتدائی زمانے میں ہر شہر کا اپنا دیوتا تھا اور ان میں سے اکثر کی شکلیں مختلف جانوروں کی سی تھیں۔ چند اہم دیوتاؤں کے نام تاہ، اتوم، ہورس (Horus)، آمون (Amon) یا آمن، اوسیرس (Osiris) اور رع (Rayre) تھے۔ سورج کی زندگی بخش خوبیوں کے باعث کئی شکلوں کے دیوتا اس سے منسوب تھے۔ دیوتا ''خیپری'' کھٹمل کی شکل کا تھا اور وہ چڑھتے سورج کی نمائندگی کرتا۔ دیوتا، رع باز کی شکل کا تھا، البتہ آتن (Aten) کی شکل سورج کے قرص کی تھی۔ ہورس مصر کا شاہی دیوتا تھا، اس کی شکل عقاب کی تھی۔ پہلے اُسے آسمانوں کا دیوتا مانا جاتا تھا، پھر سورج دیوتا کہنے لگے۔ رع کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ دن میں اپنی کشتی میں آسمان کی سیر کرتا اور رات کو اپنی مینڈھے کے سر کی شکل میں زیر زمین (دنیا کے نیچے) چلا جاتا ہے۔

مصر میں آفتاب پرستی کا آغاز ہیلیو پولس سے ہوا۔ یونانی زبان میں ہیلیو پولس (Heliopolis) کے لفظی معنی بھی ''شہرِ آفتاب'' کے ہیں۔ اسی شہر کے مذہبی پیشواؤں نے مصر میں پہلا مذہبی نظام تیار کیا اور دیوتا رع (Re یا Ra) کی پرستش کو سرکاری مذہب بنا دیا۔ (ہیلیو پولس ان دنوں عین شمس (مصر الجدیدہ) کہلاتا ہے۔) شاہ آمن ہوتپ سوم (1390 تا 1352 ق م) نے سورج دیوتا کی تمام شکلوں کی تعریف میں دو حمدیں لکھیں جو سنگ خارا کی سل پر، جو اب برٹش میوزیم (لندن) میں ہے، کندہ ہیں۔ سانڈ کی شکل کا ''ایپس بل'' اپنی زندگی میں ''پتاہ'' اور موت کے بعد ''اوسیرس'' کہلاتا تھا۔ پتاہ ممفس شہر کا خالق دیوتا سمجھا جاتا تھا۔

جیزہ اور سقارہ کے مقابر

فراعنہ مصر کا اعتقاد تھا کہ روح ہمیشہ باقی رہتی ہے اور آدمی کو مرنے کے بعد نئی زندگی ملتی ہے۔ یوں وہ بڑے اہتمام سے مختلف شکلوں کے مقبرے بنواتے تھے جن میں بعضے تو چبوترے کی شکل کے ہوتے جن کا مدفن زمین کے اندر کھدا ہوتا تھا اور بعضے سیڑھی دار ہوتے جیسے ہرم سقارہ دکھائی دے رہا ہے۔ بعض مقبرے اہرام کی شکل میں بنائے جاتے تھے جیسے جیزہ کے اہرام۔ ہرم میں بند گلیاں اور بند راستے بنائے جاتے۔ ایک گہرے اور خفیہ کمرے میں فرعون کی قبر بنائی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جاتی۔ چٹانوں میں بھی قبریں تراشی جاتی تھیں جو سرنگ کی صورت میں شروع ہوتیں۔ اس میں کئی موڑ، ڈھلانیں اور سیڑھیاں بنائی جاتی تھیں۔ ایسی قبروں میں بہت آگے جا کر کئی کمرے ہوتے تھے جن میں سے کسی گہرے کمرے میں انتہائی خفیہ طریقے سے بادشاہ کی میت رکھ دی جاتی۔ وادی ملوک (Valley of Kings) کے مقبرے اسی طرز پر بنائے گئے تھے۔

درمیانی بادشاہی دور (2100 تا 1580 ق م)

مصری حکمرانوں کے بارہویں خاندان کے بادشاہوں نے نوبیا (سوڈان) کو فتح کیا اور فلسطین پر بھی یورش کی۔ چودھویں خاندان کے زمانے میں باہر سے حملے شروع ہوئے اور 1650 ق م کے لگ بھگ مصر پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا جو تاریخ میں ہکسوس (Hyksos) یا ''چرواہے بادشاہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ عرب مؤرخ ان کے لیے عمالیق کا نام استعمال کرتے ہیں۔ یہ سامی نسل سے تھے اور فلسطین و شام سے مصر پہنچے۔ یہی لوگ سب سے پہلے مصر میں گھوڑے لے کر گئے۔ مصری فرعونوں کے برعکس ہکسوس بادشاہ ''ملک'' کہلاتے تھے۔ اسی لیے سورۃ یوسف میں عہدِ یوسفی کے بادشاہ کو فرعون کے بجائے ''الملک'' کہا گیا ہے۔

یوسف علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا اقتدار

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے یعقوب علیہ السلام کنعان (فلسطین) میں رہتے تھے۔ ان کے بارہ فرزندوں میں سے یوسف علیہ السلام باپ کے بہت چہیتے تھے۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے حسد میں مبتلا ہو کر سیدنا یوسف علیہ السلام کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا۔ وہاں سے گزرنے والے ایک قافلے نے انھیں نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ یوں یوسف علیہ السلام کو ہکسوس بادشاہ اپوفیس کے عہد میں مصر کے دارالحکومت اواریس (تانیس) میں فروخت کیا گیا۔ اواریس آج کل صان الحجر کہلاتا ہے جو ڈیلٹا میں بحیرۂ منزلہ (بحیرۂ تانیس) کے قریب واقع ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کو ''عزیز'' (فوطیفار) نے خریدا جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق شاہی خزانے کا افسر تھا۔ فوطیفار کی بیوی زلیخا کی طرف سے یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ ہوا، اس کے نتیجے میں انھیں نو دس برس قید بھگتنی پڑی۔ آپؑ خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے تھے، چنانچہ آپؑ نے دو قیدیوں کے خوابوں کی بالکل صحیح تعبیر بتائی۔ ان میں سے ایک جو رہا ہوا، اس نے برسوں بعد اس بات کا بادشاہ سے ذکر کیا جس نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا۔ پھر اس نے جیل میں آ کر سیدنا یوسف علیہ السلام سے بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی۔ آپ نے جو تعبیر بتائی، اسے سن کر بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو دربار میں بلا بھیجا اور ان کی خواہش پر انھیں نائب شاہ یا نائب السلطنت (رومی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) مقرر کر دیا جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے خود کو ملکی خزانوں پر مامور کیے جانے کا تقاضا کیا تھا۔ (سورۃ یوسف 55:12)

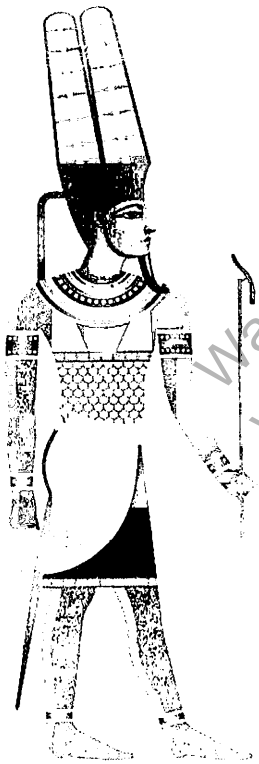

سورۂ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے لیے ''مَلِک'' (بادشاہ)

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اور ''عزیز'' (صاحبِ اقتدار) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے شاہی خواب کی اپنی دی گئی تعبیر کے مطابق آنے والے قحط کے زمانے میں رعایا کو غلہ فراہم کرنے کے بہترین انتظامات کیے حتیٰ کہ ان کے بھائی ملک کنعان (فلسطین) سے غلہ لینے کی غرض سے آنے والے قافلے کے ساتھ مصر آئے۔ دوسری بار وہ یوسف علیہ السلام کے حسبِ خواہش ان کے سگے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لائے جنھیں یوسف علیہ السلام نے ایک تدبیر سے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔

جب یوسف علیہ السلام کے بھائی تیسری بار غلے کے لیے آئے تو آپ نے ان کے سامنے اپنی شخصیت کا انکشاف کیا۔ وہ برسرِ اقتدار بھائی کو دیکھ کر اپنے سابقہ رویے پر نادم ہوئے تو آپ نے انھیں یہ کہہ کر معاف کر دیا: لاتثریب علیکم الیوم (آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔) پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد اور بھائیوں کو بھی مصر بلا لیا۔ آلِ یعقوب (بنی اسرائیل) نیل کے ڈیلٹا کے مشرق میں جشن (Goshen) کے علاقے میں بلبیس (موجودہ سفط الخنہ) کے مقام پر آباد ہوئے۔ یوں بنی اسرائیل کو سیدنا یوسف علیہ السلام کی وجہ سے مصر میں اقتدار ملا اور ان کے بعد بھی ہکسوس دور میں اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ (اطلس القرآن (اردو)، ص: 116-119، تفہیم القرآن، یوسف 87:12، قصص القرآن: 224/1)

سترہویں شاہی خاندان کے زمانے میں ہکسوس حکمرانوں کے خلاف رزم و پیکار کا سلسلہ شروع ہوا اور مصریوں نے 1532 ق م میں انھیں مصر سے نکال دیا۔

جدید بادشاہی دور (1532 تا 1069 ق م)

اس دور میں دارالسلطنت ممفس سے تھیبس منتقل ہو گیا، چنانچہ آنجہانی فرعونوں کو جنوبی مصر میں تھیبس کے بالمقابل وادیٔ شاہاں کی پہاڑیوں میں تراشے مقابر میں دفن کیا جانے لگا۔ اخناتن یا اخناتون (1352 تا 1336 ق م)، آمن ہوتپ سوم کا بیٹا، اٹھارویں شاہی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس نے آتن دیوتا کے نام پر اپنا نام ''اخناتن'' (آتن کی مہربانی) رکھا اور وسطی مصر میں ''اخناتن'' (آتن کا افق) نامی شہر آباد کیا۔ نیل کے مشرقی کنارے پر واقع اخناتن اب ''تل امرنہ'' کہلاتا ہے۔ جب شہر تعمیر ہو گیا تو اخناتن نے اس کے گرد سونے کی بگھی میں چکر لگائے جہاں مندر اور محلات بنائے گئے تھے۔ اخناتن کے زمانے میں فلسطین، شام اور فنیقیہ (لبنان) کے علاقے مصریوں کے قبضے سے نکلنے لگے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ موحد (ایک خدا کو ماننے والا) تھا۔

اخناتون کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو داماد تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے دوبارہ قدیم اصنام پرستی کو رواج دیا۔ ان میں سے توتنخ آمون خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وادیِ شاہاں یا وادی الملوک (Valley of Kings) سے اس کی لاش کے علاوہ مقبرے کی ہر شے نومبر 1921ء میں محفوظ نکل آئی اور اس کی قیمتی اشیاء قاہرہ کے مصری عجائب خانے میں موجود ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 40-38/2)

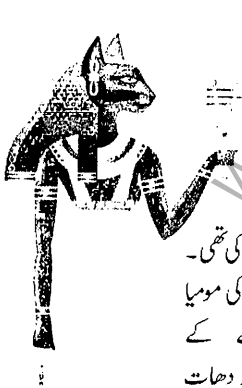

یہ دریافت ہاورڈ کارٹر نے کی تھی۔ جواں سال توتنخ آمون کی مومیا (Mummy) سونے کے تابوت میں پائی گئی جو دھات چڑھی لکڑی کے تابوت کے اندر تھا۔ اس پر جواہرات سجائے گئے تھے جبکہ لکڑی کا تابوت ایک تیسرے بڑے تابوت کے اندر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رکھا گیا تھا۔ مقبرے کے اندر ایک پوری دیوار سونے کی تھی۔ یہ اشیاء اب قاہرہ میوزیم میں رکھی گئی ہیں جبکہ فرعون کی لاش تیسرے بڑے تابوت کے اندر وادی الملوک کے مقبرے میں پڑی ہے۔ توتن خامن (Tuthan Khamen) کے سر، چہرے اور سینے پر ٹھوس سونے شاہانہ ماسک چڑھایا گیا تھا۔

فرعون رعمسیس دوم

جب ہکسوس بادشاہوں کا دورِ حکومت ختم ہوگیا تو اہل مصر (قبطی) بنی اسرائیل کو اجنبی سمجھتے ہوئے ان پر ظلم کرنے لگے اور عملاً انھیں غلام بنالیا۔ انیسویں خانوادے کے فرعون رعمسیس ثانی (1279 تا 1213 ق م) کی کئی بیویاں اور داشتائیں تھیں۔ وہ کثیر الاولاد تھا۔ اس کا جانشین منفتاح (Merenptah) (1213 تا 1203 ق م) اس کا تیرھواں بیٹا تھا۔ اس کے بڑے بھائی رعمسیس ثانی کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ وہ سب وادیٔ شاہاں (بالائی مصر) میں دفن ہوئے جو دریائے نیل کے مغرب میں ہے جبکہ اس وقت کا دارالحکومت تھیبس (موجودہ الاقصر) نیل کے مشرقی کنارے پر تھا۔ رعمسیس ثانی کا ایک بیٹا کھیم ویسی ممفس میں دفن ہوا جہاں وہ بڑا پروہت (Ptah) تھا۔

موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں

فرعون رعمسیس ثانی کے زمانے میں دارالحکومت طیبہ (Thebes) میں نرالا واقعہ پیش آیا تھا۔ نجومیوں نے اسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمھاری سلطنت کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر فرعون نے بنی اسرائیل مین پیدا ہونے والے لڑکے قتل کروانے شروع کردیے مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں معجزانہ طور پر بچالیا۔ اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں بہادیا۔ فرعون کی نیک دل ملکہ آسیہ نے دریا سے صندوق نکلوا کر موسیٰ علیہ السلام کو متبنیٰ (لے پالک بیٹا) بنالیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن پیچھے رہ کر دیکھتی آئی تھی اور پھر محل میں جا کر اس نے شیر خوار (موسیٰ) کے لیے ایک دودھ پلانے والی بلانے کا مشورہ دیا۔ یوں موسیٰ علیہ السلام ہی کی والدہ کو دودھ پلانے کے لیے بلا لیا گیا اور انھوں نے فرعون کے محل میں پرورش پائی۔

شعیب علیہ السلام کی خدمت میں

جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو انھیں اپنے ہم قوم بنی اسرائیل کے آلام و مصائب دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا، چنانچہ ایک روز ان کے ہاتھوں اتفاقاً ایک قبطی مارا گیا جو بنی اسرائیل کے ایک فرد کو پیٹ رہا تھا۔ اس قتل کی خبر جب دربار فرعون تک پہنچی تو امراء نے موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا مشورہ دیا، تاہم وہ پیشگی اطلاع ملنے پر مصر سے نکل آئے اور مدین کی راہ لی۔ مدین سعودی صوبہ تبوک میں خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع ہے۔ مشہور روایت کے مطابق ان دنوں مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام ان کی خدمت میں دس سال رہے اور شعیب علیہ السلام نے اپنی ایک بیٹی (صفوراء) ان سے بیاہ دی۔

کوہِ طور پر موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبری ملی

آٹھ یا دس سال بعد جب وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں سینا کے علاقے میں سردی کے باعث آگ لینے یا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

راستہ دریافت کرنے کی غرض سے کوہ طور (Mt. Senai) پر گئے۔ وہاں انھیں نبوت سے سرفراز کیا گیا اور فرعون کے پاس جا کر اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم ملا۔ موسیٰ علیہ السلام کی خواہش پر بھائی ہارون علیہ السلام کو ان کا معاون بنایا گیا۔ اس دوران میں رمسیس ثانی فوت ہو چکا تھا۔ اس کا بیٹا منفتاح ممفس میں حکمران تھا، وہ اپنے آپ کو خدا کہلاتا تھا۔ ممفس کے کھنڈر قاہرہ سے 15 کلومیٹر جنوب میں نیل کے مغربی کنارے پر ہیں۔

فرعونِ موسیٰ دو تھے

فرعون رمسیس دوم نے ابوسمبل کے دو معبد تعمیر کرائے تھے۔ ایک معبد اس نے اپنے لیے تعمیر کرایا جو بڑا تھا۔ یہ معبد چٹان میں تراشا گیا تھا۔ اس کے دروازے پر رمسیس دوم کے چار بیٹھے ہوئے بڑے مجسمے بنائے گئے جن سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی گویا وہ معبد کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہر مجسمے کی بلندی بیس میٹر سے زیادہ ہے۔ دوسرا چھوٹا معبد فرعون نے اپنی بیوی نفرتاری کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ یہ بھی چٹان میں تراشا گیا تھا۔ یہ معبد محبت کی دیوی حتور کی پوجا کے لیے مختص تھا۔ حتور کا سر گائے کے سر جیسا بنایا جاتا تھا۔ اس معبد کے ماتھے پر چھ دیوقامت کھڑے مجسمے بنائے گئے جن میں سے چار مجسمے رمسیس دوم اور دو مجسمے ملکہ نفرتاری کے تھے۔ ان مجسموں کی اونچائی کم وبیش دس میٹر ہے۔

رمسیس دوم نے پچیس سال کی عمر میں تختِ حکومت سنبھالا۔ اس کی حکومت کا دورانیہ 67 سال پر محیط۔ سابقہ بادشاہوں کی طرح اس نے بھی عمارتیں بنانے پر توجہ دی۔ صحرا میں کانیں کھود کر قیمتی دھاتوں کا حصول بھی اس کی ترجیحات میں شامل تھا۔ اس نے دفاعی وعسکری اُمور پر بھی توجہ دی اور بیرونی حملوں کی روک تھام کے لیے مصر کی مغربی حدود پر کئی قلعے تعمیر کرائے۔ رمسیس دوم ایک بڑا شاہی کنبہ چھوڑ کر مرا جس میں 59 شہزادیوں اور 79 شہزادوں کے علاوہ متعدد ملکائیں شامل تھیں۔

قارون اور اس کا محل

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ترجمہ: ''بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پھر اس نے ان پر ظلم کیا اور ہم نے اسے اس قدر خزانے دیے تھے کہ بلاشبہ اس کی چابیاں ایک طاقتور (مردوں کی) جماعت پر بھاری ہوتی تھیں، (یاد کرو) جب اس کی قوم نے اس سے کہا: تو مت اترا، بے شک اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (القصص 76:28)

اور فرمایا:

ترجمہ: ''اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے تو اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور تو دنیا میں بھی اپنا حصہ مت بھول اور تو (لوگوں سے) ایسے احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور تو زمین میں فساد نہ کر۔ بے شک اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (القصص 77:28)

بعض ماہرین آثارِ قدیمہ کے بقول قارون کا محل الفیوم میں واقع تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا تھا۔ تاہم اس کا تمام محل نہیں دھنسایا گیا۔ بلکہ اس کا بالائی کچھ حصہ عبرت کے لیے باقی رکھا گیا جس کی مرمت مصر کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محکمہ آثارِ قدیمہ نے انجام دی ہے۔ قارون کے محل کے ساتھ شہر کا بڑا حصہ بھی زمین میں دھنسا دیا گیا تھا۔

قارون کا محل تین منزلہ تھا جس میں 336 کمرے تھے۔ لیکن اس میں سے صرف ایک دروازہ باقی بچا جس کی تعمیر نو سنگ خارا (گرینائیٹ) کے ساتھ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی بدولت اس کے مال و متاع کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اس کے قوی ہیکل غلاموں کا ایک گروہ اس کے سونے چاندی سے بھرے ہوئے خزانوں کی بہت سی چابیاں بمشکل اُٹھانے میں کامیاب ہوتا تھا۔ (القصص 76:28)

فرعون کی غرقابی کے ثبوت

پروفیسر عفیف الدین طبارہ نے لکھا ہے کہ رعمسیس دوم (جس کے محل میں موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی) کا بیٹا منفتاح اپنے باپ کا جانشیں بنا تھا۔ منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا تاکہ آپ بنی اسرائیل کو اس کی قید سے نکال لائیں۔ اسی نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کیا تھا اور سمندر میں غرق ہوا۔ اس کا جسد ابھی تک باقی ہے۔ 1930ء میں ایلیٹ سمتھ نے اس کی لاش سے پٹیاں ہٹائیں تو ان میں نمک کی تہ پائی گئی جس سے پتا چلا کہ یہی فرعونِ موسیٰ ہے جو سمندر میں غرق ہوا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''پس آج ہم تجھے تیرے بدن سمیت نجات دیں گے (تیرا جسم بچا کر سمندر سے باہر نکال پھینکیں گے)، تاکہ تو اپنے پیچھے والوں کے لیے نشان (عبرت) ہو اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے یقیناً غافل ہیں۔'' (یونس 92:10)

الاقصر (تھیبس) کی کھدائیوں کے دوران میں انمحوتپ دوم کے مقبرے میں منفتاح کا جسد پایا گیا تھا۔ آج کل یہ مصری عجائب گھر (قاہرہ) میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ منفتاح کا مقبرہ تیار نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اہل مصر کو اس کی موت کی توقع نہیں تھی۔ یوں اس کے لیے خاص قبر ابھی تیار نہیں کی گئی تھی اور اسے انمحوتپ کے مقبرے میں دفنانا پڑا۔

بنی اسرائیل کے لیے 12 چشمے

عیونِ موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کے چشمے) ایک معجزہ ہے۔ بنی اسرائیل کے 12 قبائل کے لیے عصائے موسوی کی ضرب سے چشمے پھوٹے تھے۔ ان قبائل کی تعداد کے لحاظ سے بارہ چشموں میں سے پانچ چشمے باقی ہیں۔ بنی اسرائیل جب فرعون سے نجات پا کر تھکے ہارے سینا میں پہنچے تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اذنِ الٰہی کی تعمیل میں اپنی لاٹھی سے ایک پتھر پر ضرب لگائی اور اس پتھر سے معجزانہ طور پر میٹھے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ چشمے اس میدان میں بعد ازاں جاری رہے جن کی سیرابی سے کئی درخت اور سبزہ اُگ آیا۔

سینٹ کیتھرائن نامی دَیر (خانقاہِ راہب، عبادت گاہ) جنوبی سینا میں جبل کیتھرائن کے دامن میں واقع ہے۔ یہ مصر کا بلند ترین پہاڑ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے قدیم مسیحی خانقاہ ہے۔ دنیا بھر سے ہزاروں عیسائی دَیر سینٹ کیتھرائن کی زیارت کو آتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک بڑی سیاحتی زیارت گاہ ہے۔ اس کے قریب واقع جبل طور کی بھی زیارت کی جاتی ہے۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں: بنی اسرائیل نے جب سمندر پار کیا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیاں اور اس کی قدرتِ کاملہ کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے۔ ان کا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے بتوں کی عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ لوگ کنعانی تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان بت پرستوں کا تعلق لخم سے تھا۔ ابن جریج نے لکھا ہے: یہ لوگ گائے کی شکل میں بنائے گئے بتوں کے پجاری تھے۔ اسی اَمر نے بعد ازاں بنی اسرائیل میں بچھڑے کی پوجا کا شوق پیدا کیا اور انھوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے کہا کہ موسیٰ! ہمارے لیے بھی معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا: تم جاہل ہو، تم ناواقف ہو اللہ کی عظمت اور کبریائی سے اور اس اَمر سے کہ اسے شرک سے پاک سمجھنا اور بیان کرنا واجب ہے۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی کی سزا

انھیں فلسطین میں داخل ہونے کو کہا تو بنی اسرائیل فلستیوں سے خوفزدہ ہو کر کہنے لگے: اے موسیٰ! تم اور تمھارا رب جاؤ اور لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اسی نافرمانی کی پاداش میں بنی اسرائیل 40 برس دشتِ تیہ (صحرائے سیناء) میں بھٹکتے رہے۔ مفسر قرطبی نے ابوبکر بن ابی شیبہ کی وساطت سے قیس بن عباد کا یہ قول لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کہتے تھے: فرعون نہیں مرا اور نہ وہ کبھی مر سکتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سنا کہ وہ اپنے نبی کو جھٹلاتے ہیں تو اس نے فرعون کی لاش ساحل سمندر پر نکال دی، گویا وہ سرخ بیل تھا تاکہ بنی اسرائیل اسے مرا ہوا دیکھ لیں۔ جب انھیں اطمینان ہو گیا کہ فرعون مر گیا ہے تو انھیں فرعون کے علاقے میں بھیجا گیا تاکہ وہ اس کے خزانے لے آئیں۔ وہ نعمتوں میں غرق ہو گئے۔ تب انھوں نے ایک جگہ کچھ بت پرستوں کو دیکھا جو بتوں کے سامنے بیٹھے تھے۔

انھوں نے یہ منظر دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لیے بھی ایسے معبود بنا دیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سخت ڈانٹ پلائی اور فرمایا کہ کیا میں تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی معبود تلاش کروں جبکہ اس نے تمھیں سب جہانوں کے مقابلے میں فضیلت بخشی، یعنی اس دور کے سب اہل جہاں کے مقابلے میں۔ آپؑ نے انھیں حکم دیا کہ وہ ارضِ مقدس کی طرف روانہ ہو جائیں جہاں ان کے موحد آباء و اجداد رہتے تھے۔ یوں وہ فرعون کے علاقے سے پیچھا چھڑا کر فرعونیت کی آلائشوں سے پاک ہو جائیں۔ ارضِ مقدس (فلسطین) ظالموں کے قبضے میں تھی۔ اسے بازیاب کرانے کی ضرورت تھی۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج

موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون منفتاح کو اللہ کا پیغام پہنچایا جس میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے مگر وہ بدستور اپنی خدائی کے زعم اور تکبر میں مبتلا رہا۔ بنی اسرائیل پر بدستور مظالم ڈھائے جاتے رہے۔ ایک رات اللہ کے حکم سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چل پڑے۔ فرعون کو پتا چلا تو وہ لشکر لے کر تعاقب میں روانہ ہوا۔ راستے میں سمندر (بحیرۂ قلزم کی کھاڑی) حائل تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو پانی کے بحرِ زخار کو پار کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکری اس میں غرق ہو گئے۔ تفہیم القرآن کے مطابق یہ واقعہ 1224 ق م میں پیش آیا۔ فرعونیوں کی غرقابی جس مقام پر ہوئی، آج کل اُسے بحیرات مُرّہ (Bitter Lakes) کہا جاتا ہے جن میں سے نہر سویز گزاری گئی ہے۔ (اطلس القرآن (اردو)، ص: 139-142) اس زمانے میں بحیرات مُرّہ بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر) کی خلیج سویس (Suez) سے متصل تھیں۔ جدید تحقیق کے مطابق غرقِ فرعون کا واقعہ 1203 ق م میں پیش آیا تھا۔

مصر پر ایرانی اور یونانی تسلط

526 ق م میں ایرانی ہخامنشی بادشاہ ذوالقرنین (سائرس اعظم) کے بیٹے شاہ کمبوجیہ (Cambesis) نے مصر پر یلغار کی اور اسے سلطنتِ ایران میں شامل کر لیا۔ اس کے دو سو برس بعد 330 ق م میں یونانی فاتح اسکندر اعظم شاہ ایران دارا سوم کو اناطولیہ میں شکست دینے کے بعد ساحلِ شام اور فلسطین کو فتح کرتا ہوا مصر کی طرف بڑھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ مصریوں کو ایرانیوں کے پنجے سے آزاد کرانے آیا ہے۔ مصر پر اسکندر کا قبضہ ہو گیا تو مصری پروہتوں نے اسے آمون (عمون) دیوتا کا بیٹا اور فراعنہ کا وارث قرار دے دیا۔ اسکندر نے اپنے ایک مہندس (انجینئر) قراطیس سے ساحل بحر پر

www.pakistanipoint.com

اپنے نام سے ایک شہر اسکندریہ تعمیر کرایا، مصر میں اقلیونیدس کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود ایشیا کی تسخیر کے لیے روانہ ہوگیا۔

مصر کے بطلیموی حکمران

بطلیموی خاندان کی بنیاد 305 ق م میں بطلیموس (Ptolemy) اول یونانی نے رکھی تھی جسے سکندر اعظم نے بابل (عراق) کا گورنر مقرر کیا تھا۔ بطلیموس دوم (285 تا 246 ق م) نے قدیم مصری فرعونوں کی طرح بہن بھائی کی شادی کو رواج دیا۔ دراصل اسے اپنی بہن سے بہت محبت تھی اور وہ اسے ہر حال میں اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد خاندان کی ہر لڑکی کی شادی حکمران بھائی سے ہوتی رہی۔ بطلیموس سیزدہم (xiii) اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کی شادی اس کی بہن قلوپطرا سے ہوئی تھی۔ یہ شادی رومی حکمران جرنیل جولیس سیزر نے کرائی تھی جو مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ 44 ق م میں سیزر روم میں عین تاجپوشی کے وقت مارا گیا تو قلوپطرا نے اپنے شوہر کو قتل کرا دیا اور خود مختار حکمران (47 تا 30 ق م) بن گئی۔ جب جولیس سیزر کے جانشین آگسٹس سیزر نے مصر پر حملہ کیا تو قلوپطرا نے اپنے آپ کو زہریلے سانپ سے ڈسوا کر موت کو گلے لگا لیا اور 30 ق م میں مصر رومی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

سارا پیس دیوتا کا شہر

عہد موسوی سے رومی دور تک مصر میں جن دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی، ان میں اوسیرس اور اس کی بیوی آئسیس کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ علاوہ ازیں سارا پیس نامی دیوتا کا عظیم الشان مندر دارالحکومت اسکندریہ میں واقع تھا۔ سارا پیس کا قوی ہیکل بت سونے، چاندی اور مختلف دھاتوں کی بہت سی تختیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ وہ بالکل مشتری کے بت کے مانند تھا سوائے اس کے سر پر ایک ٹوکری یا پیمانہ رکھا ہوا تھا۔

مصر میں عیسائیت کا جبری نفاذ

جب عیسائیت نے تثلیثی صورت (تین خداؤں اللہ، مسیح اور روح القدس کی پوجا) اختیار کر لی، تو مصر میں اس مذہب کے عقائد پھیلنے لگے۔ بت پرست رومی حکمران ڈیوکلیشن کے عہد میں جہاں سلطنت کے اور حصوں میں تثلیثی عیسائیوں پر ظلم ہوتا تھا، وہاں مصر میں بھی اس عقیدے والوں کو دار و گیر کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی حکم سے ہزاروں مصری عیسائی قتل کر دیے گئے، تاہم چوتھی صدی عیسوی میں جب عیسائیت سلطنت روم (بازنطینی سلطنت) کا سرکاری مذہب قرار پایا تو قیصر تھیوڈوسیس اوّل نے تمام رومی رعایا کو تثلیثی مذہب اختیار کرنے کا حکم دے دیا اور بت اور بت خانے تباہ کیے جانے لگے۔

اسکندریہ کا آرچ بشپ تھیوفلس اپنے معتقدین کی فوج لے کر مندر سارا پیس پر چڑھ دوڑا۔ اس مذہبی خانہ جنگی میں طرفین کے سینکڑوں افراد مارے گئے اور مندر کو آگ لگا دی گئی جس کے ساتھ ہی اسکندریہ کی عظیم الشان لائبریری جل کر خاک ہوگئی۔ اس کتب خانے کی تباہی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جاتا ہے مگر عیسائی مؤرخ ایڈورڈ گبن نے کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھوں اسکندریہ کی بیش قیمت لائبریری کے لوٹے جانے اور تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے اپنا غصہ ظاہر کیا ہے۔ (قدیم مذہبی تاریخ، ص: 78,77) علوم و فنون کی ماہر ہپاتیا زہرہ جبیں کو مریم کے بت کے سامنے عیسائیوں نے لاٹھیوں سے مار ڈالا۔ (تاریخ مصر از مفتی حکیم انتظام اللہ شہابی، ص: 39) اس کے بعد دیگر تثلیثی فرقوں کی باری آئی۔

ان دنوں مصر کی قبطی آبادی کا مذہب زیادہ تر یعقوبی تثلیثی عقیدے پر مبنی تھا جو رومن کیتھولک عقیدے کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس تھوڑے اختلاف کی بنا پر قیصر جسٹینین کے عہد میں صرف اسکندریہ میں دو لاکھ یعقوبی (Jacobite) عیسائی قتل کر ڈالے گئے۔ جو مصری رومن کیتھولک عقیدہ نہیں مانتے تھے، بعض اوقات انھیں سمندر میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ (قدیم مذہبی تاریخ، ص: 79,78) ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

معاشرتی کہانی

طارق اسد

"لیٹے رہیے بزرگوار!"

وہ جانتا تھا کہ جس برتھ پر ایک عمر رسیدہ شخص آرام کر رہا ہے، اسے ریزرو کرانے کے لیے اسے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سر سے لوہے کا وہ بھاری صندوق اتارا جس میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ صندوق اگرچہ بڑا نہیں تھا تاہم مشکل وقت میں اس سے بھی نشست کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اسے صندوق کے اُوپر بیٹھنا بے حد معیوب نظر آیا۔ بنیادی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ جانتا تھا، صندوق میں کتنی نایاب کتابیں موجود ہیں۔ وہ تو عام کتاب کا بھی بہت احترام کرتا تھا اور اس میں تو قیمتی کتابیں رکھی تھیں۔

دریا میں ڈال

کھلی آنکھوں جو ظاہر میں نظر آتا ہے، کبھی کبھی ویسا ہوتا نہیں

www.pakistanipoint.com

اس نے کندھے سے صندوق اُتار کر اسے ایک طرف اونچی جگہ پر رکھا اور ڈبے میں نگاہ دوڑائی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ ڈبے میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ جس برتھ پر بابا سو رہا تھا، اس کے نیچے والی دونوں نشستوں پر خواتین اپنے بچوں سمیت موجود تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سیٹیں نہیں اچھا خاصا کمرا ہے اور کمرے میں صرف خواتین بیٹھی ہیں جن کے خاوندوں کا اتا پتا نہیں۔

اسے یاد آیا کہ اس کے گھر کے کمرے بھی تقریباً اسی طرز کے بنے ہوئے ہیں۔ تاہم ان کمروں میں رہنے والی خواتین کے پاس بچوں کا یہ ہجوم نہیں تھا۔ کچھ عرصے بعد محسوس ہوا کہ ڈبے میں اور بھی مسافر سوار ہو گئے ہیں۔ ہجوم یہاں تک بڑھ گیا کہ سوائے کھڑے رہنے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ وہ دروازے کے قریب آ کر باہر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ریل حرکت میں آ گئی، تب اسے احساس ہوا کہ آج ملتان سے لاہور تک اسی حالت میں ہی سفر کیا جائے گا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر برتھ کی طرف دیکھا، بوڑھا بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کراچی سے آ رہا ہے اور لاہور تک جائے گا۔ ایک مرتبہ تو اسے خیال آیا کہ اس نے برتھ بوڑھے کو دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے، پھر اچانک اس کے سامنے بوڑھے کی دو شکر گزار آنکھیں آ گئیں، کتنی ممنونیت تھی ان آنکھوں میں!

''صرف برتھ دینے پر اتنی ممنونیت.....'' اسے جیسے قرار آ گیا۔ اسے کھڑے ہو کر سفر کرنے کی اذیت کا خیال بے معنی اور بے وقعت لگا۔ مزید غور کیا تو اس پر ایک راز یہ بھی کھلا کہ جب اس نے بوڑھے کو برتھ پر سوئے رہنے کو کہا تھا تو اردگرد کے سب مسافر پہلے تو چونکے اور بعد میں اس کے فیاضانہ عمل کو نگاہِ تحسین سے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بھی ممنونیت تھی۔ بے پایاں مسرت کے ساتھ ساتھ اس بات پر اُسے حیرت بھی ہوئی کہ یہ لوگ ممنون ہیں۔ بوڑھا مسافر اس لیے احسان مند تھا کہ اس نے اسے برتھ فراہم کی تھی۔ اردگرد کے لوگ صرف اس لیے ممنون تھے کہ یہ واقعہ ان کے سامنے پیش آیا تھا۔

''شاید کچھ لوگ صرف ممنون ہونے کے لیے زندگی گزارتے ہیں۔'' اس نے سوچا اور پھر اپنا تجزیہ کیا۔ وہ بھی ممنون تھا مگر ان لوگوں کا جنہوں نے اسے بہ نظرِ تحسین دیکھا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ نیکی کا ایک اپنا نشہ ہوتا ہے۔

وہ انھی خیالات میں مست تھا۔ اچانک مسافروں میں سے ایک شخص اس کے صندوق پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے شدید غصے کے عالم میں آدمی کی طرف دیکھا۔ صندوق پر بیٹھنے والا شخص پینتیس سال کا ہو گا یعنی اس سے صرف پانچ سال بڑا۔ اس نے جلدی سے آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے کہنے لگا:

''بھائی صاحب! صندوق سے اُتر جائیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اس میں کتابیں ہیں اور کافی.....''

''ہاں تو کیا ہوا۔ کتابیں صندوق کے اندر پڑی رہیں۔'' اس شخص نے بات کاٹی اور صندوق پر مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔ اس نے غصے سے اس شخص کا کندھا ہلایا تو وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''بھائی کیوں برا مناتے ہو۔ لو سنبھالو اپنا صندوق۔''

کچھ مسافر حیران ہوئے، کچھ نے اس کی تائید کی۔ اسے معلوم ہوا کہ ڈبے میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ زیادہ لوگ غالباً کراچی سے آ رہے تھے۔ ڈبے میں ہر قسم کے لوگ تو سوار تھے تاہم ان میں ایک بات کی بہت کمی تھی کہ انھیں صفائی کا قطعی خیال نہیں تھا۔ ڈبے میں ہر طرف پان والی پیکوں کی غلاظت بکھری پڑی تھی۔ چونکہ پٹھان بھی ڈبے میں سوار تھے لہٰذا وہ بھی ہر دس منٹ بعد اپنے منہ سے نسوار نکال کر پہلے سے زیادہ مقدار میں نسوار پھر ڈال لیتے۔ ان کے تھوکنے کی رفتار

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اور تسلسل میں کمی نہ آتی تھی۔ ابھی وہ اسی مشاہدے میں مگن تھا کہ ایک بھاری بھرکم آدمی اپنی نشست سے اُٹھا اور ٹوائلٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ آدمی ٹوائلٹ کا دروازہ کھولنے لگا تو ساتھ بیٹھے ایک میلے لباس والے مسافر نے بلند آواز میں کہا۔ ''خان صاحب! وہاں پانی نہیں ہے۔''

آدمی نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور فوراً دروازہ کھول ٹوائلٹ میں داخل ہو گیا۔ جلد بدبو کا ایسا بھبھوکا ڈبے میں پھیل گیا کہ اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے جلدی سے رومال ناک پر رکھا۔ بدبو رومال کا حصار توڑ کر اس کے ناک میں داخل ہونے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ریل کے ڈبے نہیں بلکہ بھیڑوں کے باڑے میں آ گیا ہو۔ اس نے جلدی سے پرفیوم نکال کر پہلے اپنے اُوپر چھڑکا اور پھر ادھر اُدھر چھڑکنے لگا۔ آدمی واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوبارہ اسے گھورنے لگا۔ اس نے پرفیوم بیگ میں واپس رکھ دیا۔ ڈبے میں فضا خوشگوار ہو گئی تو مسافر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے ذوق کی داد دینے لگے۔

وہ اب کھڑا کھڑا کافی تھک گیا تھا اور بیٹھنا چاہتا تھا مگر کہیں جگہ نہ تھی۔ اس نے دروازوں کی طرف دیکھا، وہاں بھی لوگ بیٹھے تھے۔ صندوق پر بیٹھنے والا آدمی ایک سیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

فروری کی سرد شام رفتہ رفتہ گہری ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ بھی وہ فروری میں ہی لاہور گیا تھا۔ اس وقت وہ ٹرین کے بجائے کوچ میں سوار تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ پچھلی مرتبہ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ تب عرس تین روز جاری رہا تھا۔ شدید سردی نے اسے بیمار کر دیا۔ اس مرتبہ ماں نے اسے بطور خاص کمبل نما گرم چادر خرید کر دی تھی۔ عرس ایک ہفتہ جاری رہتا تھا۔

اس نے جھک کر صندوق پر جمی مٹی جھاڑی۔ پھر اسے یاد آیا کہ جو کتابیں صندوق کے اندر موجود ہیں، وہ ان کی اہمیت سے بے خبر تھا جب تک سائیں احمد بخش نے ان میں جنون کی حد تک دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب وہ عرس میں شرکت کرنے آیا تو سائیں بخشو سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ اس نے سائیں کو بتایا تھا کہ وہ پیر کرامت شاہ کا بے حد معتقد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ان کے عرس میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ پیر صاحب کے نام پر منت مانی تھی، اگر اسے سرکاری نوکری مل گئی تو وہ پورا ایک ہفتہ ان کے عرس میں شرکت کرے گا۔ اسے یقین تھا یہ پیر صاحب کی کرامت کا نتیجہ ہے کہ پچھلے سال ہی سرکاری محکمے میں کلرک کی نوکری مل گئی۔

باتوں باتوں میں سائیں بخشو نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کے پاس کون سی مذہبی اور علمی و ادبی کتابیں موجود ہیں؟ بس وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب اسے اپنے گھر میں برسوں سے موجود کتابوں کی اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ خیالات کے بھنور سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ٹرین کسی چھوٹے اسٹیشن پر رک رہی ہے۔ وہ دور افتادہ اسٹیشن تھا جہاں ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے رکی۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا۔ چند مسافر ٹرین سے اُترے تھے، ایک دو مسافر اور سوار ہوئے۔

ٹرین دوبارہ حرکت میں آئی تو اس نے بے ارادہ اس مسافر کی طرف دیکھا جو صندوق پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آدمی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اللہ جانے یہ اس کی مسکراہٹ کا اثر تھا یا مسافر کی حماقت، بہرحال جو کچھ ہوا اسے اس کی توقع ہرگز نہ تھی۔ مسافر اچانک اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور نہایت شائستہ لہجے میں کہنے لگا:

''جناب آپ اس سیٹ پر تشریف رکھیے۔''

اس نے حیرت سے آدمی کی طرف دیکھا۔ دوبارہ بولا:

''محترم دوست! آپ کافی دیر سے کھڑے ہیں۔ میری سیٹ پر بیٹھ جایئے۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اس نے آدمی کا کالر پکڑ کر صندوق سے اٹھایا تھا اور وہ شخص اب اسے اپنی نشست کی پیشکش کر رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ معذرت کی کہ وہ نہیں بیٹھے گا لیکن لگتا تھا، وہ شخص قسم کھا کے آیا ہے کہ اسے بٹھا کر ہی دم لے گا۔ جب اصرار ضد کی شکل اختیار کرنے لگا تو وہ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ شخص دروازے میں باہر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے مسافروں کا جائزہ لیا۔ اگرچہ رات کا وقت تھا تاہم اس نے ڈبے کی مدھم روشنی میں بھی دیکھ لیا کہ سب مسافر آدمی کی سخاوت کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ بعض مسافر تو اس شخص کی سخاوت کو قربانی کا نام دے کر اسے خراج تحسین بھی پیش کر رہے تھے۔ ایک کلین شیو مسافر، جو پتلون اور شرٹ کے اُوپر گہرے نیلے رنگ کی جرسی پہنے ہوئے تھا، کہنے لگا:

''دیکھ لیں۔ ایک شخص نے اسے صندوق پر بھی نہیں بیٹھنے دیا اور اُس نے اِسے ہی سیٹ پیش کر دی۔ اسے کہتے ہیں انسانی ہمدردی۔''

ایک سفید اور سیاہ ڈاڑھی والے بزرگ کہہ رہے تھے ''حقوق العباد اسی کو تو کہتے ہیں۔''

اسے اپنا آپ بے وقعت دکھائی دینے لگا۔ اب بھی لوگوں کی آنکھوں میں ممنونیت تھی مگر اس کے لیے نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے اُٹھ کر اپنی جگہ کھڑا ہو جائے مگر اب یہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ اسی وقت کھڑکی کے راستے آنے والے ایک سرد جھونکے نے اس کے خیالات کا رخ بدلا۔ اس نے گرم جرسی موٹے کپڑے کی قمیص کے اُوپر پہن رکھی تھی تاہم وہ سرد جھونکا اسے ٹھنڈا کر گیا۔

اس نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ تھوڑی سی دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہ شخص جس نے اسے سیٹ پیش کی تھی، ابھی تک دروازے میں بیٹھا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر کانپ گیا کیونکہ اس نے میلے لباس کے اُوپر کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ اسے یہ حالت دیکھ کر اس پر شدید غصہ آیا اور افسوس بھی ہوا۔

تب اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ اس نے سوچا یہی وہ وقت ہے جب وہ نیکی کر کے مسافروں کی ممنونیت حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اُٹھا، بیگ سے نئی کمبل نما گرم چادر نکالی اور اس میلے لباس والے شخص کے کانپتے جسم پر ڈال واپس سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میلے لباس والے نے پہلی مرتبہ آنسو بھری ممنونیت سے اس کی طرف دیکھا۔ مسافروں کی رائے ایک مرتبہ پھر اس کے حق میں تھی۔ سب اس کے خلوص اور قربانی کی تعریف کر رہے تھے۔ اسے اپنا آپ ہواؤں میں

معالج کیا کرے؟

عجم کے کسی بادشاہ نے ایک اعلیٰ پائے کا حکیم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ وہ حکیم کئی سال مدینہ شریف میں رہا۔ کوئی ایک شخص بھی اس کے پاس علاج کے لیے نہ آیا۔ ایک دن وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں اس شکایت کے ساتھ حاضر ہوا ''یہ خادم یہاں کے لوگوں کے علاج معالجہ کے لیے آیا لیکن مدت گزرنے کے باوجود کسی نے میری طرف توجہ ہی نہیں کی اور نہ ہی علاج کے لیے کوئی بیمار میرے پاس آیا۔''

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کا دستور یہ ہے کہ بلا تیز بھوک کھاتے نہیں اور کھاتے وقت ابھی بھوک باقی ہو تو اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیتے ہیں۔''

حاصل کلام: ہمیشہ تندرست رہنے کا راز یہی ہے کہ بلا تیز بھوک مت کھاؤ اور ابھی بھوک باقی ہو تو اس بے ہاتھ کھینچ لو۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بلند ہوتا محسوس ہونے لگا۔

''لوگ نیک کام کی تعریف کرتے ہیں اور برے کام کو کتنی جلد بُرا قرار دے دیتے ہیں۔'' وہ عالم سرشاری میں یہی سوچ رہا تھا۔ اس سرشاری میں کئی اسٹیشن گزرے اور وہ مسافر جسے اس نے کمبل دیا تھا، اس سے یکسر بے نیاز دروازے میں بیٹھا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ میلے لباس والا شخص بھی لاہور جا رہا ہے، اس لیے وہ بے فکر تھا۔ ''لاہور جا کر کمبل لے لوں گا۔ میں نے گرم کپڑے اور جرسی پہنی ہوئی ہے۔ اس بے چارے کی حالت تو قابل رحم ہے۔''

غالباً کوئی بڑا اسٹیشن آ رہا تھا۔ گاڑی رفتہ رفتہ ٹھہر رہی تھی۔ اسٹیشن خاصا بارونق اور بڑا تھا۔ وہ جلدی سے پلیٹ فارم پر آیا۔ اسے چائے کی طلب تھی۔ چائے پی کر وہ دوبارہ اپنی نشست پر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی حرکت میں آئی تو بے خیالی میں اس نے دروازے کی طرف دیکھا، میلے لباس والا کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے دروازے میں آ کر پلیٹ فارم پر نگاہ دوڑائی، آدمی کا کہیں وجود نہیں تھا۔ اس نے سوچا شاید جلدی میں کسی اور ڈبے میں سوار ہو گیا ہوگا۔ اکثر مسافر اپنا ڈبا بھول جاتے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی اگلے اسٹیشن پر رُکی تو وہ بے چینی سے ہر ڈبے میں اسے تلاش کرنے لگا لیکن اس کا نشان نہ ملا۔ گاڑی چلنے لگی تو وہ بھاگ کر اپنے ڈبے میں آیا۔ اس کی سیٹ پر ایک خوش پوش مسافر سکون سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے بتایا کہ نشست اس کی ہے مگر وہ مسافر بولا کہ سیٹ کی ریزرویشن اس نے کروا رکھی ہے۔ اسے شدید غصہ آیا۔ گرم کمبل نما چادر کے بغیر عرس میں شرکت کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ دور دور تک کھلا دیہاتی علاقہ پھیلا تھا۔ وہاں سب کی عقیدت صرف پیر صاحب کے لیے تھی۔ پچھلے سال کا تلخ اور تیز بستہ تجربہ ابھی تک اسے یاد تھا۔ وہ سردی سے کانپتا تھا مگر کوئی اس پر گرم چادر تو کیا عام چادر بھی ڈالنے کا روادار نہ تھا۔

اس نے جیب کی طرف نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ واپسی کے کرائے کے علاوہ جو تھوڑے سے روپے موجود تھے، وہ کھانے پینے پر اُٹھ جاتے۔ ان پیسوں سے کمبل نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ اسے سردی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے ڈبے میں موجود مسافروں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ تمام مسافر بدل چکے۔ البتہ بوڑھا جسے اس نے برتھ پیش کی تھی، ابھی تک موجود تھا۔ یہاں تک کہ برتھ کے نیچے کی تمام خواتین اُتر گئی تھیں۔ اب وہاں مرد بیٹھے تھے۔ اسے غصہ آ گیا۔

''یعنی نیکی کی یہ سزا۔ میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی اور اس نے مجھے.....''

وہ ایک دم آگے بڑھا۔ بوڑھا مسافر ڈبے کی مدھم روشنی میں آرام سے لیٹا اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کا کندھا ہلایا اور بولا:

''یہ برتھ میرے نام ریزرو ہے۔ نیچے آ جایئے۔''

بوڑھے نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا جملہ دہرایا۔ بوڑھا چپ چاپ برتھ سے اُترا۔ اس کی بغل میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ اس نے قریب آ کر پوچھا:

''بیٹا! میں اب کہاں بیٹھوں؟''

اسے ایک مرتبہ پھر غصہ آیا۔ اس نے بوڑھے کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں التجا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور صندوق کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا:

''اس صندوق پر..... وہ میرا ہے۔''

جس وقت وہ برتھ پر لیٹ چکا تھا، مسافر ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:

''لگتا ہے اس کا کوئی باپ نہیں۔''

''بس جی آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔''

''نوجوان نسل بزرگوں کا احترام ہی کرتی۔''

◆◆◆

سلمیٰ اعوان

مجھے تاریخ ساز چینی رہنما ماؤزے تنگ کی ایک خوبصورت نظم بے طرح یاد آئی۔ اس نام سے پہلا تعارف کب ہوا؟ 1969ء اور 1970ء میں جب ڈھاکا یونیورسٹی کے گرلز ہال میں ہر دوسرے دن چین اور روس نواز طالبات کے ماؤ اور لینن سے یگانگت کے نعرے اور ماؤ کی ترجمہ شدہ طوفانی نظموں کو جوشیلی آوازوں میں گاتے ہوئے سُنتی تھی۔ چین میرے لیے پاکستان کے ایک اچھے دوست کے ساتھ ساتھ دیوار چین اور ماؤ کے حوالے سے بھی بڑا مانوس ہو گیا تھا۔

وہ ہیرو کیسے بن سکتا ہے.....

دیوارِ چین

انسانی عزم کا شاہکار

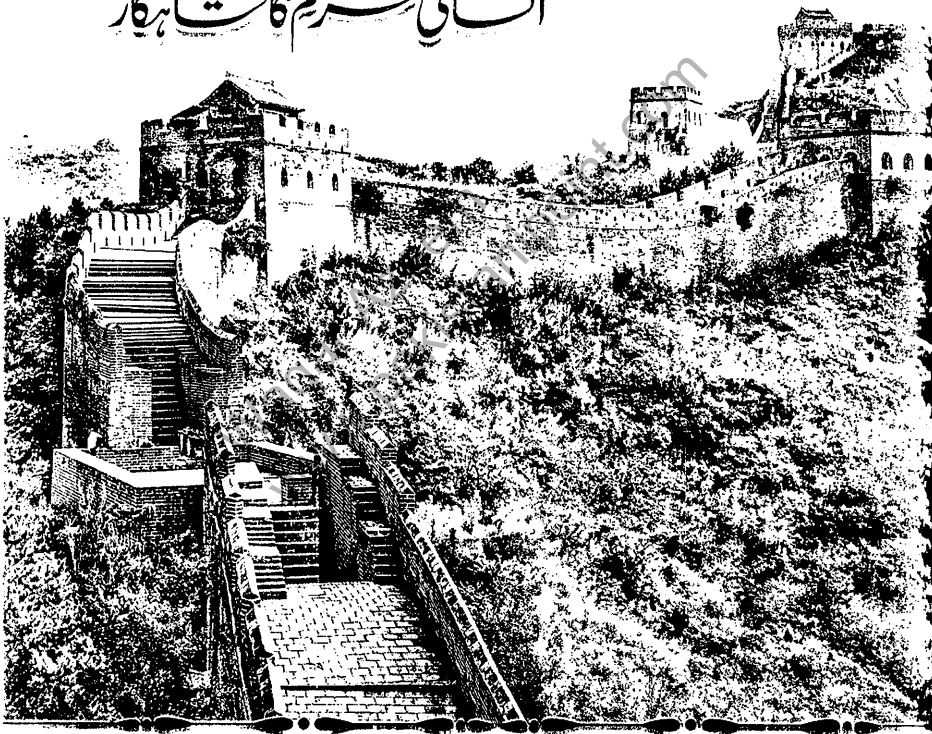

تاریخِ عالم میں اچھوتی جدید چینی تہذیب و تمدن کے تلخ و شیریں پہلو اُجاگر کرتا دلچسپ و پُرتاثیر سفرنامہ

جس نے عظیم دیوار کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

یہ نظم بھی کہیں پڑھی تھی۔ عزم و حوصلے سے لدی پھندی، جدوجہد، ہمت اور عمل کا سبق پڑھاتی۔ اس وقت جب میں بھی ہیروئن بننے عظیم دیوار کو ہاتھ لگانے جا رہی ہوں، دماغ کے کونے کھدروں میں پڑے نظموں کے کچھ ٹکڑے اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ سچ مچ میں نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا۔

میرے اکلوتے داماد عمران کی پاکستانی سفارت خانے، چین میں بطور ائیر اتاشی تعیناتی ہوئی تو گویا اس آوارہ گرد ماں کے سیر سپاٹے اور اُسے ایک نیا جہان دکھانے کا اُوپر والے نے بندوبست کرتے ہوئے کہا: ''لو ہمیشہ ہی شکووں کی سان پر مجھے چڑھائے رکھتی تھیں۔ پردیس میں خجل خواریوں کے طعنوں سے بھی تم نے مجھے بڑا اچھلنا کیا۔ اب شاہانہ انداز میں سیر سپاٹا کرنا۔''

پاکستانی طلبہ سے ملاقات

ہوائی اڈے پر سامان ڈھو رہے تھے کہ دیکھا چند نوجوان بچے بچیاں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہمارے دائیں بائیں سے گزر رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ خیر سے چین میں ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ سامان والے ہال میں کنویئر بیلٹ کے گرد کھڑے ماشاءاللہ سے ان جیالوں کی بہار تھی۔

مزید جانکاری کا تجسس کشاں کشاں ان کے پاس لے گیا اور شروع ہوا کُرید اور سوال جواب کا سلسلہ۔ جانا کہ ڈاکٹری کے ساتھ کچھ انجینئرنگ، بزنس ایڈمنسٹریشن، اکاؤنٹس اور ماحولیاتی مطالعہ کے طالب علم بھی ہیں۔ اب یہ تو پوچھنا فضول تھا کہ پاکستان کے بجائے چین میں کیوں پڑھ رہے ہیں؟ ایک وجہ تو معلوم ہی تھی کہ میڈیکل اور انجینئرنگ میں میرٹ پر نہیں آئے ہوں گے، مگر اُن کے مطابق چین میں پرائیوٹ میڈیکل اور نان میڈیکل تعلیم بمقابلہ پاکستان بہرحال سستی ہے۔ بیجنگ سے ملحقہ شہروں میں چھے، سات لاکھ سالانہ اور پچیس ہزار کا ماہانہ ہاسٹل خرچہ۔

چلو یہ تو خوشی کی بات تھی کہ پاکستانی والدین نے یہ حدیث لڑکوں کیا بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی پلّے سے باندھ لی کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔ اب میرے لیے یہاں تک ہی ٹھہرنا مشکل تھا۔ معیارِ تعلیم، ذریعۂ تعلیم اور دونوں نظاموں کے مواز نے کی بابت بھی تو پتا لگنا چاہیے۔ ذہین لڑکوں کا جواب تھا: ذریعہ تعلیم تو بے شک انگریزی ہے۔ اساتذہ بھی زیادہ تر پاکستانی، بنگلہ دیشی، نیپالی اور ملائی ہیں۔ تاہم تھیوری پر زور ہے، عملی کام صفر۔ میڈیکل کے بعد پاکستان میں ٹیسٹ دینا پڑتا ہے۔

ہم نے پوچھا کہ چینی کتنے لوگوں کو آتی ہے اور چینیوں کو کیسا پایا؟ جواب تھا: ہماری یونیورسٹی میں پاکستانی ہی اتنے ہیں کہ ہمیں چینیوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یعنی چینی طلبہ سے ربط و تعلق کم کم ہے، ایک طرح نہ ہونے کے برابر۔ کچھ کا کہنا تھا بس اچھے ہیں۔

جوابات نے مجھے بتا دیا کہ بھیجنے سے پہلے تربیت نہیں کی گئی۔ کسی پلاننگ سے نہیں آئے۔ جانتے نہیں کہ پاکستان کے سفیر ہیں۔ چین جیسے دوست اور قابل رشک ترقی کرنے والے ملک سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ نجی طور پر ہی یہ ساری کوششیں ہیں کہ بیچارے سادہ لوح ماں باپ یہ فخر کر سکیں، دھی یا پُتر پڑھنے چین گیا ہے۔

بھاری بھرکم سامان ٹرالی میں ڈھونے میں نوجوان بچوں نے مدد کر دی۔ لفٹ کے اندر ٹرالیوں سمیت داخل ہو کر باہر آنے اور عقبی سمت کھڑی ہوٹلوں کی سوزوکیوں میں سامان کی لدائی بھی ہو گئی۔ تاہم راولپنڈی صدر کے رائل پیلس ہوٹل تک، چالیس میل کے ٹکڑے کا سفر جب بدن تھکن سے چور اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہوں، کرنا بڑا ذلیل کام تھا۔ یہ ہم نے بصد شوق نہیں بہ امر مجبوری کیا۔ ہوٹل اچھا تھا۔ لفٹ بند اور کھانا تقاضے کے بعد ملا۔ وہ بھی انتہائی بدذائقہ۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بھٹو کیا وزنی تھا؟

اگلے دن ہوائی اڈے کے مخصوص تھکا دینے والے مراحل طے کر شکر کرتے لاؤنج میں بیٹھے۔ یہاں طلبہ کے علاوہ پختہ عمر اور جوان مسافروں کی نئی کھیپ موجود تھی۔ ان کے چہرے مہرے، لباس، حال احوال انھیں پنجاب کے کم ترقی یافتہ شہروں اور کہیں خیبر پختون خواہ سے تعلق کا بتاتے تھے۔ اب ان لوگوں سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ کاروبار کرتے ہیں۔ چین آنا جانا اُن کے لیے معمول کی بات ہے۔ موتیوں، ہوزری، گارمنٹس، بیگز، پھلوں، سبزیوں، دفاعی آلات وغیرہ کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ کپاس پیدا کرنے والا ملک، جس کا لائل پور کبھی مانچسٹر تھا۔ زرعی ملک جس کی منڈیوں میں بہت سے پھل اور سبزیاں اب باہر سے آتی ہیں۔ یہ پھل جن کے ذائقے بے سواد ہے، جنہیں کھا کر منہ بنے۔ پروردگار! ہماری نالائقیوں نے ہمیں کہاں پہنچا دیا؟

قطار میں کھڑے ایک تیز طرّار لڑکے سے بات چیت سے پتا چلا کہ وہ گیس سلنڈروں کی بلکنگ کرنے جا رہا ہے۔ اب بھلا سوال کیوں نہ ہوتا کہ یہ سیلنڈر کیا پاکستان میں نہیں بن سکتے؟ بن سکتے تھے مگر اب نہیں۔ 73-1972 میں بننے بنانے کے عمل کا آغاز ہونے کی ضرورت تھی۔ ہر صنعت غلطیاں کرنے، سیکھنے اور چیزیں بہتر کرنے کے عمل سے گزرتی ہے۔ چالیس سال کے عرصے میں یہ ان مرحلوں سے گزر کر بہت آگے چلے گئے ہیں۔ زمانہ تو اب مصنوعی ذہانت کا آ گیا ہے۔

اب کھڑی سوچتی تھی کہ بھٹو کہاں کا وزنی لیڈر تھا؟ اس نے صنعتوں کو کیوں قومیایا؟ ایوب گو فوجی تھا پر صنعتی ترقی تو ہوئی اور بہت۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، کوریا کی مثالیں سامنے ہیں۔ ہم تو چلتی صنعتوں کو قومیانے میں لگ گئے۔ ایسے میں مزید صنعتوں کی گنجائش کہاں رہی؟

مصنفہ

بیجنگ میں آمد

بیجنگ ایئر پورٹ بہت بڑا تھا۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس سے بھی دس گنا بڑا نیا ایئر پورٹ تیار ہو چکا۔ بس کوئی دم میں افتتاح ہوا چاہتا ہے۔ خدایا اس کا تو ہر مرحلہ مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی آمد کا اعلان کرو، اسکینرز پر آ کر۔ آگے آؤ، فارم بھرو، ہاتھ میں پکڑ واور کیبنوں کے سامنے بیٹھے لوگوں کے سامنے حاضر ہو جاؤ، حاضری دینے کے لیے۔ زگ زیگ کی صورت میں لائنوں کو اسٹیل کے ڈنڈوں سے بیریر بنا کر مقید کر دیا تھا۔ چلو شکر ان سارے مراحل میں نوجوان پاکستانیوں نے بڑی مدد کی۔

آخر یہ مراحل کٹے اور سامان لینے ہال کی طرف آئے۔ وہاں مجھے اپنی بیٹی کھڑی نظر آئی۔ پل بھر کو رُک کر میں نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھا اور لمحوں میں ہی وہ میری پیار بھری بانہوں میں سمٹ گئی۔ گلے میں سفارتی کارڈ ڈالے، ہاتھوں میں سُرخ پاسپورٹ پکڑے اس نے پھرتی سے ہمارا سامان ٹرالیوں میں لدوایا اور ہمیں خود کار دروازوں سے باہر نکال کر ویٹنگ لاؤنج میں لے آئی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بچوں سے ملنے ملانے سے فارغ ہو کر میں نے بیٹی کو دیکھا۔ اُسے ضرورت سے زیادہ اسمارٹ یا دوسرے لفظوں میں کمزور دیکھ کر پریشان ہو اُٹھی تھی۔ بار بار میرے اس سوال پر کہ تم ٹھیک ہو؟ وہ کہتی: ''ہاں ہاں اماں بالکل ٹھیک ہوں۔'' پر میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے چھوٹے نواسے نے شرارت آمیز نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا:

''ارے نانو! آپ تو یونہی پریشان ہو رہی ہیں۔ ماما بازاروں میں اتنا گھومتی تھیں کہ اسمارٹ ہو گئی ہیں۔'' اور اس وضاحت پر کہ بازاروں میں چکروں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ وہ بولا: ''نانو شاپنگ، شاپنگ۔'' ماں نے ہنستے ہوئے نٹ کھٹ بیٹے کو گھر کا اور باہر چلنے کا اشارہ دیا۔

بیجنگ کا آسمان ابر آلود تھا۔ ہواؤں میں ٹھنڈک اور تیزی تھی۔ دراصل سیکورٹی کے صبر آزما مراحل نے رات سر پر کھڑی کر دی تھی۔ اُف بڑا چیختا چنگھاڑتا ماحول تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر باہر دیکھا۔ پُرہیبت مناظر کا ایک سلسلہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ سچی بات ہے حیرت کا سمندر دائیں بائیں موجیں مار رہا تھا۔ فلک بوس عمارتیں جیسے کسی خودرُو جنگل کی طرح اُگی ہوئی تھیں۔ ان کے گہرے رنگوں والے بیرونی حصّوں میں جڑے شیشوں سے منعکس ہوتی روشنیوں کی دودھیا چمک، اسفالٹ کی سڑکوں کی سیاہی اور اسٹریٹ لائٹس کی کم کم روشنی میں بھاگتا دوڑتا شوں شوں کرتا گاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ..... جنوں بھوتوں والی طلسمی دنیا کی نوسٹلجیائی کیفیت طاری ہونے لگی۔

سڑکوں پر جرمنی، امریکا، جاپان بھاگا پھرتا تھا۔ مرسیڈیز، اوڈی، رولس رائز، واکس ویگن، ہونڈا ایکسز۔ دنیا کی ہر مہنگی سے مہنگی گاڑی یہاں دائیں بائیں چیختی چنگھاڑتی گزر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈپلومیٹک ریذیڈنسی کمپاؤنڈ کے چھٹے فلور کے ایک گھر میں داخل ہوئی جہاں میری بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ داخلی دروازے پر چسپاں چاند تارے والے جھنڈے کی تصویر یقیناً پاکستانی گھرانے کی نشان دہی کے لیے لگائی گئی ہوگی کہ عمارت میں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے سفارت خانے بھی تھے۔ بہت آراستہ پیراستہ فلیٹ تھا۔ آرائش و زیبائش دیکھتے ہوئے آنکھوں میں حیرت تھی۔ کشادگی لیے کمروں کی دیواریں مہنگی خوبصورت فن پاروں سے سجی تھیں۔ چوبی فرش قیمتی چھوٹے بڑے قالینوں سے ڈھکے نظر آئے۔ کونوں میں سجاوٹی اشیاء بھی توجہ کھینچتی تھیں۔ پُوچھنے پر جانا کہ فرنیچر اور کچن کی چیزیں حکومت کی فراہم کردہ ہیں۔ ہاں سجاوٹی چیزیں بے شک ہم نے خریدی ہیں۔

فطرتاً بیٹی حساس اور غیر ضروری نمود و نمائش سے گریزاں مزاج رکھنے والی ہے۔ پر یہاں یہ تام جھام سمجھ نہیں آیا۔ جی چاہتا تھا پُوچھوں اور پُوچھ بھی لیا کہ وطن کی محبت اور اس کی تیزی سے گرتی اقتصادی زبوں حالی خالی خولی باتوں سے کہیں زیادہ عملی اقدام کا تقاضا کرتی ہے۔ ملک کا قیمتی زرمبادلہ اس شوشا کی نذر کرنا کیا مناسب ہے؟ وہ ممنائے لب و لہجے میں معذرتیں پیش کر رہی تھی:

''اماں یہاں لوگ بہت رکھ رکھاؤ سے رہتے ہیں۔ ٹپر واسیوں کی طرح تو نہیں رہا جاتا۔ تھوڑی بہت ٹپ ٹاپ تو کرنی پڑتی ہے۔

ہمیں لیڈر کیوں نہ ملے؟

رات گو ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں تھی۔ تاہم نیند کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ نانا نوس جگہیں، بستر، تکیے کی تبدیلی کم کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ صبح دم آنکھ کھلنے کی بیماری نے یہاں بھی نور پیر کے تڑکے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ بالکونی میں آئی۔ سامنے گہری سرمئی رنگت کی عظیم الشان عمارت پر سُرخ جھنڈا ہواؤں کے زور سے پھڑ پھڑاتا تھا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی چائنا کی مرکزی کمیٹی کا پولیٹکل آفس تھا۔ اس کے بارے میں رات پتا چلا تھا۔ چھدرے درختوں سے جھانکتے دروازے سے میری تصوراتی آنکھ اس کے عظیم راہنماؤں کو باری باری دیکھتی تھی۔ مچی مچی آنکھوں،

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پھولی پھولی گالوں والے ماؤزے تنگ، تنگ شیاؤ پنگ، چیانگ زے من اور شی چن پنگ آگے پیچھے اپنے فلسفے، سیاسی و معاشی نظام اور چینی قوم کو نشاۃ ثانیہ کے درجے تک لے جاتے نظر آئے۔

بیجنگ کی سڑک پہ رواں دواں سائیکلیں

عمارت کو تین سمتوں سے ڈھانپنے والا آسمان جس میں بیٹھا میرا خدائے واحد جس کی نظر کرم کی طلبگار یہ جاہل، کاہل اور نالائق مسلم اُمّہ۔ نمی آنکھوں کو گیلا کرنے لگی۔ شکوے زبان پر پھیلنے لگے۔ آخر کیوں؟ تو نے ایسے لیڈر ہمیں کیوں نہ مقدر کیے؟ ٹپ ٹپ آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

پاکستان کی کُل آبادی جتنا بیجنگ چار پانچ سال پہلے سموگ کا بُری طرح شکار ہوا تھا۔ انتظامیہ نے بڑی فیکٹریاں فوراً شہر سے باہر منتقل کیں۔ درخت جڑوں سے اُکھاڑ کر لائے اور لگائے۔ کہاں کی سموگ اور کہاں کی گرد آلود فضا۔ اس وقت میرے سامنے بیجنگ کا آسمان شفاف تھا اور آواخر مارچ کی خنکی سے بھرا، تاحد نظر پھیلا فلک بوس عمارتوں کے بے انتہا خوبصورت جنگل میں گھرا حیران کرتا تھا۔ دائیں بائیں جاتی، مڑتی ایک دوسرے کو کاٹتی، کہیں چھیاں ڈالتی شاہرائیں اور گاڑیوں کا طوفان۔

''خدایا''۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ رشک اور حسد میں جلتی بھنتی میں اندر آ گئی۔ 1960ء میں یہی چینی میرے کراچی شہر کی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر کہتے تھے، کاش ہمارے پاس بھی کراچی جیسا ایک شہر ہوتا۔ اب تیس میل مشرق، تیس چالیس میل مغرب، ایسے ہی جنوب اور شمال کی طرف آسمان کو چھوتا بیجنگ شہر حیرت زدہ کرتا ہے۔

فروٹ باسکٹ میں سجی چھوٹی چھوٹی رسیلی شہد جیسی میٹھی نارنگیوں کو کھاتے ہوئے عمران نے میرے سامنے ٹائپ شدہ کاغذ رکھ دیا۔ یہ میرا پروگرام چارٹ تھا۔ شام تک داماد نے شہر کے چاروں کھونٹ گھما کر میرا حشر نشر کر دیا۔ صفائی کا وہ عالم کہ کھانے کی پلیٹ نہ ملے تو دال چاول فرش پر ڈال کر کھا لو۔ شہر مانگنے والوں سے پاک صاف۔ جگہ جگہ کھڑی سائیکلیں۔ آپ نے کہیں جانا ہے۔ سڑک کنارے بنے اسٹینڈ سے سائیکل اُٹھاؤ اور جہاں جانا ہے وہاں پہنچو۔ سائیکل کو وہیں چھوڑو اور آگے بڑھ جاؤ۔ کام پر جانے اور واپس آنے کے اوقات کے لیے مخصوص نمبروں کی بسیں جن کے روٹ صبح و شام کے ان مختصر اوقات میں خاص بن جاتے ہیں کہ لوگوں کو انتظار کی زحمت نہ ہو۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ستر اسّی کی دھائی میں سنتے تھے ساری چینی قوم سائیکلوں پر سوار ہے۔ پیڈل مارنے والے زمانے اب لد گئے۔ سائیکل تو اب تفریح کا ذریعہ ہے۔ عوام اب شاندار ائیر کنڈیشنڈ گاڑیوں، بسوں اور میٹرو میں سفر کرتی ہے۔ مخصوص وردی پہننے والی عورت اب برانڈڈ کپڑے پہنتی اور ٹکا کے میک اپ کرتی ہے۔

دیوارِ چین کا دورہ

آج مجھے دیوارِ چین کے لیے جانا ہے۔ شکر کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھی جس کی اگلی نشست کا دروازہ کھولے بیٹی اور داماد کھڑے تھے۔ ایک سیاح چین جائے اور وہاں دیوارِ چین نہ دیکھے..... یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ دیوار عجائبات عالم میں شامل ہے۔ یہ بذات خود اعجوبہ ہے کہ دیوار کی تعمیر ساتویں صدی قبل مسیح شروع ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے یہ تعمیر سولہویں صدی تک جاری رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ چینی کلچر کے بارے میں کوئی بات مکمل ہو ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں عظیم دیوار کا حصّہ نہ ڈالا جائے۔

گاڑی سے اُتر کر میں سرشاری کے عالم میں اپنے چاروں طرف بکھری سنہری دھوپ میں گھومتی ہوں۔ شفاف نیلے آسمان، خنک ہواؤں کے رقصاں جھونکوں، پشت پر نیلگوں پانیوں کے ہلکورے لیتی جھیل، اُوپر پہاڑی پر بل کھاتی دیوار، اس پر بنی برجی، سبھی کو شوق واشتیاق کی بلندیوں سے دیکھتی اور مسرور ہوتی ہوں۔ ''میرے پروردگار میں تیری کس کس نعمت کا شکر ادا کروں۔''

سامنے ٹکٹ گھر جہاں عمران ٹکٹ لیے کھڑا ہے۔ داہنے ہاتھ دیواری یادگار کے پاس بیٹی کچھ پڑھتی نظر آتی ہے۔ بائیں ہاتھ سڑک سے ذرا پرے دیوار کے اُوپر عظیم دیوار کا ایک دوسرا حصہ اور برجیاں نظر آ رہی ہیں۔ پارکنگ ایریا میں گاڑیوں کی آمد رفت کا شور برپا ہے۔

لیو پین (Liu Pan) پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر.....

سُرخ جھنڈا لہراتا ہے.....

اب ہم نے لمبا Tassel (یونیفارم) پہن لیا ہے.....

ماؤ کی نظم کے یہ ٹکڑے یاد آ رہے ہیں۔ میں نے بھی لمبی چوڑی دعاؤں کی ردا اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ سامنے بے ڈھنگی سی، بڑے بڑے پتھروں والی سیڑھیاں ہیں جن پر قدم رکھ دیا اور چڑھتی جا رہی ہوں۔ اب رکی ہوں، اس چھوٹے سے دوراہے پر آ کر، جہاں ایک جانب سیڑھیاں اُوپر برجی تک جاتیں اور دوسری جانب سیڑھیوں کا ہی چھوٹا سا سلسلہ چمکتے دمکتے رنگ رنگیلے آرٹ کے شاہکاروں سے سجے پگوڈا کی طرف لے جاتا تھا۔

مجھے تو پھر لازمی اسی طرف جانا تھا۔ رنگوں کی پچکاریاں اور چوبی کندہ کاری کی شاہکار دیواریں، چھت، گلیارہ اور ستون..... سب فنونِ لطیفہ کے ہیروں سے سجے سنورے ماحول رنگین اور چینی ثقافت کی بھرپور نمائندگی کر رہے تھے۔ ہم ماں بیٹی نے کچھ وقت وہاں گزارا۔ مخالف سمت جانے سے قبل ٹیرس پر کھڑے ایک بے حد خوبصورت جوڑے کے پاس رُکی جن میں سے ایک اندھا تھا۔ چھڑی ہاتھ میں پکڑے، آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک لگائے، دل کش لڑکا ساتھی لڑکی کا ایک ہاتھ تھامے یہاں اُس کی آنکھوں سے سیر کا لُطف اُٹھانے آیا تھا۔ عمران نے اُن سے چینی میں باتیں کیں تو سمجھ آیا کہ یہ محرومی ایک حادثے کی دین ہے مگر پُراعتماد بیوی کی محبت سے مالا مال ہے۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے؟ مشکل اور صبر آزما لمحوں میں ڈگمگانے نہیں دیتی۔

سامنے بہت بڑے بورڈ پر دیوارِ چین کی مختصر تاریخ درج تھی۔ تھوڑی دیر رُک کر اُسے پڑھا۔ ماضی بعید، ماضی اور حال، سبھی کا تذکرہ بڑا فخر اور امتیاز لیے ہوئے تھا۔ سمجھدار قوموں کے پاس کچھ ہو تو وہ اس کی حفاظت کرتی، اُسے سجاتی، سنوارتی اور پیش کرتے ہوئے گونا مسرت محسوس کرتی ہیں۔

چڑھائی پھر شروع ہوئی۔ پہلی حفاظتی برجی تک پہنچی۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

اس سے اُوپر پھر سیڑھیاں تھیں۔ وہ بھی دھیرے دھیرے کہیں بیٹی، کہیں عمران کا ہاتھ پکڑے، کہیں خود ہمت کرتے چڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ پھر حفاظتی برجی سے کشادہ انگنائی میں آ گئی۔ چھوٹا سا آنگن، جس کی دیواروں سے جھانکتے نیچے کے دلفریب مناظر، آسمان کا وسیع و عریض پھیلاؤ دیکھا۔ ایک جانب کی سیڑھیاں ذرا نیچے ٹمپل میں لے جاتی تھیں۔ اس جانب بڑھی جب عمران نے ہاتھ پکڑ لیا کہ اُوپر چلنا ہے۔ اب پھر سیڑھیاں تھیں، برجی تھی اور پھر ایک دل کش منظر تھا۔

رنگ رنگیلا پگوڈا اسٹائل کا کمرا، آرٹ کا شاہکار، سامنے چھوٹا سا صحن پھر سیڑھیاں جو یقیناً کسی اور خوبصورت سے منظر میں داخل کرتی ہوں گی۔ یہاں بینچ تھے، جن پر تھوڑے سے بادام اور پستے لیے ستانے بیٹھ گئی۔ ایک چینی خاندان بیٹھا تھا۔ خاکروب صفائی کر رہا تھا۔ اُسے تھوڑا سا ڈرائی فروٹ دینے کی کوشش کی۔ خوشی ہوئی کہ اُس نے بہت شائستگی اور آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات سے انکار کر دیا۔ عمران موٹے موٹے دانوں والی اُبلی ہوئی چھلّی لے کر آیا۔ وہ بھی دینے کی کوشش کی، پھر انکار ہوا۔ اب چھلّی کھاتے ہوئے پھر ماؤ کی نظم پڑھنے لگی ہوں:

اُٹھو اُٹھو، غلام نہیں بنے رہنا......
وہ لوگ جو غلام نہیں بنے رہنا چاہتے......
ہمارے خون اور گوشت سے فائدہ اُٹھائیں......
ہمیں نئی عظیم دیوار بنانی ہے......

تھوڑا تازہ دم ہو کر کھڑی ہو گئی ہوں۔ سامنے 21196 کلومیٹر طویل اس شاہکار کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو جو کسی خوفناک اژدھے کی مانند نظر آتا ہے، دیکھتے وقت کے اندھیرے اُجالوں میں ڈوبتے خود سے سوال کرتی رہی، یہ کیسی بھری نیتوں والے لوگ ہیں۔ پیٹ اور نظر کے بھرے ہوئے۔ میں سامنے صحن کو دیکھتی تھی۔ کہیں کوئی کاغذ کا ٹکڑا، چھوٹا موٹا بکھرا ہوا کوئی تنکا، کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر پندرہ منٹ

ماؤزے تنگ دیوار چین پہ

بعد وہ کوچی فرش پر پھیرنے لگتا۔

ماؤ کی نظم پڑھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی ہوں۔ دائیں ہاتھ ٹورسٹ شاپ آرٹ کا نمونہ تھی۔ چینی نوادرات سے سجی ہوئی۔ قیمتیں پوچھیں۔ باوا کے مول کی تھیں۔ فی الفور توجہ چھت کی نقاشی جانب ہوئی۔ اِدھر اُدھر تھوڑی سی ہل جُل، تھوڑی سی دل پشوری کی۔ باہر نکلی تو سامنے بہت بڑا میدان سیاحوں سے بھرا تھا۔ آمنے سامنے کھانے پینے کی دکانیں۔ دُور فاصلے پر درختوں اور دیوار کے عقب میں پارکنگ ایریا میں کھڑی دیوہیکل ٹورسٹ بسیں۔

خوشگوار دھوپ، ٹھنڈی میٹھی ہوائیں اور لوگوں کا بھریا میلہ۔ یہاں اگر غیر ملکی تھے تو مقامی لوگوں کی بھی کثرت تھی۔ ویسے تو ملک بھی بڑا اور آبادی تو ماشاءاللہ سے نظر لگنے والی خیر سے۔ اگر اپنے ہی نکل آئیں تو کسی غیر کو چپّہ بھر کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے۔ سعدیہ کافی لے آئی۔ ایسے خوبصورت لمحات میں کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینا اور اِس جدید چین کے بانی ماؤ کی اس کہاوت کو یاد کرنا کہ جس نے عظیم دیوار نہیں دیکھی وہ تو سچا انسان ہی نہیں...... یہ سب کس قدر مسرور کن عمل تھا۔

سچ تو یہی ہے کہ یہ چینیوں کی ثقافتی زندگی میں ایک

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

علامت، دنیا کے عجائبات میں ایک بے مثل تعمیری نمونہ اور چینیوں کے عزم و حوصلے کا ایک جیتا جاگتا شاہکار ہے جو ماضی میں دفاعی مضبوطی کا باعث تھی۔ زمانوں، صدیوں سے اس قوم کی طاقت اور اُن کے استحکام کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ دیوار نے اس سوچ اور احساس کو تقویت دی کہ بڑی کامیابیاں مشترکہ کاوشوں اور مضبوط قوتِ ارادی سے ہی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال چینیوں کے اس قومی ترانے سے بھی ملتی ہے جو 1937ء سے 1945ء کی جاپانیوں کے خلاف دفاعی جنگ میں کمپوز کیا گیا تھا:

اب نئی عظیم دیوار ہمارے گوشت اور خون سے تعمیر کرو.....

ہمارے سامنے ایک چینی خاندان آ کر بیٹھ گیا۔ میاں بیوی، ایک بچہ اور نانا نانی۔ تین سال کا بچہ چار بڑوں کا وہ کھلونا تھا جس کے ناز اٹھاتے وہ سرشاری میں ڈوب ڈوب جاتے۔ عمران بتا رہا تھا کہ چین میں خاندانی نظام کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔ والدین کا بہت خیال اور احترام کیا جاتا ہے۔ چونکہ ایک ہی بچہ پیدا کرنے پابندی تھی، اس لیے اسی میں دادا دادی، نانا نانی، ماں باپ کی جان ہوتی ہے۔ کسی چھوٹی موٹی بیماری میں بچہ اگر اسپتال جائے تو ساتھ چار بندوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔

دیوار کے اہم حصے

میرے قریبی بینچ پر ایک نوجوان آ کر بیٹھا جس کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی کتاب تھی۔ کتاب پر ایک ایسے منظر کی جھلک نظر آئی جس نے مجھے بے کل کر دیا۔ میں فی الفور اُٹھ کر اس کے پاس گئی اور اُسے چند لمحوں کے لیے کتاب دینے کی درخواست کی۔ بیبا بچہ ہی لگتا تھا کہ کسی قسم کا کوئی سوال کیے بغیر کتاب میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہ ایک تصویری کتاب تھی۔ سرورق پر گنگ کرنے اور دل کو تھامنے والا ایک منظر جگمگا رہا تھا۔ عظیم دیوار کے سمیتائی (Simatai) حصّے کا ایک منظر۔ کتاب کھولی تو اندر کے دونوں صفحات پر پھیلے سرورق والے منظر کے ساتھ چار پانچ سطور میں تعارف بھی درج تھا۔ صفحات منظر کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو بھی اُجاگر کر رہے تھے۔ گویا فوٹو گرافر کے کمال فن کی داد دیتے ہوئے تخلیق کار کے گیت گا رہے تھے۔

عظیم دیوار کا یہ سمیتائی حصّہ دیکھنے کے قابل ہے جو بیجنگ کے نزدیک منگ سلطنت کے زمانے میں بنایا گیا۔ یہ ایک دلنواز سُر کی طرح آپ کے اندر کو زیر و زبر کرتا اور کسی بے انتہا خوبصورت گیت کی لے کا سا تاثر دیتا، دھڑکتی سانسوں کو منجمد کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ سمیتائی کا یہی عمودی حصّہ عظیم دیوار کا حیرت انگیز اعجوبہ ہے۔ یہ پہاڑوں کی ڈھلانی پاتال سے اُوپر اٹھتا، پہاڑوں کی چوٹی تک جاتا اور وہاں سے پھر عمودی صورت وادیوں میں گرتا ہے۔ اگلے صفحے کا منظر پچھلے کو بھی مات دے رہا تھا۔ کچھ حصے ایسے تھے جو رات کے عکّاس تھے جنہیں دیکھتے ہوئے بندہ کائنات کے تخلیق کار کی صناعی پر اَش اَش کر اُٹھتا ہے۔

دیوار کا Huanghuacheng حصہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ منگ زمانے کا یہ حصّہ ٹاؤن Jiudure میں واقع ہے۔ بیجنگ سے کوئی 65 کلومیٹر دُور یہ قدیمی حصّہ خوبصورت جھیل کے گرد واقع ہے۔ گرمیوں میں یہ جنگلی پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ اسے نام بھی یہی دے دیا گیا۔ Huanghuacheng کا مطلب پیلے پھولوں کا شہر ہے۔

اس دیوار کی تعمیری تفصیل بھی حیران کُن ہے۔ پہاڑوں پر جب دیوار بننے کے مراحل آتے تب پہاڑی پتھر استعمال کیے گئے۔ جب یہ میدانوں سے گزری تب اینٹوں گارے چونے سے کام چلایا گیا۔ صحرا لپیٹ میں آئے تو پھر ولو (Willow) درختوں کی شاخیں اور گہرائیوں سے نکالی ہوئی ریت نے کام کیا۔ 7 قبل مسیح سے ہی یہ دیواریں بننے تو لگی تھیں مگر انھیں جوڑ کر باقاعدہ ایک بڑی دیوار کی پہلی صورت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

220 قبل مسیح میں شہنشاہ Qimshi Hang نے دی جو چین کا پہلا بادشاہ تھا۔ لیو چی (Liuche)، ہین (Han) شہنشاہیت نے سلک روٹ کی حفاظت کی۔ پھر ونگ کے زمانے (1368 - 1644ء) تک پتھر اور اینٹوں سے اسے مزید مضبوطی دی گئی۔

جہاں تک مدافعانہ حیثیت کا تعلق ہے، عظیم دیوار طویل لمبے پھیلاؤ والا سلسلہ ہی نہیں بلکہ اس کے مختلف حصے جو مختلف دفاعی مقاصد کے تحت تعمیر ہوئے مثلاً بلاک ہاؤس، گریژن ٹاؤن، فوجی چوکیاں، درے اور سگنل ٹاور وغیرہ بہت منصوبہ بندی سے بنائے گئے۔

اب کچھ تخریبی پہلوؤں پر بھی بات ہو جائے۔ وقت کی طوالت نے اپنے اپنے عہد کے لوگوں کا خون پسینہ، اُن کے آنسو اور آہیں، شاہوں کے جلال، اُن کے جبر دبدبے اور تخلیقی ذہنی اپج، سب کو شامل کیا۔ ذرا چند لمحوں کے لیے سوچیں۔ بیچارے غریب غربا اور مزدور لوگوں کا کیا حال ہوا ہو گا؟ پتھر توڑنا بڑا کٹھن کام تھا۔ کہیں اُوپر بلندیوں سے لانے میں ہلکان اور کہیں ہزاروں فٹ نیچے گہرائی سے ڈھو یا ڈھوئی کا سلسلہ۔ مفت بیگار کے جبری سلسلوں کی خاطر حکومتی کارندے مرد و زن کو گھروں اور خاندانوں کے بیچ سے اٹھا کر لے جاتے۔ تو اب بھلا اُن بیچاروں کے آنسو آہیں کیسے نہ شامل ہوتیں؟

(Qin) چن سلطنت کے پہلے بادشاہ کا زمانہ تھا جب عظیم دیوار بنانے کے لیے ایک خاتون مینگ چن کے شوہر کو بھرتی کیا گیا۔ نئی نویلی شادی تھی۔ زندگی کے سہانے شب و روز میں جدائی کا زہر گھل گیا۔ ایک دن اُس سے ملنے نکل پڑی۔ کوسوں میل دور کا سفر۔ پوچھتی پچھاتی بھوکی پیاسی اُس جگہ پہنچی جہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ ساتھی لوگوں نے بتایا کہ اس کا شوہر تو مر چکا۔ اُسے تو دیوار کے نیچے ہی دفنا دیا گیا۔ خبر تھی یا کوئی بجلی جو اس پر گری۔ تین دن اور تین راتیں وہ مسلسل روتی رہی۔

سچی بات ہے قیمت تو عام آدمی کو ہی ادا کرنی پڑتی ہے۔

یہ خاتون تو ایک مثال ہے۔ شمال کے گھڑ سوار لٹیروں کو بھی سب سے زیادہ اِس بات پر اعتراض تھا کہ انھیں کیوں محصور کر دیا گیا؟ وہ کیا بزدل ہیں؟ انھیں تو یوں بھی جنوب کے کھاتے پیتے لوگوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ تو برملا کہتے، سب بکواس ہے کہ یہ اُن کی حفاظت کے لیے بنائی جا رہی ہے۔ یہ تو بادشاہ چن کے راج کو دوام کرنے کی کوشش ہے۔ شاید اسی لیے وہ بادشاہ سے بھی متنفر تھے۔

اب یہ سوال کرنا بھی ضروری تھا کہ کسی نے اِسے کبھی سر بھی کیا؟ سنگاپور کے راہب کے بارے روایت ہے کہ انھوں نے کوئی نو ماہ میں اِسے تسخیر کیا تھا مگر اس پر بھی کہا گیا کہ کہاں؟ صرف بیجنگ کا حصہ مکمل ہوا تھا۔ ہزار ہا میل کی لمبائی کو پیدل نو ماہ میں سر کرنا کوئی خالہ جی کا گھر تھا۔ مارکو پولو کو تو یہ اعزاز حاصل ہوا نا کہ وہ قبلائی خان کا ہر دل عزیز بندہ منگولیا تک گیا اور اس نے دیوار کا ذکر بھی کیا۔ اس افریقی شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ کا حوالہ بھی تو بڑا اہم ہے کہ Garin Menzies کی کتاب میں اِس کا ذکر کھل کر ہوا۔ چینی نقشہ جو غالباً 1421ء سال کا ہے بتاتا ہے کہ یہ چینیوں نے دریافت کیا۔ 71 سال قبل کولمبس کہ جب وہ کوسوں کا سفر کر کے Yuan شہنشاہیت کے دور میں یہاں آیا تھا، یہی لگ بھگ 1346ء میں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دیوار چین کے بارے میں آنے سے قبل سن رکھا تھا۔

اب یہ اعزاز بھی تو چینی زبردستی اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ امریکی خلا بازوں کی آنکھوں میں زمین سے نظر آنے والی کوئی شے چبھی تھی تو وہ یہی دیوار چین تھی۔ ہماری عظیم دیوار۔ اب نیل آرمسٹرانگ لاکھ کہیں کہ انھیں تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔ چین بھلا کب اس پر یقین کرتا ہے؟ اس کے حساب سے ایسا بیانیہ نری سازش ہے اور اس سے چین کی تذلیل مقصود ہے۔ اب اس کا کیا علاج کہ ان کے اپنے پہلے خلا باز یانگ لیوی (Yang Liwei) نے 2003ء میں یہ انکشاف کر دیا تھا کہ اس نے خلا سے کوئی دیوار نہیں دیکھی۔ ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جاگتی آنکھوں کا خواب

بشریٰ رحمٰن

گزرے دنوں کی بات ہے۔

بی ایس سی کرنے کے بعد میں ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تھک ہار کر ایک دن نسبت روڈ پر، ایکسرے

کلینک میں نوکری کر لی۔ اپنی بیکاری سے خود اوب چکا تھا اور پھر قسمت نے ڈاکٹر نہیں بننے دیا تھا۔ اس لیے ایکسرے مشین کا آپریٹر بن کر اپنی یہ حسرت پوری کر رہا تھا۔ یہ تجربہ بھی اچھا تھا۔ گونگی مشینیں آدمی کے اندر کی تصویر اُتار لاتی تھیں اور میں روز ایک نئے تجربے سے گزرتا۔

اس روز صبح بڑی زرد اور کملائی ہوئی تھی۔ اچانک ایک لڑکی کلینک میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر راشد اس وقت دکان میں نہ تھے۔ میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''مجھے ایکسرے کرانا ہے''..... اس نے مدھم اور اُداس آواز میں کہا۔

''کس جگہ کا.....؟''

''سینے کا''..... اس نے اپنے ڈاکٹر کی چٹ میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور پھر کہا..... آیئے!

وہ اندر آ گئی اور اپنی آنکھوں پر لگی کالی عینک اُتار دی۔

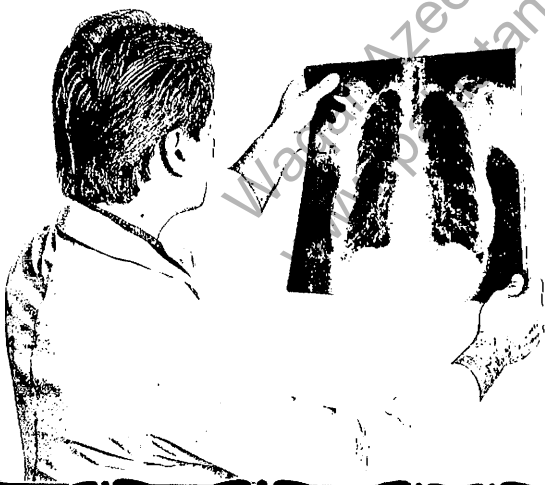

ایک حسّاس نوجوان کی دل چھو لینے والی کتھا، وہ اپنے احساسات تا عمر فراموش نہ کر سکا

میری ہدایات پر اس نے اپنی لمبی چٹیا سر کے اُوپر لپیٹ لی۔ میں نے اس کا رُخ مشین کی طرف کر کے اس کے دونوں بازو پکڑ کے کمر پر رکھ دیے، ٹھوڑی تختے کے ساتھ ٹکا دی۔ خود بٹن کے پاس چلا گیا اور کہا، لمبا سانس لیجیے......

کھٹ...... ایکسرے اُتر گیا۔ وہ جانے کے لیے مڑی۔ میں نے کہا...... ''ذرا ٹھہریے، میں رزلٹ دیکھ لوں۔'' میں جب ڈارک رُوم سے واپس آیا تو وہ دوپٹے سے اپنا آپ ڈھکے مغموم سی بیٹھی تھی۔

''آپ کو تکلیف کیا ہے......؟'' یہ غیر پیشہ ورانہ سوال تھا مگر میں نے کر ہی دیا۔

''دو مہینے سے کھانسی کی شکایت ہے۔''

''علاج کر رہی ہیں......؟''

''جی۔''...... اس نے ڈاکٹر کا نام بتایا...... ''اور انھی کے مشورے پر ایکسرے کروانے آئی ہوں۔''

''اچھا تو آپ کل شام سات بجے رپورٹ لے جائیے گا۔ بعض اوقات گلے کی خرابی کی وجہ سے بھی کھانسی ہونے لگتی ہے۔ فکر کرنے کی بات نہیں''...... مجھے لگ رہا تھا کہ میں غیر ضروری بات کر رہا ہوں مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس سے باتیں کروں اور کسی بہانے اُسے بٹھائے رکھوں...... اس نے زیرِ لب کچھ کہا یا شاید یونہی اس کے ہونٹ ہلے، یا میرے کان بجے...... اس نے بل ادا کیا۔ اپنی کالی عینک آنکھوں پر لگائی اور باہر نکل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ہوا کا ایک ہلکا جھونکا اندر آیا اور کھڑکیوں، دیواروں کو ہلا کر باہر چلا گیا ہے۔

دوسرے دن میں گویا اس کے آنے کی دُعا کر رہا تھا کہ وہ آئی۔ وہی ٹھہرا ٹھہرا پُرسکون انداز، زرد رنگ اور نیم وا ہونٹ!

''تشریف رکھیے''...... میں نے اُسے بٹھایا اور ایکسرے والے لفافے ٹٹولنے لگا۔

''آپ کا نام؟''...... میں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''جی تمکنت......''

''یہ آپ کا ایکسرے ہے۔''...... میں نے لفافہ آگے بڑھایا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں کوئی جرم کر رہا ہوں یا کر چکا یا مجھ سے کوئی ناخوشگوار حرکت ہو گئی ہے کیونکہ کل شام میں نے خلاف عادت ڈاکٹر صاحب سے اس ایکسرے کی تفصیلی رپورٹ معلوم کر لی تھی۔

اس نے لفافے میں سے رپورٹ نکالی۔ غور سے پڑھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے پر زرد گلاب کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

میں از خود بول اُٹھا...... ''آپ کو تھوڑی سی تکلیف ہے۔ آپ کا دایاں پھیپھڑا متاثر نظر آتا ہے۔ صرف گول بیر کی گٹھلی جتنا داغ ہے اور یہ ابتدائی تکلیف دو تین ماہ کے علاج سے رفع ہو جائے گی۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''جی''...... اس کے لب ہلے۔ پھر ایک سوگوار سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر اُبھری۔ جیسے بہت سے ارمان اور آرزوئیں اس کے اندر کھلبلی مچا رہے ہوں اور وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہنس پڑی ہو۔

''میں نے کب آپ سے کہا کہ میں فکر مند ہوں؟'' اس نے کالی عینک اُتار دی۔

مجھے اپنے مشورے زائد ہونے کا احساس ہوا۔ میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں ایک بھیگا بھیگا سوز اور رویا رویا سا خمار تھا۔ جس طرح کنول پانی میں ڈوبے رہنے سے کبھی ہنستے کبھی روتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا، ان خوابیدہ آنکھوں میں حسین خوابوں کی ایک دُنیا پڑی سوتی ہے جو قیامت خیز بن سکتی ہے مگر اِس دُنیا کو جگانے سے پہلے اُس زندگی کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی جو ندی کی ایک سوئی ہوئی لہر کی طرح خشک ہو جانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

میں نے اسے دو تین چیسٹ سپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پتے بتائے۔ اس کی نم آلود اور چمکدار آنکھیں دُور خلاؤں میں دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے کالی عینک آنکھوں پر لگا لی۔ بہت سیانی تھی وہ۔ کالی عینک کا استعمال غالباً ایسی آنکھوں کے لیے بہت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ضروری تھا۔ وہ اُٹھی اور دھیرے سے باہر نکل گئی، ہوا کے نرم جھونکے کی مانند۔ سڑک پر تانگہ روکا اور اس میں سوار ہو کر لہروں پر رواں کشتی کی مانند نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے دوائیوں کی ایک لیبارٹری میں ملازمت مل گئی۔ روزگار کی دلفریبی نے ذہن سے کئی نقش کھرچ ڈالے۔ دو سال بعد مجھے اس سے بھی اچھی نوکری مل گئی۔ اب میری تنخواہ بھی دو چند ہو گئی تھی۔ دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بڑے بھیا مجھے بوجھ بھی تصور نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے سے دو منزلہ مکان کی تیسری چھت پر میں نے اپنے لیے ایک کمرا اور غسل خانہ بنوا لیا۔ بظاہر زندگی کا رویہ بڑا معقول ہو گیا۔

ایک دن ماں بولی: ''خالہ ارجمند بڑا زور دے رہی ہیں۔ تجھے ان کی لڑکی آفندہ سے بیاہ کرنا ہو گا۔ میں زبان دے چکی۔ ایک متوسط طبقے کے آدمی کو اپنے اردگرد کے رشتوں پر ہی اکتفا کرنی چاہیے۔ اپنے پھرائے ہوتے ہیں۔ بہت سے عیبوں کا پردہ رہ جاتا ہے۔ زیادہ دھوم دھڑ کے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور سفید پوشی میں گھر بس جاتے ہیں۔''

اگر گھر بسانا ہی مقصود ہے تو وہ چھوٹے سے دو منزلہ مکان کی تیسری چھت کے ایک دھوپ زدہ کمرے میں، ارجمند خالہ کی بیٹی آفندہ ہی سے سہی.....

(اللہ کرے اس معصوم اور مغموم لڑکی کو اب آرام آ گیا ہو)

گھر بھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تیاریاں کیسی، مذاق ہی ہوتا ہے غریبوں کے ساتھ..... لوگ تو دو چار دن بندھی ٹکی زندگی سے اِدھر اُدھر ہو کر خوش ہو جاتے ہیں۔

جس روز بارات گھر میں واپس آئی اور آفندہ کو دُلہن بنا کر تیسری چھت کے روشن کمرے میں لایا گیا، میں اپنی کھڑکی میں کھڑا بازار کا نظارہ کر رہا تھا۔ محلے کے اتنے گھروں میں ہمارا گھر الگ تھلگ لگ رہا تھا۔ اس پر روشنیوں کی دو لڑیاں لٹک رہی تھیں اور صاف پتا لگ رہا تھا، اس گھر میں دلہن آئی ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا، آفندہ دُلہن بنی پلنگ پر بیٹھی تھی اور میری بہن کب کی جا چکی تھی۔ کمرے میں بہت سے پھول نظر آ رہے تھے۔ گلاب کے کم اور گیندے کے زیادہ۔ غریبوں کی شادیاں گیندے جیسے پھولوں ہی سے سج جاتی ہیں۔ اچانک میرا خیال زقند بھر کے کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

(اللہ کرے اس اجنبی کھردری لڑکی کو آرام آ گیا ہو، اللہ کرے اسے اچھا سا ڈاکٹر مل گیا ہو)

میرا گھر بسے ایک سال بھی ہو گیا۔ ایک منا آیا اور چلا بھی گیا۔ یہ گھر بسنے کی بین دلیل تھی، ورنہ محلے دار مشکوک ہی رہتے۔ شکر ہے، سب اس یقین میں رہے کہ آفندہ اور کلیم دونوں بہت خوش ہیں۔ تیسری چھت کا یہ اکلوتا کمرا بڑا ہی نامعقول تھا۔ گرمیوں میں یہاں قیامت کی گرمی ہوتی، تپش اور حبس جان نکال دیتے اور سردیوں میں یہ گرم ہونے سے ایک دم انکار کر دیتا۔ گرما کی غضبناک دوپہریں میں اپنے دفتر کے ٹھنڈے کمرے میں گزارنے لگا اور سردیوں کی طویل راتوں میں، نیچے اپنی ماں کے پاس چلا جاتا۔

ماں سب سے نچلی منزل میں رہتی تھی۔ بڑے بھیا دوسری منزل میں۔ میں اگر تیسری منزل پر یہ کشادہ کمرا نہ بنواتا تو شاید مجھے گھر بسانے کا حق بھی نہ ملتا۔ دوسرے لفظوں، میں تیسری چھت کا یہ کمرا بسانے کے لیے ہی میں نے شادی کی تھی، جہاں بے چاری آفندہ سردی گرمی میں پڑی کڑھتی رہتی۔ اللہ کے فضل سے اس کا ساس اور جیٹھانی کے ساتھ دل نہیں ملا تھا۔ آمنا سامنا ہمیشہ ''تو تو مَیں مَیں'' پر ہی مُنتج ہوتا۔ نتیجتاً دونوں طرف سے کوسنے مجھے ہی سنائے جاتے۔ مجھ میں نہ تو اتنا یارا تھا کہ اُوپر والے کمرے کو ایئر کنڈیشنڈ کروا دوں اور نہ اتنی ہمت کہ ماں سے اپنا حق مانگوں۔

کبھی کبھی جب تپتی ہوئی دوپہر میں سر گیلے تولیے سے

ڈھانپنے میں تیسری چھت کے کمرے میں داخل ہوتا تو آفندہ بھرے غبارے کی طرح پھٹ پڑتی..... میں سر کے ساتھ منہ بھی لپیٹ لیتا اور سوچا کرتا.....

(اللہ کرے اس لڑکی کو آرام آ گیا ہو، زمانے کے سرد و گرم نے اس کو مایوس نہ کر دیا ہو، اب اس کے ٹھہراؤ میں تھوڑی سی لچک پیدا ہو گئی ہو)

آفندہ تیسری چھت کے اس کمرے میں لکشمی دیوی بن کر نہیں آئی تھی، چنانچہ ہم دونوں کشمکشِ حیات سے نبرد آزما رہے۔ یہیں پر اس نے مزید دو بچوں کو جنم دیا اور دو دفعہ میری نوکری جاتی رہی۔ ملازمت بھی آج کل کے زمانے میں پنسلین کا انجکشن بن گئی ہے۔ اگر راس نہ آئے تو خاتمہ کر دیتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مارنے سے وقت گزر رہا تھا مگر آسودگی شاید نصیب میں نہیں تھی۔ پھر جلنے کڑھنے والی اور ہر دم بچوں پر چیخنے چلانے والی آفندہ نے بیمار رہنا شروع کر دیا۔

غربت اور بیماری کا ساتھ ایک جیسا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سایہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے مگر بیماری کا سایہ غربت میں آگے آتا ہے۔ اس کی نت نئی شکایتوں نے مجھے اس سے بیزار اور دُور کر دیا۔ راتوں کو جب وہ مسلسل کھانسے جاتی تو میں بھرّا کر اپنے آپ سے پوچھا کرتا..... (کیا اس لڑکی کو آرام آ گیا ہو گا جسے ہلکی ہلکی کھانسی پریشان کیا کرتی تھی.....)

آخر وہ وقت آ گیا جب عزیزوں کے اصرار پر مجھے آفندہ کو ایک خیراتی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ چار سال سے وہ ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اب پانچواں سال لگا..... سات سال کی منی اور پانچ سال کا ککو میرے لیے مستقل سردرد بن کر رہ گئے تھے..... رات کو جب ککو ماں کو نہ پا کر رویا کرتا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا، اور دل میں دُعا کرتا.....

(اللہ کرے اس بکھری نکھری لڑکی کو آرام آ گیا ہو..... وقت اس پر مہربان ہو گیا ہو.....)

چھے ماہ پہلے ڈاکٹروں نے آفندہ کو جواب دے دیا۔ میں اسے گھر لے آیا۔ آج اس نے بہت خون تھوکا۔ اس کا چہرہ بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ مجھے بلا کر اس نے دونوں بچوں کے ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیے اور مجھ سے ہاتھ جوڑ کے اپنی سب کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے آفندہ کو غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے اس کی خوبصورتی کی قدر نہیں کی تھی۔ تیسری چھت کے بے درد کمرے اور اپنی کج روی سے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اگر میں اس کی پروا کرتا تو وہ ایک خدمت گار بیوی بن سکتی تھی۔ میں اس کو دوا، دُعا کچھ بھی نہ دے سکا۔ اب تو ڈاکٹروں نے اسے زیادہ باتیں کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

مگر اس نے کہا کہ وہ آج مجھ سے بے شمار باتیں کرنا چاہتی ہے..... خواہ اس کے بعد وہ کبھی نہ بول سکے۔ میں نے چاہا، آج میں بھی اسے جی بھر کر تسلی دوں اور اپنی بدسلوکیوں کا اعتراف کر لوں۔ اس سے اظہارِ محبت کروں اور کہوں..... ”آفندہ! فکر کیوں کرتی ہو، میں تمہیں ہر حالت میں بچا لوں گا۔ اللہ بے رحم نہیں۔ تمہیں اپنے دونوں بچوں کے لیے جینا ہو گا۔ میرے لیے زندہ رہنا ہو گا۔ میں تمہارے لیے کسی بہت اچھے اسپیشلسٹ کا بندوبست کروں گا۔ روپیہ پانی کی طرح بہا دوں گا۔ تمہیں ضرور آرام آ جائے گا۔ میں آج ہی تمہیں کسی بڑے اچھے اسپتال میں داخل کرا دوں گا۔ میں دن رات تمہاری پٹی کے ساتھ جڑ کر بیٹھا رہوں گا“.....

مگر یہ سب کہنے کے بجائے میں سوچ رہا تھا..... اللہ کرے وہ معصوم اور مغموم لڑکی بچ گئی ہو، اسے تیسری منزل کا منحوس کمرا نصیب نہ ہوا ہو، اللہ نے اس کو لمبی عمر دی ہو۔ اس کی آنکھوں کی نمی میں سوگواری کے بجائے چاند اُتر آیا ہو۔ اس کی کھانسی کو آرام آ گیا ہو..... اس کے پھیپھڑے پر پیر کی گٹھلی جیسا نشان مٹ گیا ہو..... وہ خوش و خرم ہو..... اس کے روشن چہرے سے کسی گھر کی پیشانی دمک رہی ہو!

◆◆◆

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں صرف پیتی ہوں

عابد معز

صبح سویرے بیگم اخبار پر جھکی نظر آئیں۔ محدب شیشہ کی مدد سے سطر بہ سطر انگلی رکھے وہ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ چند لمحے میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا کہ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہو کر خوشخبری سنائیں گی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ بیگم کی تلاش جاری رہی۔ آخر، اپنے تجسس کی تسکین کی خاطر مجھے پوچھنا پڑا۔

'آپ کیا تلاش کر رہی ہیں؟'

جواب آیا: ''آپ کا نام!''

میں چونک پڑا اور اخبار میں نام چھپنے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ میں نہ کوئی لیڈر ہوں اور نہ ہی کوئی وزیر اسمگلر ہوں اور نہ ہی نامی گرامی غنڈہ۔ کرکٹ کھلاڑی ہوں اور نہ ہی سٹہ باز۔ گلوکار ہوں اور نہ ہی شاعر۔ رپورٹر ہوں اور نہ ہی ایڈیٹر۔ فلمی ستارہ ہوں اور نہ ہی کوئی بزنس مین۔ بس گمنام سا ایک آدمی ہوں۔ وقت بے وقت میرا نام اخبار میں کیوں کر آئے گا؟ ہاں، اخبار میں نام شائع ہونے کی ایک آخری امید ہے جس کے لیے ابھی دیر ہے۔ کم از کم میں تو یہی چاہتا ہوں کہ دیر اور بہت دیر ہو۔ اب آگے اوپر والے کی مرضی!

لاٹری اور امتحان کے نتائج میں نام سے زیادہ نمبر کی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اہمیت ہوتی ہے اور حالیہ عرصہ میں میرا ایسا کوئی نمبر بھی نہ تھا جو اخبار کی زینت بن سکتا ہو۔ اپنے آپ سے الجھنے کے بجائے میں نے استفسار کیا: ”بیگم۔ آپ میرا نام کہاں ڈھونڈ رہی ہیں؟“

”فوربس میگزین نے ارب پتیوں کی فہرست جاری کی ہے۔ میں اس فہرست میں آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔“ بیگم نے جواب دیا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ بیگم کی اس حرکت کو میں کیا نام دوں؟ کیا یہ مزاح کے زمرے میں آتی ہے یا پھر مجھ پر کوئی طنز ہے۔ دونوں صورتوں کو مسکراتے اور ہنستے ہوئے برداشت کرنا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے کہا: ”میری ایسی قسمت کہاں! کیوں اپنا وقت برباد کر رہی ہیں۔ میں ارب پتی ہوں اور نہ ہی کروڑ پتی۔ میں صرف آپ کا پتی ہوں۔“

”کاش آپ میرے پتی ہونے کے ساتھ ارب پتی بھی ہوتے!“ بیگم نے اپنی مہم کو خیر باد کہتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے بڑ ہانکی: ”اور اگر میں چائے کی پتی ہوتا؟“

بیگم نے مجھے گھور کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں بے تکی بات کا جواب دینا نہیں چاہتی جبکہ میں بیگم کو حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ کیسا ’اعجوبہ‘ ہے! ہر دم زیادہ اور زیادہ کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ میں کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام بلکہ صبح سے صبح تک موصوفہ کے مطالبات کی تکمیل میں جتا رہتا ہوں۔ لکھ پتی اس لیے بھی نہ بن سکا کہ شاید بیگم ”لکی“ نہ تھیں اور میں ”لک“ (LUCK) پتی نہ تھا۔ اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ کوئی لکھ پتی، کروڑ پتی اور ارب پتی تک بن جاتے ہیں اور کوئی خالی پتی بھی نہیں بن پاتے۔ انھیں کوئی خاتون پتی بنانا گوارا نہیں کرتی! ویسے وہ بے چارے خوش قسمت ہوتے ہیں۔

میں ارادہ کر رہا تھا کہ بیگم کو قناعت اور شکر کا ایک لیکچر پلاؤں، بیگم نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دریافت کیا: ”ان ارب پتیوں کے پاس کتنی دولت ہوتی ہوگی؟“

”اربوں میں! بل گیٹس کے پاس جو دنیا کا دولت مند ترین شخص ہے، پچاس بلین ڈالر کا اثاثہ ہے۔ بھارت کے امیر ترین شخص لکشمی نواس متل کے پاس تیئس اشاریہ پانچ ارب ڈالر کا سرمایہ ہے۔“ میں نے معلومات سے بیگم کو مالا مال کیا۔

”یہ ارب اور بلین کیا ایک ہی ہیں یا الگ الگ ہیں؟“ بیگم نے سوال کیا۔

بیگم کے سوال پر مجھے حیرت ہوئی کہ انھیں گنتی نہیں آتی اور خواب ارب پتی بننے اور بنانے کے دیکھتی ہیں۔ میں نے بتایا: ”جی دونوں ایک ہی ہیں۔ ہم ارب کہتے ہیں اور فرنگی بلین۔“

”ایک کے بعد صفر، صفر، صفر، صفر، صفر، صفر، صفر، صفر اور صفر، پورے نو صفر ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ایک کے بعد نو صفر!“ بیگم نے دہرا کر کہا۔ ”اب بھی ایک ارب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ذرا اِسے آسان کیجیے، پلیز۔“

مجھے بیگم پر غصہ آنے لگا۔ بڑی نادان ہیں۔ لوگوں کے پاس موجود دولت کا اندازہ تک کرنا نہیں آتا۔ چونکہ انھوں نے پلیز کہا تھا تو مجھے بتانا ہی پڑا۔ ”ایک ارب میں سو کروڑ ہوتے ہیں اور ایک کروڑ میں سو لاکھ.....“

”لاکھ کو میں جانتی ہوں۔“ بیگم نے مجھے بیچ میں روک کر کہا۔ ”اس میں ایک سو ہزار ہوتے ہیں۔“

”جی خدا کا شکر ادا کیجیے کہ آپ ایک لاکھ کا اندازہ کر سکتی ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسم بامسمی لکشمی متل کے پاس دو ہزار تین سو پچاس کروڑ یعنی دو لاکھ پینتیس ہزار لاکھ ڈالر ہیں۔ اللہ رے! اتنی دولت۔ حساب کرنے اور سمجھنے کی کوشش

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے ہی میری تو سانس پھولنے لگی۔'' چند گہری سانسیں لے کر بیگم نے پھر سوال کیا: ''اتنے سارے ڈالر کے کتنے روپے بنتے ہیں؟''

''بیگم جب دولت زیادہ ہوتی ہے تو اس کا حساب ڈالر میں رکھا جاتا ہے۔ ڈالر کے مقابلہ میں روپیہ کیا چیز ہے۔ کبھی بھی لڑکھڑا سکتا ہے۔ یوں اگر آپ اندازہ کرنا چاہتی ہیں تو کچے حساب سے ایک ڈالر کو ساٹھ باسٹھ سے ضرب دیجیے۔''

بیگم کیلکولیٹر لے آئیں اور کچھ دیر تک کیلکولیٹر سے الجھنے کے بعد کہا: ''اس میں آٹھ سے زیادہ ہندسے نہیں آ رہے۔ ارب پتیوں کی دولت کا اندازہ کرنے سے کیلکولیٹر بھی قاصر ہے۔ شاید کمپیوٹر کی مدد لینا پڑے گا۔''

''بیگم اسی کیلکولیٹر پر صفروں کو ہٹا کر حساب کیجیے۔'' میں نے بیگم کو بڑا اور پیچیدہ حساب کرنے کا گُر بتایا۔

'جناب تو جینئیس ہیں۔ معلوم نہیں کیوں لکھ پتی تک نہیں بن پائے! خیر۔'' بیگم نے مجھ پر طنز کیا اور حساب کر کے بتایا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس آنکڑے کو کیسے بیان کیا جائے۔ یہی کوئی ایک کروڑ پندرہ بیس لاکھ، لاکھ روپے بنتے ہیں۔''

''یعنی؟'' اس مرتبہ میں نے سوال کیا۔

''ایک کروڑ بیس لاکھ مرتبہ لاکھ لاکھ روپے۔'' بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

ہمیں لاکھ تک گنتی کا تجربہ ہے۔ اس سے آگے کا حساب بھی لاکھوں میں سمجھائی دیتا ہے۔ اب کروڑوں میں لاکھوں ہیں تو عقل ساتھ نہیں دے رہی۔ بے زار ہوتے ہوئے میں نے کہا: ''اب اس حساب کو چھوڑیے۔ اندازہ ہوا کہ ارب پتیوں کے پاس بے حساب دولت ہے۔ وہ ہماری طرح جمع اور ضرب میں وقت نہیں گنواتے، ہر دم دولت بٹورنے میں مصروف رہتے ہیں۔ خواہ مخواہ کا حساب کرنے سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کیا اس غریب پتی کو ایک پیالی چائے مل سکتی ہے۔''

''ضرور۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے، کس حاتم سے سابقہ پڑا ہے۔ میں ابھی چائے لے آئی۔''

بیگم باورچی خانے میں چائے بنانے چلی گئیں تو میں کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کیے سستانے لگا۔ بند آنکھوں نے مجھے جاگتے خواب دکھانا شروع کیا۔ دیکھا کہ میرا نام بھی امراء کی فہرست میں شامل ہے۔ میں اپنے عالی شان محل نما دفتر میں بیٹھا ہوں۔ ارب پتیوں کی فہرست میں نام شامل ہونے پر صحافی میرا انٹرویو کر رہے ہیں۔ فوٹو گرافر میری تصویر بنا رہے ہیں اور کیمرا مین مجھے شوٹ کر رہے ہیں۔ ایک صحافی نے سوال کیا: ''آپ دولت مند کیوں کر بنے؟''

میں نے جواب دیا: ''میری بیگم کی خواہش تھی کہ ان کے پتی کا شمار ارب پتیوں میں ہو۔ پس شادی ہوتے ہی میں پس اندازی اور بیگم کو سرخرو کرنے میں جٹ گیا اور اُٹھتے بیٹھتے میں دولت مند بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ بس یہی ایک لگن تھی جس نے مجھے اس مقام پر پہنچایا۔''

''آپ اتنی دولت کا کیا کریں گے؟'' صحافی نے دوسرا سوال کیا۔

''اس دولت سے.....'' میں نے جواب دینا شروع کیا تھا کہ کپ پر چمچے سے دستک کی آواز سے میرا خواب چکنا چور ہوا۔ دیکھا تو بیگم چائے کی کپ پر چمچہ بجاتے کھڑی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ارب پتیوں میں شامل ہونے کی راہ میں بیگم حائل ہو گئیں۔ صبر کرنے کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سوچا کیوں نہ صحافی کا ادھورا سوال بیگم سے کیا جائے۔ میں نے بیگم سے پوچھا:

''اگر آپ کو اتنی دولت مل جائے تو آپ کیا کریں گی؟''

''کتنی دولت؟'' بیگم نے اُلٹا سوال کیا۔

''کروڑوں لاکھوں میں۔'' میں نے وضاحت کی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''کروڑوں لاکھوں میں کیوں؟ جب یوں ہی خیال کرنا ہے تو پھر اربوں میں کیوں نہیں۔ تصور میں تو کنجوسی نہ کیجیے۔''

عادت سے مجبور بیگم نے زیادہ رقم کا مطالبہ کیا۔

''چلیے مان لیا۔ آپ کے پاس اربوں ڈالر ہیں۔ آپ کیا کریں گی؟'' میں نے بیگم کو اربوں ڈالر رقم دے دی۔

''میں خریداری کروں گی۔''

''وہ تو اب بھی کرتی ہیں۔'' میں نے بیگم کو یاد دلایا۔

''اب کیا خاک شاپنگ ہوتی ہے۔ کئی اشیا کے دام پوچھ کر رہ جاتی ہوں۔'' بیگم نے شکایت کرنے بعد کہا، ''میں وہ تمام چیزیں خریدوں گی جن کی اب تک صرف قیمت دریافت کر کے صبر کیا ہے۔''

''شاپنگ کے علاوہ بتایئے۔'' میں نے سوال کیا۔

''میں شاپنگ کے علاوہ بھی شاپنگ ہی کروں گی۔ میں ڈھیر سارے کپڑے خریدوں گی۔ زیور خریدوں گی۔ جوتے خریدوں گی.....''

میں نے بیگم کو شاپنگ کی فہرست مکمل کرنے نہیں دی۔ ''یعنی آپ جیبہ للیتا کا ریکارڈ توڑنا چاہتی ہیں جس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں کپڑے اور کئی کلو زیور ہے۔ بہت زیادہ جوتے خرید کر آپ فلپائن کے سابق صدر کی بیوہ املڈا مارکوس کو مات دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ میں کس کس کا ریکارڈ توڑوں گی۔ آپ نے پوچھا تو میں نے بتایا۔ یوں بھی آپ نے کون سے حقیقی ڈالر دیے ہیں۔ صرف خواب ہی تو دکھا رہے ہیں۔'' بیگم ناراض ہونے لگیں۔

''اچھا اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بتایئے آپ اور کیا کریں گی؟''

''میں شاندار کوٹھی بناؤں گی۔ ایک نہیں، دو تین چار۔ کبھی اس گھر میں تو کبھی اُس گھر میں رہوں گی۔ نئی کاریں لوں گی۔ ہر سال ایک نئی کار۔ چھٹیاں باہر مناؤں گی۔ ناشتا ایک ملک میں اور ڈنر دوسرے ملک میں۔ بچوں کو امریکا اور لندن میں پڑھاؤں گی۔ دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچاؤں گی۔ سارے شہر کو دعوت دوں گی۔'' بیگم نے اپنی خواہشات گنوائیں۔

''اس کے باوجود بھی بہت ساری دولت بچ رہے گی۔ آپ اس کا کیا کریں گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں بقیہ دولت آپ کو سونپ دوں گی۔ آپ کی مرضی جو چاہیں کریں۔ میں تو گھر اور بچوں میں مصروف رہوں گی۔ اب آپ بتایئے میری دی ہوئی دولت کا آپ کیا کریں گے؟'' بیگم نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

''میں اتنی دولت کا کیا کروں گا؟'' چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے جواب دیا: ''دیکھیے بیگم! شاپنگ اور فضول خرچی سے قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح تو میں ارب پتی سے کروڑ پتی، کروڑ پتی سے لکھ پتی اور لکھ پتی سے قلاش پتی بن جاؤں گا۔ اسی لیے میں آپ کو شاپنگ کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں کچھ دولت باہر بینکوں میں رکھوں گا، کچھ سے سرمایہ کاری کروں گا، کچھ سے جائیداد بناؤں گا اور.....''

''اور کیا؟'' بیگم نے ٹوکا۔ ''اپنی دولت کو اِدھر اُدھر پھنسا کر ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزاروں گا!''

''کیا فرق پڑتا ہے؟ زندگی گزارنا مقصد ہے اور ہر کسی کی گزر ہو ہی جاتی ہے۔ چاہے وہ ارب پتی ہو یا قلاش پتی۔ اہم سوال ہے کہ زندگی کیسے گزاری؟ اس کا حساب تو بہت بعد میں ہوتا ہے۔'' میں نے بیگم کے اعتراض کا ایک فلسفی بن کر جواب دیا۔

''اصل میں ہمیں اس سوال کی تیاری کرنی ہے۔''

میرا جواب سن کر بیگم نے ہاتھ جوڑے۔

''مجھے معاف کریں۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے آپ کا نام غلط فہرست میں تلاش کیا.....'' اور وہ چائے کے کپ سمیٹ کر چلی گئیں۔ ◆◆◆

Nadeem Azeem
www.pakistanipoint.com

مولانا مجیب الرحمٰن

اُداس چہرہ، سفید ڈاڑھی، ہاتھ میں لاٹھی، کھال میں سلوٹ، چال میں سستی، بات میں لرزہ..... یہ معاشرے کا وہ کمزور طبقہ ہے، جسے ہم ''بوڑھا'' کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کئی مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے تک پہنچتی ہے۔ بڑھاپا گویا اختتامِ زندگی کا پروانہ ہے۔ اختتامی مراحل ہنسی خوشی پورے ہوں تو اس سے دلی تسلی ہوتی ہے اور رہن سہن میں بھی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن آج جو صورتحال سن رسیدہ افراد کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہے، اس سے بوڑھوں کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جن سے گھر میں خیر و برکت

والدین بچے کی پرورش اس امید پر کرتے ہیں کہ وہ بڑھاپے میں سہارا بنے گا۔ بجائے اس کے کہ لڑکا بوڑھے والدین کو سہارا دے، اکثر اوقات ان کی کمر بھی توڑ دیتا ہے۔ ایک جانب معاشرے کی یہ حالت ہے، دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کہ آپ ﷺ نے بوڑھوں اور کمزوروں کے ساتھ بہت ہی زیادہ حسنِ سلوک کا مظاہرہ فرمایا۔ جہاں آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ عمر رسیدہ افراد کی قدر دانی کی تعلیم دی، وہیں اپنے عمل کے ذریعے قدر دانی کا ثبوت بھی مہیا فرمایا۔

آپ ﷺ نے سن رسیدہ افراد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی کا تقاضا یہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہے کہ بوڑھے مسلمان کا اکرام کیا جائے (ابوداؤد: باب فی تنزیل الناس منازلھم)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کے بال اسلام کی حالت میں سفید ہوئے ہوں، اس کے لیے قیامت کے دن نور ہوگا۔'' (ترمذی: باب ماجاء فی فضل من شاب)

ان احادیث سے سن رسیدہ افراد کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اول الذکر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رسیدہ کو حاملِ قرآن وعادل بادشاہ پر بھی مقدم کیا؛ حالانکہ ان کی اہمیت وعظمت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے بوڑھوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کی حمایت فرمائی۔ دوسری حدیث میں بڑھاپے کے اثرات کا اخروی فائدہ بیان کیا کہ جس پر بڑھاپا اسلام کی حالت میں آیا ہو، اس کے لیے اللہ بڑھاپے کی قدردانی کرتے ہوئے روزِ محشر نور مقدر فرمائیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھوں کا اکرام واحترام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: ''چھوٹا بڑے کو سلام کرے، (بخاری: باب تسلیم الصغیر علی الکبیر) بزرگ کے اکرام واحترام کی ایک شکل سلام بھی ہے۔ بڑوں کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے چھوٹے ہی بڑوں کو سلام کیا کریں۔ مقصد یہ ہے کہ سلام چھوٹوں کی جانب سے بڑوں کے اکرام کا جذبہ ظاہر کرے اور دل بستگی کا سامان بھی ہو۔ کئی مقامات پر بزرگوں کو بچوں سے اسی بات کی شکایت ہوتی ہے کہ بچے انھیں سلام نہیں کرتے۔ فطری طور پر بڑے عزت کے طالب ہوتے ہیں، کیوں نہ ہم ان کے اس تقاضے کا لحاظ کرتے ہوئے سلام کے ذریعے ان کے جی خوش کردیں۔

مجالس میں کوئی مشروب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا لحاظ کیا کہ اس کو اولاً بڑے نوش فرمائیں۔ فرمایا: ''بڑوں سے آغاز کرو۔'' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مسواک کرتے ہوئے دو میں سے بڑے کو پہلے مسواک عنایت فرمائی (ابوداؤد: باب فی الرجل یستاک) نیز بزرگوں کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے فرمایا: ''اَلْبَرَکَۃُ مَعَ اَکَابِرِکُمْ'' کہ برکت تو تمہارے بڑوں کے ساتھ ہے۔''

کون ہے جو برکت کا متلاشی نہ ہو؟ کون ہے جو برکت کا طلبگار نہ ہو؟ آج تو کئی بے برکتی کے شاکی ہیں۔ ایسے میں برکت کے حصول کا آسان طریقہ کار یہ ہے کہ بوڑھوں کو اپنے ساتھ رکھا جائے، ان کے اخراجات کی کفالت کی جائے۔ اس سے آمدنی میں برکت ہوگی۔

نیز ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بات چیت میں بھی بڑوں کو موقع دیا کرو، کَبِّرِ الْکِبَرَ'' اس کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے فرمایا: ''بات چیت کا آغاز بڑے لوگوں سے ہو۔'' (بخاری: باب اکرام الکبیر)

ایک موقع پر بوڑھوں کے اکرام کے فضائل وفوائد ذکر کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نوجوان نے کسی بوڑھے کا اکرام اس کی عمر کی بنیاد پر کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بڑھاپے میں اکرام کرنے والا شخص مقرر فرمائیں گے۔'' (ترمذی: باب ماجاء فی اجلال الکبیر) کون ہے جو اپنا بڑھاپا ہنسی خوشی پورا نہیں کرنا چاہتا؟ کون ہے جو بڑھاپے میں خدمت گزاروں سے کتراتا ہے؟ کون ہے جو بڑھاپے میں آرام وسکون نہیں چاہتا؟ ان سب کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آسان نسخہ عنایت فرمایا کہ اپنے بوڑھوں کا اکرام کرو، تمہیں اپنے بڑھاپے کے وقت بھی خدمت گار مل جائیں گے۔

الغرض مختلف مواقع آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھوں کی اہمیت وعظمت کو واضح کیا اور امت کو ان پر توجہ دینے کی تعلیم دی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق ہیں کہ امت کے ہر کمزور طبقے پر بذاتِ خود بھی رحم وکرم کا معاملہ کیا اور وں کو بھی رحم وکرم سے پیش آنے کی تلقین فرمائی۔

www.pakistanipoint.com

آپ ﷺ کا طرزِ عمل:

ایک سن رسیدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنے والے کے لیے لوگوں نے مجلس میں گنجائش نہ پیدا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، بڑوں کی عزت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔'' (ترمذی: باب ماجاء فی رحمۃ الصغیر)

گویا ایک مسلمان میں جو صفات ہونی چاہیے، ان میں سے ایک بزرگوں کا اکرام بھی ہے۔ اگر کوئی اس وصف سے متصف نہیں تو وہ ایک اہم مسلمانی صفت سے محروم ہے۔ اگر کوئی اس صفت کا خواستگار ہے تو اسے بڑوں کے اکرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔

فتح مکہ کے بعد جو حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے، انھی میں ایک اہم واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بوڑھے والد کا بھی پیش آیا۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پر اسلام قبول کرنے کے لیے انھیں مجلس میں حاضر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے فرمایا: ''ان کو گھر ہی میں کیوں نہ چھوڑا؟ میں خود ان کے گھر پہنچ جاتا۔'' (مستدرک حاکم)

واضح رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود بوڑھوں کے ساتھ آپ ﷺ کا یہ رحیمانہ و کریمانہ سلوک ہے۔ حالانکہ دیگر فاتحین کا طرزِ عمل تو وہ ہے، جسے قرآن حکیم نے بیان کیا۔ ''جب فاتحین کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس بستی کو برباد کر دیتے ہیں، اہلِ عزت کو ذلیل کرتے ہیں، یہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔'' (النمل: ۳۴)

یہ عمر رسیدہ افراد کی عملی قدردانی ہے جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی تعظیم کرتے ہوئے یہ تصور نہ کیا کہ ابوقحافہ ایک طویل عرصہ تک کفر کی حالت میں رہے۔ اب کفر مغلوب ہوا تو وہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ بعض دفعہ انسان سابقہ اختلاف کی وجہ سے کسی کی تعظیم و تکریم سے کتراتا ہے۔ اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے اسوہ ہے کہ سن رسیدہ کی بہرصورت تعظیم کی جائے۔

نماز کے آپ ﷺ انتہائی حریص تھے۔ اس کے باوجود بوڑھوں کی رعایت میں نماز میں تخفیف فرما دی۔

ابومسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرنے لگے کہ میں ظہر کی نماز میں فلاں شخص کی طویل قرات کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتا۔ ابومسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس غضبناک کیفیت میں دیکھا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: ''نمازیوں میں نماز سے نفرت مت پیدا کرو، لہٰذا جو بھی شخص امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھایا کرے، کیونکہ اس میں کمزور بھی ہیں، بوڑھے بھی ہیں، ضرورت مند بھی ہیں۔'' (بخاری: باب اذا طول الامام وکان الرجل ذا حاجۃ)

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل قرات کی شکایت کی گئی تو آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا: ''فَتَّانٌ فَتَّانٌ! (بخاری: ۱۰۷ باب اذا طول الامام) اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والے ہو!'' تین دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کو دہرایا۔

غور و خوض کا مقام ہے کہ سن رسیدہ اور کمزور افراد کی رعایت کا سلسلہ نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی جاری ہے۔

بڑھیا کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھیا کا سامان اٹھا کر شہر مکہ کے باہر پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ وہ بڑھیا اسلام سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی میں مصروف تھی۔ لیکن

Sajjad Azeem
www.pakistanipoint.com

سکندرِ اعظم لاجواب ہوگیا

سکندرِ اعظم دنیا فتح کرنے جگہ جگہ پھر رہا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑے ملک پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ وہاں کا بادشاہ سکندر کی فوج سے بڑا لشکر رکھتا تھا مگر اس نے جنگ کے بجائے صلح کے لیے پیش قدمی کی۔ سکندر نے اس کا بھاری لشکر دیکھ کر کہا: "اگر تو صلح کے لیے آیا ہے تو اتنی بڑی فوج لانے کی کیا ضرورت تھی؟ معلوم ہوتا ہے، تیرے دل میں دغا ہے۔" بادشاہ نے کہا: "سکندر! دغا کمزوروں کا شیوا ہے۔ مقدر والے کبھی دغا نہیں کرتے۔ اپنی فوج ساتھ لانے کا مقصد یہ جتانا ہے کہ کسی خوف کی بنا پر اطاعت نہیں کر رہے، بلکہ اس لیے کہ فی زمانہ تیرا اقبال بلند ہے۔" سکندر نے صلح کا ہاتھ بڑھا دیا۔ بادشاہ نے پھر ایک پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا۔ بیش بہا لعل و جواہر قیمتی برتن میں بھر کر اس کے سامنے رکھ دیے گئے۔ بادشاہ نے کہا: "سکندرِ اعظم! کھایئے۔"

سکندر نے حیرت سے کہا: "لعل و جواہر انسان کی غذا نہیں ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا: "پھر آپ کیا کھاتے ہیں! تعجب ہے، کیا کھانے والی چیزیں آپ کے ملک میں نہیں ملتیں جو آپ اس قدر تکلیف و مصیبت برداشت کر کے دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے ہیں اور اپنے ساتھ بے شمار مخلوق کو عذاب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ آخر کیوں؟"

سکندر لاجواب ہوگیا۔

آپ ﷺ کی خدمت کے طفیل اس بڑھیا نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

ایک دفعہ مجلس میں بائیں جانب اکابر صحابہ کرام تشریف فرما تھے اور دائیں جانب ایک بچہ تھا۔ مجلس میں کوئی مشروب پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چکھ کر بچے سے اجازت چاہی کہ چونکہ تم دائیں جانب ہو، اگر تم اجازت دو تو میں اس کا آغاز ان بڑے صحابہ کرام سے کروں۔ بچے نے اپنے آپ پر کسی کو ترجیح دینے سے انکار کر دیا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مشروب اسی کے ہاتھ میں تھما دیا، (بخاری: باب من رای ان الحوض)

غور طلب امر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں جانب بڑوں کی موجودگی کے باوجود اس بات کی کوشش کی کہ مشروب کا آغاز بزرگوں ہی سے ہو۔ اس کے لیے بچے سے اجازت بھی مانگی؛ لیکن بچے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوش کردہ برکت کی وجہ سے اپنے آپ پر کسی کو ترجیح نہ دی۔ اس واقعے سے بھی بڑوں کے ساتھ اکرام کا درس ملتا ہے کہ بہر صورت ان کو عزت و احترام دیا جائے۔ ان کی توہین سے بیزارگی کا اظہار فرمایا۔

اقوال و احوال کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھوں کا ہر موقع پر لحاظ فرمایا۔ کسی بھی بوڑھے کا اکرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی بنیاد پر کیا۔ رشتے داری و تعلق سے بالاتر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سن رسیدہ کے اکرام کو ترجیح دی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانیت کے اس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کمزور طبقے کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا جائے۔ ان کے حقوق جان کر پورے کرنے کی کوشش کریں۔ کسی چیز کے ذریعہ بڑھاپے میں انھیں تکلیف نہ دیں۔ ان کی ضروریات پوری کر کے ان پر احسان کرتے ہوئے ان کی دعاؤں میں شامل ہوں۔ بعض دفعہ بوڑھوں سے ہونے والی خطائیں بھی نظرانداز کر دیا کیجیے۔

بزرگوں کا احترام خالص اسلامی نظریہ ہے۔ لہٰذا بزرگوں کا ادب واحترام اور عزت وخدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ معمر افراد کسی بھی قوم کا سرمایہ ہیں۔ ان کے تجربات نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کے قیمتی تجربے نوجوانوں کو ہی ملتے ہیں۔ آج جو جوان ہے کل وہ بچہ تھا۔ اسے جس نے پالا پوسا، اپنی جوانی اس کو جوان کرنے پر صرف کی، آج وہ بوڑھا ہے۔ وہ اپنی محنت ومشقت سے اولاد کو بڑا آدمی بنانے کے لیے ساری عمر کوشاں رہا۔ دیکھا گیا ہے کہ ان بزرگوں کی خوشیاں اکثر اوقات تلخیوں میں بدل جاتی ہیں۔ وہ پل پل جیتے اور پل پل مرتے ہیں۔ شاید ان کی ضرورت نہیں رہتی، اس لیے ان کو مرنے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ''اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اف بھی نہ کہنا اور انھیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑے ادب سے بات کیا کرو اور ان دونوں کے لیے نرم دلی سے عجز و انکسار کے بازو جھکائے رکھو اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے رہو، اے میرے رب، ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے (رحمت وشفقت سے) پالا۔'' (بنی اسرائیل۔ 23 تا 24)

ہم دیکھتے ہیں، کچھ بچے اپنے والدین کو بات بات پر ڈانٹتے ہیں۔ ایسے بچے دوسرے بزرگوں کا کیا احترام کریں گے؟ مسجدوں، مدرسوں، مزاروں، بازاروں، گلی محلوں میں بھیک مانگتے بزرگ ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں۔ کوئی پیٹ بھرنے کے لیے ایک وقت کا کھانا دیتا تو کوئی جھڑک ڈالتا ہے۔ اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ بزرگوں کو جھڑکا جائے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے بڑوں کی وجہ سے ہی ہم میں خیر و برکت ہے۔''

ایک رپورٹ کے مطابق بزرگوں کے لیے بہترین ملک کے طور پر ناروے نے اپنے ہمسایہ ملک، سویڈن کی جگہ لی ہے جو اب دوسرے نمبر پر ہے۔ تیسرے نمبر پر سوئٹزرلینڈ، چوتھے پر کینیڈا اور پانچویں پر جرمنی ہے۔ جبکہ پاکستان بدترین ممالک کی فہرست میں تیسرے نمبر پر ہے۔ یہ ہمارے لیے شرم کا مقام ہے۔

اقوام متحدہ کی رو سے 2050ء تک دنیا بھر میں معمر افراد کی تعداد دو ارب سے زائد ہو جائے گی۔ ان میں کروڑوں پاکستانی بھی ہوں گے۔ مگر پاکستان کے کسی بھی سرکاری ہسپتال میں شاید ہی بزرگوں کو علاج ومعالجے کے حوالے سے کوئی ترجیحی سہولتیں فراہم ہوتی ہوں۔ معمر افراد کو لمبی قطاروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح بینکوں میں پینشن لینے ان کو سارا سارا دن دھکے کھانے پڑتے ہیں۔

ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بوڑھے افراد کے لیے منفی رویے رکھیں، ان میں دل سے منسلک بیماریوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ تحقیق کے مطابق وہ نوجوان اور ادھیڑ عمر افراد جنھوں نے بوڑھوں کے لیے منفی رویوں کا اظہار کیا، انھیں اپنی آئندہ زندگی میں سٹروک، امراض قلب حملوں اور دوسری سنگین بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خطرہ اپنے ہم عمر ان افراد کی نسبت زیادہ رہتا ہے جو بوڑھے افراد کی جانب عمومی طور مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ ◆◆◆

www.pakistanipoint.com

جیرالڈ مور/فرزانہ نگہت

میں خود کو معاف نہیں کر سکتا

نومبر کی اس سرد صبح ترتالیس سالہ ٹرمز بڈ مضافاتِ نیویارک میں واقع اپنے گھر سے کچھ دوری پر پہاڑی سلسلے کے دامن میں پھیلے جنگل سے گزر رہا تھا۔ اس نے سر پر سبز اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کیموفلاج جیکٹ اور سیاہ پتلون کے ساتھ لانگ بوٹ زیب تن تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ قریبی دلدلوں میں ایک زخمی ہرن تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ زمین پر ایک فٹ برف پڑی تھی۔ ٹرمز کو شدید سردی لگ

برفانی پہاڑوں پر جنم لینے والی موت و حیات کی کشمکش کا سنسنی خیز قصہ

رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ سننے رُک جاتا تھا۔

وہ ایک تجربہ کار شکاری تھا۔ اب زخمی ہرن کو تلاش کر کے کھلی جگہ پر لانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سولہ سالہ بیٹے مارک سمیت دوسرے ساتھیوں کو بھی اس کی تلاش پر لگا دیا تھا۔

اچانک بندوق چلنے کی آواز فضا میں گونجی۔ ٹرمز سمجھا، اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا دی لیکن اس فائر کے وہ معنی نہیں تھے جیسا کہ ٹرمز کا اندازہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ گروہ کے دو افراد فرینک ڈریک اور ایلن پرسٹن زخمی ہرن کی تلاش میں غلط سمت جا نکلے۔ وہاں انھیں ایک اور ہرن دکھائی دیا۔ پرسٹن نے اپنے بجائے ناتجربہ کار اور اناڑی ڈریک کو اس پر فائر کرنے کا موقع دیا جس کا نشانہ چوک گیا تھا۔ ہرن بھاگ اُٹھا۔ اس کا رخ ٹرمز کی طرف تھا۔ ڈریک اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ اس کا دوسرا فائر بھی چُوک جائے۔ پرسٹن بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ اُٹھا۔

ہرن ٹرمز کی طرف دوڑتے دوڑتے ایک دم ہی مڑ کر دوسری طرف بھاگ اُٹھا۔ یوں وہ اسے نہ دیکھ سکا لیکن اس نے اُوپر سے کوئی چیز اپنے اوپر گرتے ضرور دیکھ لی۔ یہ برف کا ایک ڈھیر تھا جو اس کے اُوپر گرا اور اسے ڈھانپ لیا۔

ڈریک نے بھی برف کے اس ڈھیر کو گرتے دیکھا۔ ساتھ اس نے وہاں کوئی چیز بھی حرکت کرتے ہوئے دیکھی اور سمجھا کہ یہ وہی بھاگا ہوا ہرن ہے۔ اس نے زمین پر گھٹنا ٹیکا اور اُس متحرک شے کا نشانہ لیتے ہوئے اس پر گولی چلا دی۔

اسی وقت ٹرمز کی نظر ڈریک پر پڑی۔ اس نے اسے پکارنا چاہا لیکن اسی وقت اس نے بندوق سے نارنجی رنگ کا شعلہ نکلتے دیکھا۔ گولی اس کے ہاتھ کی جلد ادھیڑتی، پیٹ سے ہوتی ہوئی کمر سے نکل گئی۔ وہ پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ زخم سے تیزی سے خون بہنے لگا تھا۔ اُس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اب قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ زخم مہلک تھا۔ وہ اگر اس طرح وہاں پڑا رہا تو ضرور مر جائے گا۔

”مدد!“ وہ چلّایا۔ ”مدد! مدد۔“

ادھر جب ڈریک نے بندوق نیچے کی تو دیکھا کہ جس پر اس نے گولی چلائی تھی وہ کوئی ہرن نہیں تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑا۔ جب وہ پہاڑی ڈھلوان پر پہنچا تو وہاں ٹرمز کو خون میں نہائے ہوئے برف پر پڑے دیکھا۔ وہ فوراً ہی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے بچ جانے کی دعا مانگنے لگا۔ یہ دیکھ کر ٹرمز کے اضطراب اور اذیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ پھر باآواز بلند مدد کے لیے پکارنے لگا۔

ایلن پرسٹن جو ڈریک کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، فوراً ہی صورتحال سمجھ گیا۔ ”تم ٹرمز کے پاس ٹھہرے رہو، میں مدد لینے جاتا ہوں۔“ اس نے ڈریک سے کہا اور پہاڑی ڈھلوان اُتر کر ٹرمز کے گھر کی سمت بھاگ اٹھا۔

کیتھوشا ٹرمز کا پرانا دوست تھا۔ وہ بھی ایک ہرن کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے ٹرمز کی مدد کی پکار سنی تو فوراً بھاگ اُٹھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو عجیب ہی نظارہ دیکھا۔ ٹرمز پشت کے بل ہرن پر گرا ہوا تھا۔ اس کے زخموں سے مسلسل خون بہ رہا تھا اور وہ بار بار اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈریک اس کے قریب بیٹھا بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگ رہا تھا۔ اس نے ٹرمز کی کمر سے جیکٹ اور قمیص ہٹائی تو اسے پیٹ میں گولی کا سوراخ دکھائی دیا۔ یہ بے حد تشویشناک بات تھی لیکن اس وقت اس نے اپنے دوست کی ہمت بندھانا ضروری سمجھا۔

”تم ٹھیک ہو جاؤ گے بڈ..... تم ایک بے حد بہادر اور حوصلے والے آدمی ہو۔ تم زندہ رہو گے۔“ اس نے خون کا بہاؤ روکنے کے لیے زخم پر برف لگانی شروع کر دی۔ پھر اپنی جیکٹ اُتاری اور اسے ٹرمز کے گرد لپیٹ دیا۔

کیتھوشا جانتا تھا کہ اسے ٹرمز کو پہاڑی سے اُتارنے کے لیے مدد درکار ہو گی۔ موسم، جائے حادثہ اور ٹرمز کا دو سو پونڈ وزن تیزی سے نقل و حرکت کرنے میں رکاوٹ تھا۔ اس نے پارٹی کے دوسرے افراد کو متوجہ کرنے کے لیے وقفوں وقفوں سے تین تین

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فائر کرنے شروع کیے۔ ادھر پہاڑی کے دامن میں پہنچتے پہنچتے پرسٹن کو اپنا ایک ساتھی سیٹو سمتھ مل گیا۔ وہ دونوں پرسٹن کے ٹرک کی طرف بھاگ اُٹھے۔

☆☆☆

ٹرمز کی بیٹی تیرہ سالہ ٹیمی ریکارڈسن رہی تھی جب پرسٹن اور سمتھ دیوانہ وار گھر میں داخل ہوئے۔ بھاری برف باری کے سبب اسکول بند ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ گھر پر ہی تھی۔ ان کے یوں گھر میں گھس آنے پر وہ کچھ متحیر اور خوف زدہ سی ہوگئی۔ اندر آتے ہی سمتھ فوراً ہی فون کی طرف لپکا۔

''ایک حادثہ ہوگیا ہے!''

آپریٹر کو ایمرجنسی کال کرنے کے بعد اس نے ٹیمی کو صورتِ حال بتائی۔ بیٹی باپ کو گولی لگنے کا سن کر رو پڑی۔ دونوں نے اُسے دلاسا دیا اور کہا کہ اس کا باپ ضرور زندہ رہے گا۔ ٹیمی نے فوراً اپنی ماں کو فون کیا جو کام پر گئی ہوئی تھی۔

ٹرمز کو گولی لگنے کی خبر نے گھر کے آس پاس رہنے والوں کو بھی چونکا دیا۔ ہر قسم کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے تربیت یافتہ وہ لوگ فوراً حرکت میں آگئے۔ فون آپریٹر نے ایسٹ چیتھم والنٹیر ء فائر کمپنی کو فون کر دیا۔ وہاں سے رضا کار اپنے ٹرک اور ایمبولینس کی طرف دوڑ پڑے۔

اس دوران کیتھوشا کے اشاراتی فائروں نے پہاڑوں میں موجود آدمیوں کی ٹرمز کی طرف دوڑیں لگوا دی تھیں۔ شانے ان سب آدمیوں کے کوٹ لے کر ان میں ٹرمپ کو لپیٹ دیا جو اب بُری طرح کپکپانے لگا تھا۔

اس کا بیٹا مارک ٹرمز کچھ عرصہ پہلے ہی گھٹنے کی انتہائی تکلیف دہ چوٹ سے صحت یاب ہوا تھا۔ وہ سب سے آخر میں جائے حادثہ پر پہنچا۔ باپ کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل اس پر جھک گیا۔ ٹرمز نے اسے دیکھا اور بمشکل تمام اپنی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اپنی حالت سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''اگر میں نہ بچ سکا۔'' اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ ''تو تم اپنی ماں اور ٹیمی کا خیال رکھنا۔ میں جانتا ہو کہ تم ایسا کر سکو گے۔''

ان کے خاندان کا ایک پرانا دوست، جیری کالہان مارک کو ایک طرف لے گیا اور اسے کندھوں سے پکڑتے ہوئے بولا: ''تمہیں ہماری مدد کرنی ہے۔ تم نیچے سڑک پر جاؤ اور لوگوں کو حادثے کے بارے میں بتاتے ہوئے انھیں یہاں پہنچنے کو کہو۔''

وہ لوگ پھر درختوں کی ٹوٹی شاخوں سے اسٹریچر بنانے میں جت گئے۔ پھر انھوں نے دُور سے ایسٹ چیتھم فائر کمپنی کے سائرن کی آواز سنی۔ مدد آرہی تھی۔

وین گیرنگ، چیتھم ریسکیو سکواڈ کا ہیڈ سور ہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے حادثے کا سننے کے بعد اس نے فوراً ریڈیو کے ذریعے آس پاس مدد کا پیغام نشر کر دیا۔ ایل سمرز نے اپنی کار کے ریڈیو سے جواب دیا۔ وہ جائے حادثہ سے زیادہ دوری پر نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ گیرنگ گھر سے نکلتا، سمر نے اسے پیغام بھیجا کہ اسے کسی کی رفاقت درکار ہے۔ اس نے سڑک کی حالت دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اتنی زیادہ برف میں ٹرمز کو جائے حادثہ سے نیچے لانا بہت مشکل ثابت ہوگا۔

''والد کو فون کرو.....'' گیرنگ دروازے کا رخ کرتے ہوئے اپنی بیوی ڈورس سے بولا۔ ''ان سے کہو کہ وہ اگلے لوڈر سمیت اپنا ٹریکٹر لے آئیں۔ شاید انھیں پہاڑ تک پہنچنے کے لیے جھاڑ جھنکاڑ اور برف وغیرہ میں راستہ بنانا پڑے۔''

ایرک لیجر وال نے، جو اپنی ہتھیلی کی ہڈی اور تین پسلیاں ٹوٹ جانے کے سبب گھر پر پڑا تھا، ریڈیو پر نشر ہونے والا پیغام سنتے ہی بغیر ہچکچاہٹ کوٹ پہنا اور اپنے فور وہیل ٹرک پر سوار ہو گیا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ جلد از جلد جائے حادثہ کے قریب پہنچ کر ٹرمز کو نکال لانے میں کچھ مدد کر سکے گا۔

ٹرمز کا خون اب سست رفتاری سے بہہ رہا تھا لیکن زخموں سے ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ بے حال ہوا جا رہا تھا۔ آخر آدمیوں نے سٹریچر تیار کر لیا۔ اس وقت ایل سمرز بھی

www.pakistanipoint.com

جنگل سے نکل کر ان کی طرف چلا آیا۔ اس نے ہنگامی طبی امداد کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس لیے اپنا میڈیکل بکس ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ''اسے حرکت مت دو۔'' اس نے کہا۔ ''اس طرح حالت مزید بگڑ جائے گی۔''

جب تک سمرز ٹرمز کے زخموں کی مرہم پٹی کرتا رہا دوسرے آدمی تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ''کسی بھی لمحے یہاں مدد پہنچ جائے گی۔'' اس نے کہا۔ اسی وقت جنگل سے گڑگڑاہٹ اور چرچراہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ گیرنگ کے باپ فرینک کا ٹریکٹر تھا جو جنگل میں راستہ صاف کرتا چلا آ رہا تھا۔ دس منٹ بعد فائر کمپنی اور ریسکیو سکواڈ کے چھ مزید کارکن فرینک کے بنائے ہوئے راستے پر ایک اسٹریچر اٹھائے نمودار ہوگئے۔

انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے دس آدمیوں نے مل کر ٹرمز کو اٹھایا اور اسے جنگل کے کنارے کھڑے لیجرویل کے ٹرک میں منتقل کر دیا۔ لیجرویل بڑی احتیاط سے ٹرک چلاتا ہوا تازہ ہل چلائے راستے پر کھڑی ایمبولینس تک پہنچ گیا۔

مارک جو ایمبولینس کے قریب منتظر کھڑا تھا، دوڑ کر ٹرک کے پاس پہنچا اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ اس کا باپ ابھی زندہ تھا۔ اس نے دوسروں کی مدد سے اسے ایمبولینس میں سوار کروایا۔ اٹینڈنٹ ڈین کرماین نے ٹرمز کے چہرے پر آکسیجن ماسک لگا دیا۔ ''اندر بیٹھو اور سائرن بجاتے رہو۔'' سمرز نے مارک سے کہا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور لوگوں کے ہجوم، گاڑیوں اور فائر ٹرکوں کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔

گولی لگنے کے ایک گھنٹے بعد ٹرمز کو برک شائر میڈیکل سنٹر کی آپریشن ٹیبل پر لے جایا گیا۔ اسے وہاں پہنچانے کا انتہائی مشکل کام رضا کاروں، ٹرمز کے ہمسایوں اور دوسرے لوگوں نے انجام دیا۔ اب پیشہ ور لوگوں نے اپنا کام کرنا تھا۔

ڈاکٹر مائیکل کوہن نے دیکھا کہ گولی ٹرمز کے جسم سے گزرتی نکل گئی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ حرام مغز اور دیگر اعضائے رئیسہ سے بچ بچا کر نکلی۔

''اگر یہ اپنے راستے سے دو انچ بھی اِدھر اُدھر ہوتی تو یہ مہلک ثابت ہوتا۔'' آپریشن کے بعد انھوں نے مارک اور ٹرمز کی بیوی، میری سے کہا تھا۔

حادثے کے پانچ دن بعد ٹرمز ملاقاتیوں سے ملنے کے قابل ہوگیا۔ سب سے پہلے فرینک ڈریک اس سے ملنے آیا۔ وہ اپنے کیے پر بے حد نادم ہی نہیں، دکھی بھی تھا۔

''میں اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا بڈ......'' اس نے ٹرمز سے کہا۔ ''میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا فرینک......تم دھوکے میں آ گئے۔ تم پہلے کی طرح میرے دوست رہو گے اور ہم اکٹھے جنگلوں میں شکار کھیلنے جایا کریں گے۔'' ٹرمز نے کہا۔

بیشتر لوگوں کے خیال میں حادثے سے بچا جا سکتا تھا۔ ٹرمز کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ چمکدار لباس اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کچھ کے خیال میں یہ ڈریک کی ناتجربہ کاری تھی۔ کچھ کے نزدیک نامکمل منصوبہ بندی اس کا سبب تھی۔ اچھی یا بری قسمت کا بھی اس میں دخل تھا۔ ٹرمز ریاست نیویارک کے ساڑھے چار لاکھ لائسنس یافتگان میں سے ایک تھا۔ اس سال اُسے ملا کر نوے کے قریب شکاری حادثاتی طور پر گولی کا نشانہ بنے تھے۔ ان میں سے سات مر گئے۔

حادثے کے آٹھ دن بعد ٹرمز گھر آ گیا۔ وہاں اس کے دوستوں مددگاروں نے پُرجوش استقبال کیا۔ مقامی میتھوڈسٹ چرچ نے اس کے گھر شاندار ڈنر بھجوایا۔ جبکہ سیٹو سمتھ ایک بکرا پکوا کر لایا۔ صحت یابی کے بعد ٹرمز پر ہر طرف سے تحفے تحائف کی بارش ہوگئی۔ لوگوں نے اس کے لیے اپنی بھرپور محبت کا مظاہرہ کیا۔ کیتھوشا نے اس موقع پر کہا:

''انسانیت کی معراج یہ ہے کہ ہر کسی کی مصائب و ابتلا میں مدد کی جائے۔ ہمدردی کرتے ہوئے اس کی خاطر تکلیف بھی اُٹھا لی جائے۔'' ●●●

ماہر القادری

بہار آئی تو لوٹ آئے خواب سارے

وطنِ عزیز کے نامور شاعر، صحافی، محقق اور نقاد، ماہر القادری 30 جولائی، 1907ء کو کیسر کلاں ضلع بلند شہر، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اصل نام منظور حسین تھا۔ عملی زندگی کا آغاز حیدر آباد دکن سے کیا، پھر بجنور چلے گئے۔ جہاں مدینہ بجنور اور غنچہ کے مدیر رہے۔ زندگی کا بڑا حصہ حیدر آباد دکن، دہلی، بمبئی میں گزرا اور پھر مستقل قیام کراچی میں رہا۔ 1928ء میں ریاست حیدر آباد کے مختلف محکموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک بار نواب بہادر یار جنگ نے قائداعظم محمد علی جناح سے ان کا تعارف یوں کرایا ''میری تقریروں اور ان (ماہر القادری) کی نظموں نے مسلمانانِ دکن میں بیداری پیدا کی ہے۔''

1943ء میں حیدر آباد سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں فلمی دنیا میں کچھ عرصہ گزارا۔ کئی فلموں کے گیت لکھے جو مقبول ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور علمی جریدے فاران کا اجرا کیا جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔ 12 مئی 1978ء کو وفات پائی۔ مولانا ماہر القادری کے شعری مجموعوں میں ظہورِ قدسی (نعتیہ مجموعہ)، طلسمِ حیات، محسوساتِ ماہر، نغماتِ ماہر، نقشِ توحید اور جذباتِ ماہر شامل ہیں۔ حج کے مشاہدات و تاثرات پر کاروانِ حجاز کے نام سے کتاب تحریر کی۔ آپ کا سلام بہ حضور اکرم ﷺ بہت مشہور ہوا۔ فنِ تبصرہ نگاری پر خصوصی عبور حاصل تھا۔ فاران میں اہلِ علم و اہلِ ادب کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کیا کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ پیشِ خدمت ہے۔

ظہورِ قدسی ﷺ

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین ﷺ

سحر کا وقت ہے، معصوم کلیاں مسکراتی ہیں
ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں
مئے عشرت چھلکتی ہے ستاروں کے کٹوروں سے
ابلتی ہے شرابِ خلد، مٹی کے سکوروں سے
کھنچی جاتی ہے آنکھوں میں گل و لالہ کی رعنائی
کہ جیسے درحقیقت خاک پر جنت اتر آئی
لٹاتے ہیں دُرِ خوش آب گلزاروں کے فوارے
خوشی سے جگمگاتے ہیں ثوابت ہوں کہ سیارے
بہارِ شبنمِ گل چور ہے کیفِ جوانی میں
نہا کر جیسے آئی ہے ابھی کوثر کے پانی میں

ممتاز شاعر، ماہر القادری کا نوبہ نو موضوعات سے سجا خوبصورت کلام

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

خوشی کے گیت گائے جا رہے ہیں آسمانوں پر
درودوں کے ترانے ہیں فرشتوں کی زبانوں پر
سجائی جا رہی ہے محفلِ ہستی قرینے سے
وہ جلوے کارفرما ہیں گزر جائیں جو سینے سے
طرب کے جوش سے ایک ایک ذرہ مسکراتا ہے
زمیں کی آج قسمت پر فلک کو رشک آتا ہے
زمیں سے آسماں تک نور کی بارش ہی بارش ہے
کسی کی بے نیازی آج سرگرمِ نوازش ہے
ستاروں کے کنول جلوہ فگن رنگین و سادہ ہیں
فرشتے بہرِ استقبال ہر سو استادہ ہیں
اشارے ہو رہے ہیں گلشنِ جنت کے پھولوں میں
وہ رعنائی نظر آتی ہے، مکہ کے بولوں میں
برستے ہیں گہر انوار کی میزاب رحمت سے
کبوتر رقص میں ہیں بامِ کعبہ پر مسرت سے
مسرت کے اثر سے مثلِ صبحِ خلد ہیں خنداں
حرم کے در، منا کی وادیاں، عرفات کا میداں
ابھی جبریلؑ اترے بھی نہ تھے کعبہ کے منبر سے
کہ اتنے میں صدا آئی یہ عبداللہ کے گھر سے
مبارک ہو شہِ ہر دو سرا تشریف لے آئے
مبارک ہو محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لے آئے
مبارک ہو غمگسارِ بیکساں تشریف لے آئے
مبارک ہو شفیعِ عاصیاں تشریف لے آئے
مبارک ہو نبی آخری تشریف لے آئے
مبارک ہو جہاں کی روشنی تشریف لے آئے
مبارک ہادیء دینِ مبین تشریف لے آئے
مبارک رحمت اللعالمین تشریف لے آئے
مبارک رہبروں کے پیشوا تشریف لے آئے
مبارک صدرِ بزمِ انبیاء تشریف لے آئے
مبارک دست گیرِ بے نوا تشریف لے آئے
مبارک دردمندوں کی دعا تشریف لے آئے
مبارک مخبرِ صادق لقب تشریف لے آئے
مبارک سید والا نسب تشریف لے آئے
مبارک خاتمِ پیغمبراں تشریف لے آئے
مبارک ہو امیرِ کارواں تشریف لے آئے
مبارک زندگی کا مدعا تشریف لے آئے
مبارک ہو کہ محبوبِ خدا تشریف لے آئے
مبارک پیکرِ صبر و رضا تشریف لے آئے
مبارک جدِ شاہِ کربلا تشریف لے آئے
مبارک قبلہء اربابِ دیں تشریف لے آئے
مبارک صادق الوعد و امیں تشریف لے آئے
مبارک صبح کو شمس الضحیٰ تشریف لے آئے
مبارک رات کو بدرالدجیٰ تشریف لے آئے
مبارک کاشفِ اسرارِ حق تشریف لے آئے
مبارک مظہرِ انوارِ حق تشریف لے آئے
مبارک حسن کو حسنِ ادا تشریف لے آئے
مبارک عشق کو جانِ وفا تشریف لے آئے
مبارک ہو رسولِ محتشم تشریف لے آئے
مبارک ہو نبیء محترم تشریف لے آئے
مبارک قاسمِ خلد و جناں تشریف لے آئے
حریمِ قدس کے ساکن کہاں تشریف لے آئے
وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی
وہ آئے جن کی آمد کے لیے بے چین فطرت تھی
وہ آئے نغمہء داؤد میں جن کا ترانہ تھا
وہ آئے گریہء یعقوب میں جن کا افسانہ تھا
وہ آئے مہرِ عالمتاب تھا جن کا حسیں چہرا
وہ آئے جن کے ماتھے پر شفاعت کا بندھا سہرا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ آئے جن کی خاطر مضطرب تھی وادیٔ بطحا
وہ آئے جن کے سجدوں کے لیے کعبہ ترستا تھا
وہ آئے جن کو ابراہیم کا نورِ نظر کہیے
وہ جن کو اسماعیل کا لختِ جگر کہیے
وہ آئے جن کے آنے کو گلستاں کی سحر کہیے
وہ آئے جن کو ختم الانبیاء خیر البشر کہیے
وہ آئے جن کے ہر نقشِ قدم کو رہنما کہیے
وہ آئے جن کے فرمانے کو فرمانِ خدا کہیے
وہ آئے جن کو رازِ کن فکاں کا پردہ در کہیے
وہ آئے جن کو حق کا آخری پیغامبر کہیے
یا ایہا الَّذِینَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیہِ وَسَلِّمُوا تَسلِیماً
سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر کہ دشمن کو حیات جاوداں دے دی
سلام اس پر، ابوسفیان کو جس نے اماں دے دی
سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اس پر، ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اس پر، وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر، جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر، جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر، جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اس پر جو دنیا کے لئے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اس پر کہ جس کی ذات فخرِ آدمیت ہے
سلام اس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی
سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اس پر بُروں کو جس نے فرمایا کہ "میرے ہیں"
سلام اس پر کہ جس کی چاند تاروں نے گواہی دی
سلام اس پر کہ جس کی سنگپاروں نے گواہی دی
سلام اس پر شکستیں جس نے دیں باطل کی فوجوں کو
سلام اس پر کہ ساکن کر دیا طوفاں کی موجوں کو
سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اس پر کہ جو خود بدر کے میداں میں آیا
سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت، اوجِ دارائی
سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانہ میں
پڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں
سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے
درود اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اس پر کہ جس کے تذکرے ہیں پاکبازوں میں
درود اس پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں
درود اس پر جسے شمعِ شبستانِ ازل کہیے
درود اس پر ابد کی بزم کا جس کو کنول کہیے
درود اس پر بہارِ گلشنِ عالم جسے کہیے
درود اس ذات پر فخرِ بنی آدمؑ جسے کہیے
رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ ﷺ کہیے

Maqbool Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ جس کو ہادیء دع ما کدر خذ ما صفا کہیے
درود اس پر کہ جو ماہر کی امیدوں کا ملجا ہے
درود اس پر کہ جس کا دونوں عالم میں سہارا ہے

❁

زندگی میں جو کوئی سخت مقام آتا ہے
اس گھڑی لب پہ محمد ﷺ کا نام آتا ہے
صبر کر اے دلِ بے تاب نہ اتنا گھبرا
اب کوئی دم میں مدینہ سے پیام آتا ہے
میں سرِ حشر کچھ اس شان سے پہنچا ماہر
شور اٹھا کہ محمد ﷺ کا غلام آتا ہے

بہار

ہر سمت حسن شاہدِ قدرت ہے آشکار
شادابیوں کا جوش ہے رنگینیٔ بہار
یوں جھومتا ہے سبزۂ خوابیدہ بار بار
جیسے کسی حسین کی آنکھوں میں ہو خمار
رشکِ عروسِ نو ہیں درختوں کی کونپلیں
غیرت گہہِ بہشت ہے دامانِ کوہسار
ہر شاخ مثلِ برقِ تپاں کانپتی ہوئی
ہر پھول کیا ہے ایک بھڑکتا ہوا شرار
رنگینیوں میں ڈوب گئی ہے کلی کلی
دوشیزۂ بہار ہے گلشن سے ہم کنار
روحِ گلاب کے ہیں قرابے کھلے ہوئے
ہر پھول عطر بیز ہے ہر شاخ مشکبار
شادابیوں میں چور ہیں صحرا کے خار و خس
رعنائیوں میں غرق ہیں گلشن کے برگ و بار
ہنگامۂ بہار پہ روتا ہے میرا دل
ماہر میں سوچتا ہوں جب اس کا مآلِ کار

موجِ کوثر

اک اچٹتی نگاہ ڈال گئے
گر رہا تھا مجھے سنبھال گئے
حشر کو روزِ دید ٹھہرا کر
آج کی بات کل پہ ٹال گئے
دل دیا، دل کو لذتِ غم دی
ساری آفت مجھی پہ ڈال گئے
اپنی اک اک ادا کی چاہی داد
میری باتیں ہنسی میں ٹال گئے
اس ادا سے وہ بے نقاب ہوئے
ایک پردہ نظر پہ ڈال گئے
مجھ کو بیدل بنا کے وہ ماہر حسرتِ زندگی نکال گئے

❁

نورو ظلمت

منزلِ دل پاس بھی اور دور بھی
آدمی مختار بھی، مجبور بھی
اک ذرا قاتل کے تیور دیکھنا!
کچھ پشیماں اور کچھ مغرور بھی
یہ جہانِ آب و گل، یہ کائنات
شامِ ظلمت بھی ہے، صبحِ نور بھی
تیشۂ فرہاد سے آئی صدا
جان دینا فرض بھی، دستور بھی
ان کے جلوؤں کے بہت سے نام ہیں
برقِ فاراں بھی، چراغِ طور بھی
آپ کی ہستی بھی ماہر راز ہے
ملک میں بدنام بھی، مشہور بھی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کیا چاہیے!

ہم کو قرآنی حکومت چاہیے
پاک اور سچی سیاست چاہیے
ایک صف میں ہوں غریب و مالدار
یعنی فاروقی عدالت چاہیے
جس نے دنیا میں سمویا دین کو
اس پیغمبر ﷺ کی شریعت چاہیے
غم کا طوفاں بھی گزر ہی جائے گا
مسکرا دینے کی عادت چاہیے

❁

دردِ اُلفت کو بہ ہر صورت چھپانا چاہیے
زخم کھا کر بھی خوشی سے مسکرانا چاہیے
دردمندوں کو مصیبت سے چھڑانا چاہیے
آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیے
مسکرا کر ہر قدم آگے بڑھانا چاہیے
پیچ و خم سے راہ کے گھبرا نہ جانا چاہیے
غم کے طوفانوں میں کب سے لے رہا ہے کروٹیں
وہ سفینہ جس کو اب تک ڈوب جانا چاہیے
میری پیشانی ہو کیوں آلودۂ دیر و حرم
میرے سجدوں کو تمہارا آستانہ چاہیے
یہ تو اک پردہ ہے درد و غم چھپانے کے لیے
تم کو میری مسکراہٹ پر نہ جانا چاہیے
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست
اس لیے مجھ پر نوازش غائبانہ چاہیے
آج اشکِ خوں میں ان کے تصور کی جھلک
اب تو میری شامِ غم کو جگمگانا چاہیے
سیکڑوں مفہوم رکھتی ہے وہ چشمِ التفات
دیکھنے والوں کو دھوکے میں نہ آنا چاہیے

❁

ترے روشن تبسم کا جو افسانہ سنا دیتے
فضائیں جگمگا اٹھتیں، ستارے مسکرا دیتے
اگر وہ بھول کر بھی رخ سے پردے کو اٹھا دیتے
یہ ذرے خاک کے بھی خون کا دریا بہا دیتے
چمن کے پھول ہنس ہنس کر صدائے مرحبا دیتے
وہ ایسے میں اگر ''صبحِ بہاراں'' گنگنا دیتے
نظر پردہ، وفا پردہ، محبت سر بسر پردہ
ہمارا بس اگر چلتا تو ہر پردہ اٹھا دیتے
وہ خود آگاہ ہو جاتے کہ وہ کیا ہیں زمانے میں
نظر کو اک گھڑی بھر کے لیے گویا بنا دیتے
مرے ساقی! اگر تیری نظر حائل نہ ہو جاتی
ترے میخوار، پیمانے صراحی سے لڑا دیتے
وہیں کعبہ چلا آتا، وہیں جنت اتر آتی
ترے در کے گدا جس خاک پر بھی سر جھکا دیتے
دلِ مجروح، چشمِ خونفشاں، اسبابِ ویرانی
عطا کی کوئی حد بھی ہے مجھے وہ اور کیا دیتے
جسے اردو زباں کی تنگ دامانی کا شکوہ ہے
ذرا تم اس کو ماہر کی غزل پڑھ کر سنا دیتے

❁

ضمیر نے کہا

جس سفینہ کی ترے قبضہ میں پتواریں نہ ہوں
اس سفینہ کو ڈبو دے، بادباں کو توڑ دے
رو میں تنکے کی طرح بہنا تو کچھ مشکل نہیں
بات تو جب ہے کہ طوفانوں کے رخ کو موڑ دے
خود تری تدبیر ہی خلاق ہے تقدیر کی
کون کہتا ہے خدا پر زندگی کو چھوڑ دے

❁

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں
محبت کی فضا ہے اور میں ہوں
تری تیغ جفا ہے اور میں ہوں
وفاؤں کا صلہ ہے اور میں ہوں
ستم پرور ہے آغازِ محبت
غموں کی انتہا ہے اور میں ہوں
ارے توبہ مصائب کا تسلسل
غمِ صبر آزما ہے اور میں ہوں
کوئی دیکھے مری الفت پرستی
طوافِ نقشِ پا ہے اور میں ہوں
کہوں کس سے میں اپنا حال ماہر
مقدر کا گلہ ہے اور میں ہوں

❁

رازِ غم، رازِ خوشی معلوم ہونا چاہیے
کچھ نہ کچھ تو زیست کا مفہوم ہونا چاہیے
آرزوئے مرگ میں بھی ہے سکونِ دل نہاں
ہر خوشی سے عشق کو محروم ہونا چاہیے
سوزِ دل کی آگ سے تم دور رہ سکتے نہیں
یہ محبت ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیے
شکوۂ بیداد بھی اک طرح کا ہے انتقام
عشق کو مظلوم ہی مظلوم ہونا چاہیے
شعر ہے دراصل ماہر ترجمانِ واردات
دل پہ جو گزرے وہی منظوم ہونا چاہیے

❁

کانٹوں کی کھٹک دیکھ، نہ پھولوں کی مہک دیکھ
ہے تیز ہوا، شاخِ نشیمن کی لچک دیکھ
یہ قمری و طاؤس کے نظارے کہاں تک
رم خوردہ غزالوں کے بھی پلکوں کی جھپک دیکھ
تو جا تو رہا ہے طرفِ میکدہ اے دوست!
کر دے نہ تجھے مست پیالوں کی کھنک دیکھ
اوچاندنی راتوں کے پرستار، ادھر آ
ڈوبے ہوئے قسمت کے ستاروں کی چمک دیکھ
تقدیر کے اسرار بتائے گا تجھے کون
آئینۂ امروز میں فردا کی جھلک دیکھ

❁

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے
آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے
سرو و صنوبر سب کو دیکھا
ان کا سا انداز کہاں ہے
دل خوابیدہ، روح افسردہ
وہ جوشِ آغاز کہاں ہے
پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلی ساز کہاں

❁

کانٹوں کی کھٹک دیکھ، نہ پھولوں کی مہک دیکھ
ہے تیز ہوا، شاخِ نشیمن کی لچک دیکھ
یہ قمری و طاؤس کے نظارے کہاں تک
رم خوردہ غزالوں کے بھی پلکوں کی جھپک دیکھ
تو جا تو رہا ہے طرفِ میکدہ اے دوست!
کر دے نہ تجھے مست پیالوں کی کھنک دیکھ
اوچاندنی راتوں کے پرستار، ادھر آ
ڈوبے ہوئے قسمت کے ستاروں کی چمک دیکھ
تقدیر کے اسرار بتائے گا تجھے کون
آئینۂ امروز میں فردا کی جھلک دیکھ

◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نوشی گیلانی

سی ایس ایس کا امتحان

سی ایس ایس سے مُراد سینٹرل سُپیریئر سروسز امتحان ہے۔ مقابلے کا یہ امتحان ہر سال فروری مارچ میں وفاقی حکومت کے ادارے فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی جانب سے لیا جاتا ہے۔ یہ اِمتحان وفاقی حکومت کے ماتحت مختلف محکموں یا سروسز میں بنیادی اسکیل 17 کی آسامیوں کی تقرری کی خاطر ہوتا ہے۔

گریڈ 17 میں تقرری کے بعد آپ ترقی کرتے ہوئے گریڈ 22 (وفاقی سیکریٹری کے عہدے) تک پہنچ سکتے ہیں۔

سی ایس ایس امتحان میں بیٹھنے کے لیے اہلیت کا تعین درج ذیل عوامل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

تعلیمی قابلیت

مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی خاطر کم از کم تعلیمی قابلیت کسی بھی مضمون میں گریجوایشن (سیکنڈ ڈویژن) ہونی چاہیے۔ گریجوایشن میں تھرڈ ڈویژن رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ انھوں نے کسی بھی مضمون میں ماسٹر ڈگری سیکنڈ ڈویژن کے ساتھ حاصل کر رکھی ہو۔ بیرونِ ممالک سے تعلیم حاصل کر کے سی ایس ایس کا امتحان دینے والے پاکستانیوں کو ہائر ایجوکیشن کمیشن سے ایکویلنسی حاصل کرنا ہوگی۔

عمر کی حد

2020ء میں مقابلے کا اِمتحان دینے والوں کے لیے عمر کا تعین 31 دسمبر 2019ء کی بنیاد پر کیا گیا۔ ایسے امیدوار جو 31 دسمبر تک کم از کم 21 سال کے ہو چکے مگر 31 سال سے کم ہیں تو وہ یہ امتحان دینے کے اہل ہیں۔ سرکاری ملازمین کو عمر میں دو سال کی رعایت مجوزہ قوانین کی روشنی میں دی جاتی ہے۔

ہر امیدوار کے پاس یہ اِمتحان دینے کے تین مواقع ہوتے ہیں، یعنی اگر آپ پہلی کوشش میں ناکام ہو جائیں تو دوسری بار اور اگر خدانخواستہ دوسری کوشش میں بھی کامیابی حاصل نہ کر پائیں تو تیسری اور آخری کوشش کا موقع دیا جاتا ہے، بہ شرط عمر کی حد آپ کو اجازت دے۔

امتحان کے مراحل

تحریری امتحان، میڈیکل ٹیسٹ، سائیکالوجیکل ٹیسٹ اور زبانی ٹیسٹ ہونے کے بعد حکومت کی طرف سے میرٹ پر مختلف محکموں میں ملازمت کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے۔

تحریری امتحان اسلام آباد اور چاروں صوبوں کے دارالحکومتوں کے علاوہ مظفر آباد سمیت دیگر بڑے شہروں میں بھی ہوتے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہیں۔تحریری امتحان پاس کرنے والا ہی میڈیکل ٹیسٹ، سائیکالوجیکل ٹیسٹ اور زبانی ٹیسٹ دینے کے لیے کوالیفائی کرتا ہے۔

تحریری امتحان اور میڈیکل پاس کرنے والوں کا پھر 300 نمبروں کا نفسیاتی اور زبانی ٹیسٹ ہوتا ہے۔سی ایس ایس کے مجموعی نمبر 1500 ہوتے ہیں، جن سے میرٹ کی فہرست بنتی ہے۔

امتحان کن لوگوں کے لیے ہے؟

انسان کے کچھ دکھانے کا دارومدار اس کے رجحان (Aptitude) پر ہوتا ہے۔آپ میں سے کون مقابلے کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کرسکتا ہے، اس سلسلے میں امکانی طور پر مندرجہ ذیل خصوصیات نتیجہ اخذ کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

مطالعے کا شوق

مقابلے کا امتحان دینے کے لیے یہ ایسی بنیادی خصوصیت ہے، جس کے بغیر غالباً کامیابی ممکن نہیں۔اگر آپ کو مطالعے کا شوق نہیں یا پڑھنے لکھنے میں دل نہیں لگتا تو آپ کو سی ایس ایس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ امتحان میں پاس ہونے کے لیے آپ کو روزانہ باقاعدگی سے 12 تا 14 گھنٹے مکمل توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔

صرف یہی نہیں، امتحان پاس کرنے کے بعد دورانِ ملازمت بھی آپ کو اپنے شعبے سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے پڑھتے رہنا ہے، ورنہ پیچھے رہ جائیں گے۔

انگریزی کی اہمیت

یہ بات کسی کو اچھی لگے یا بری لیکن اگر آپ درست انگریزی بولنا بالخصوص لکھنا نہیں جانتے تو آپ کے لیے یہ امتحان پاس کرنا ممکن نہیں۔اُردو، سندھی، عربی اور فارسی کے اختیاری مضامین کے علاوہ آپ کو تمام مضامین کے پرچے انگریزی میں دینے ہیں۔ پرچے چیک کرتے وقت ممتحن خاص طور پر آپ کی گرامر اور درست الفاظ کے استعمال کرنے کی صلاحیت کو پرکھتا ہے۔

معلوماتِ عامہ

نہ صرف تحریری امتحان بلکہ انٹرویو کے دوران بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی معلوماتِ عامہ (جنرل نالج) کیسی ہے۔امتحان میں آپ کو دیے گئے مضامین میں سے کوئی بھی سوال کیا جاسکتا ہے۔معلوماتِ عامہ ان لوگوں کے لیے ایک انتہائی مشکل مضمون ہے، جو مطالعہ کا شوق نہیں رکھتے۔مثلاً اگر آپ روزانہ اخبار کا مطالعہ نہیں کرتے تو آپ کو معلوم نہیں ہوگا کہ آپ کے شہر، ملک، خطے اور دنیا بھر میں سیاست، معیشت، بین الاقوامی تعلقات اور سائنس و ٹیکنالوجی وغیرہ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔اگر آپ تاریخ کا مطالعہ رکھتے ہیں، ساتھ ہی حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے تو آپ کے لیے معلوماتِ عامہ آسان مضمون ثابت ہوگا۔

لکھنے کی صلاحیت

سی ایس ایس امتحان کے ایک بڑے حصے میں آپ کو لکھنا پڑتا ہے۔آپ کو سوال کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں جامع انداز میں لکھنا ہے۔لکھنے کی صلاحیت بہتر بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ روزانہ ایک مضمون پڑھ کر اسے ایک بار ضرور لکھیں۔اس طرح نہ صرف آپ کی لکھنے کی رفتار تیز ہوگی بلکہ آپ بہتر لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کر پائیں گے۔

نظم و ضبط

سی ایس ایس کا امتحان دینے کی خاطر آپ کو رضاکارانہ طور پر نظم و ضبط کا واضح نظام وضع کرنا پڑتا ہے۔اس میں سستی، کاہلی اور اپنے شیڈول سے ہٹ جانے کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہوتی۔سی ایس ایس کے امتحان کی بھرپور تیاری کے لیے آپ کو کم از کم ایک سے ڈیڑھ سال تک دن رات بھرپور تیاری کرنی ہوتی ہے، جس کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

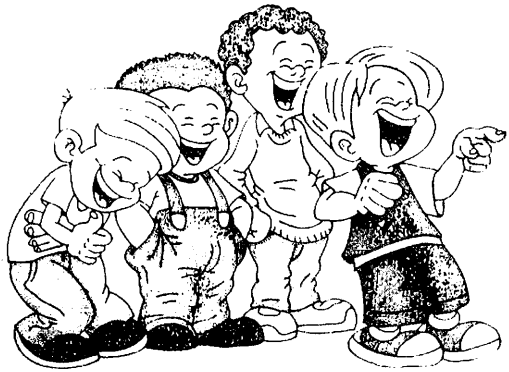

مایوسی کا علاج ہنسی!

آپریشن تھیٹر میں مریض کو دیوار پر ایک پھول کا ہار نظر آیا۔ مریض نے دریافت کیا کہ: "یہ پھول کا ہار کس کے لیے.....؟"

ڈاکٹر نے کہا: "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپریشن کامیاب رہا تو یہ پھول کا ہار مجھے ڈالا جائے گا اور اگر ناکام رہا تو آپ پر"۔

"پسند"

سیالکوٹ کے مشاعرے میں اسٹیج پر شاعروں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو لوگ اسٹیج سے اتر کر قریب ہی رکھے جوتوں کے ایک میں سے اپنے اپنے جوتے نکال کر پہننے لگے، جو آپس میں خاصے گڈمڈ ہو چکے تھے۔ طفیل ہوشیار پوری کو اپنے جوتے ڈھونڈنے میں خاصی دشواری درپیش تھی۔ وہ بار بار بہت سے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

قریب کھڑے ایک نوجوان شاعر کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ اس نے پوچھا: "طفیل صاحب! آپ جوتا تلاش کر رہے ہیں یا پسند کر رہے ہیں؟"۔

اس کے بس کا.....!

کنور مہندر سنگھ بیدی جن دنوں دہلی کے مجسٹریٹ تھے، ان کی عدالت میں چوری کے جرم میں گرفتار کئے گئے ایک نوجوان کو پیش کیا گیا۔ کنور صاحب نے نوجوان کی شکل دیکھتے ہوئے کہا: "میں ملزم کو ذاتی طور پر جانتا ہوں، ہتھکڑیاں کھول دو، یہ بیچارہ تو ایک شاعر ہے، شعر چرانے کے علاوہ کوئی اور چوری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں"۔ ◆◆◆

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

امتیاز احمد

ماتم دُنیا

یہ خوشی کی بات تھی یا پھر اس کی دنیا لٹ چکی تھی؟ لوگ اس کے ساتھ اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ ظاہری طور پر محمد شریف بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز تھا۔ نہ جانے کیوں وہ متاعِ زندگی لٹانے کے بعد خود کو دنیا کی فکروں سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ یہ حقیقت شریف پر آج کھلی تھی کہ خواہشوں اور ضرورتوں کے ریتلے راستے اُسے اس صحرا میں لے آئے تھے، جس کی گلیاں قبر کے بند اور اندھیرے کمروں میں آ کر ختم ہوتی ہیں۔

جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، شریف کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اسے لگا جیسے صدیوں سے یہ منوں مٹی اس نے دیمک لگے شہتیروں کی طرح اپنے کمزور اور لاغر کندھوں پر اُٹھا رکھی تھی۔ برسوں سے یہ بوجھ اس کے سر پر تھا۔

شریف سارا دن مزدوری کرتا تھا۔ جون جولائی کی سخت دھوپ میں تین منزلہ عمارتوں تک 16، 16 اینٹیں دابڑے میں ڈال کر لے جاتا۔ ہر روز شام کو سیمنٹ، بجری، ریت، گاڈر اور پھٹے اُٹھانے کا بوجھ ختم ہو جاتا لیکن یہ عجیب بوجھ تھا، نہ دن کو ہلکا ہوتا نہ رات کو۔

ہر رات کسی حقے میں جلتے بجھتے کوئلے کی طرح شریف کی آنکھیں گھنٹوں نیند کا انتظار کرتیں لیکن دماغ اپنی ہی جمع تفریق میں مصروف رہتا۔ جہیز کہاں سے آئے گا؟ لال گوٹے

www.paksociety.com

ایک باپ کا دلخراش فسانہ، احساسِ ذمہ داری نے اسے نیم دیوانہ بنا چھوڑا تھا

والا سوٹ، ٹرنک، بستر، کھیس، سلائی مشین اور ایسی ہی درجنوں چیزیں گھنٹوں کسی درزی کی قمیص کے ساتھ لٹکے رنگ برنگے دھاگوں کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہتیں۔

پچھلے سال نکلنے والی کمیٹی سے ابھی تک ایک چھت والا پنکھا اور ایک ڈنر سیٹ ہی تو خریدا تھا، باقی سامان کیسے بنے گا؟ کوثر سے کہا بھی تھا کہ ڈنر سیٹ نہ خریدو، فضول خرچی کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اس کی جگہ رضائیاں بنالی ہوتیں تو زیادہ اچھا رہتا لیکن آج کل کی اولاد تو ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے۔ جتنا مرضی سمجھالو، مرضی آخر کار انھیں اپنی ہی کرنا ہوتی ہے۔ سردیوں، گرمیوں، بادلوں، ہوا، آندھی سے بے نیاز شریف کی ہر رات ایسے ہی سوالوں کے ستاروں سے سجی رہتی اور وہ گھنٹوں کسی سرکاری اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھنے والے بچے کی طرح ان کو گنتا رہتا۔

کوثر روزانہ جھاڑو دیتے ہوئے دبے دبے لفظوں میں کہتی کہ ابا پورا صحن گندا نہ کیا کر۔ تھوکیں ایک ہی جگہ پھینکا کر۔ ابا روزانہ 'اوٹھیک ہے' کی ہلکی سی آواز نکالتا اور یوں کبھی نہ ختم ہونے والا یہ فعل اس دن کے لیے ختم ہو جاتا۔

شریف اندھیرے کی نمازیں ہمیشہ گھر پر ہی پڑھتا۔ اندھیرے میں اسے ہمیشہ اس خزانے کے لٹنے کا ڈر رہتا، جسے وہ خود کسی کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ بیٹی کی حفاظت کو فریضہ سمجھتا تھا اور اس کی ادائیگی میں اس نے آج تک کوتاہی نہیں کی تھی۔

چوڑے سینے اور سپاٹ چہرے والا مستری یوسف شریف کا پرانا دوست تھا۔ شریف جب بے روزگاری کے مارے اپنا آبائی گاؤں نیاز پور چھوڑ کر نوشہرہ ورکاں آیا تھا، تو اس کی پہلی دیہاڑی مستری یوسف کے ساتھ ہی لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سرخ گالوں والا مستری یوسف ٹھکیدار کہلانے لگا لیکن شریف اپنے عہدے پر ہی فائز رہا۔ شریف نے کئی بار سوچا کہ وہ بھی مزدوری چھوڑ کر مستریوں کا کام سیکھ لے لیکن اس کے لیے اسے کسی کی شاگردی اختیار کرنا پڑتی۔ شاگرد ہمیشہ مفت میں کام کرتے، جو شریف کے لیے ناممکن تھا۔

ٹھکیدار یوسف کی جب بھی لین دین پر اپنے بھائیوں سے لڑائی ہوتی تو وہ شریف ہی کو ساری داستانیں سناتا تھا اور شریف اس کی ہر ناجائز بات پر بھی یہی کہتا کہ قصور تمہارے بھائیوں کا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شریف اسے اچھا لگتا تھا۔ مستری یوسف کو جہاں بھی ٹھیکہ ملتا، وہ شریف کو مزدوری کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ جن دنوں یوسف کو کام نہ ملتا شریف بھی بس گھر ہی پڑا رہتا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی اور ٹھیکے دار کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اس کو تو ہر آدھے گھنٹے بعد سگریٹ کے وقفے کی ضرورت ہوتی تھی۔

برسوں سے گاؤں کے کچے پکے راستوں پر چلنے والے تانگے کی طرح اس کی ہڈیاں بھی ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جب بھی وہ اُٹھتا اس کی ہائے ضرور نکلتی۔ 'کے ٹو' سگریٹ کی چار روپے والی ڈبیا اس کا آخری سہارا تھی۔ انتہائی کڑوے تمباکو والے سگریٹ کے لمبے لمبے کش اس کے لیے آکسیجن کا کام کرتے۔ لاہور کے گنگا رام اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کینسر کے مریض کی طرح اسے پکا یقین تھا کہ جس دن وہ آکسیجن بھرے سگریٹ چھوڑ دے گا، اسی دن اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

شریف آج پھر کام سے گھر واپس آتے ہوئے صدیق حلوائی کی دکان سے آدھا کلو برفی لایا تھا۔ کوثر دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ آج پھر اسے کوئی دیکھنے آرہا ہے۔

اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے بسی اور غم تھا۔ بالکل ویسا غم جیسا کسی میلے میں ماں سے جدا ہو جانے والے تین سالہ بچے کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ ماں کے گلے لگ کر ہچکیاں باندھ کر رونا چاہتی تھی؟ پتا نہیں کیوں وہ پاؤں زمین پر رگڑتے ہوئے کوئی بات منوانا چاہتی تھی۔ کوثر دس برس کی تھی کہ اس کی ماں دمے کی بیماری سے چل بسی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تب سے لے کر آج تک ہزاروں ایسی راز و نیاز کی باتیں دل کے قبرستان میں دفن تھیں۔ یہ ساری باتیں وہ رو رو کر اپنی ماں کو بتانا چاہتی تھی۔

ماں کی وفات کے بعد اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ ابا سے کہے، وہ بالیاں لینا چاہتی ہے لیکن کہہ نہ سکی۔ اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ پلاسٹک کی پھولوں والی چپل کے بجائے ہیل والی جوتی پہنے مگر وہ خاموش ہی رہی۔ کئی بار سوچا کہ چھوٹی عید پر فیروزی کپڑوں کے ساتھ ہم رنگ چوڑیاں پہنے لیکن ایسی عید کبھی نہ آئی۔ اب تو بھولے سے بھی کوئی خواہش اس کی زباں پر نہ آتی تھی۔ شاید مقدروں کا کھیل اسے سمجھ آ چکا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اور اس کا ابا مل کر بھی ستارے نہیں گن سکتے۔ وہ جانتی تھی کہ ابا کو رات بھر نیند کیوں نہیں آتی؟ ابا کے سفید بالوں اور کیکر کی الٹی ہوئی سخت ٹہنیوں کی طرح جھکے ہوئے کندھوں کی وجہ شاید وہ جان چکی تھی۔ اسے پتا تھا کہ کوّے روزانہ منڈیر پر بیٹھ کر اسے کیا پیغام دیتے ہیں؟ وہ جان چکی تھی کہ ابا جس خزانے کی حفاظت پر معمور ہے، اس کی چوری کے لیے بھی کوئی نہیں آئے گا۔

کبھی کبھی کوثر ماں کے بارے میں سوچتی تو اسے وہ دن بھی یاد آتے، جب اماں اپنے ہاتھوں سے سرسے کی لمبی لمبی سلائیاں اس کی آنکھوں میں ڈالتی تھی۔ کوثر کو آج تک وہ دن بھی نہیں بھولا، جب ماں اس کے لیے ایک روپے کا جامنی رنگ والا ہیئر بینڈ لے کر آئی تھی۔ اس دن وہ کس قدر خوش تھی۔ ہر دو منٹ بعد پلاسٹک کے فریم میں جڑے ہوئے چھے روپے والے شیشے میں اپنے بال اور چہرہ دیکھتی اور پھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسٹاپو کھیلنا شروع کر دیتی۔

اس دن کتنی چمک تھی کوثر کی آنکھوں میں لیکن آج اس کی آنکھوں میں دسمبر کی دھند لی، ٹھنڈی اور یخ بستہ راتوں جیسی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ ان سے کبھی کبھار کوئی پتھریلا آنسو گرتا، تو پتا چلتا کہ ان میں کوئی رہتا ہے اور ان خشک آنکھوں کا یہ مکین بھی کوثر کے جامنی رنگ کو کے تک پہنچتا پہنچتا دم توڑ دیتا۔ وہ ایک ہی ڈرامے کا ایک ہی منظر پچھلے سات برس سے دیکھتی آ رہی تھی۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس ڈرامے کا کوئی منطقی انجام نہیں۔ شاید وہ مقدر کا کھیل سمجھ چکی تھی۔

شریف کھانستے ہوئے بولا: ''یہ لے مٹھائی رکھ لے۔ آج میرے کچھ جاننے والے آ رہے ہیں اور تو بھی منہ پر ٹھنڈے پانی کے چار چھینٹے مار لے۔ مہمان ایسے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟''

کوثر نے اخبار کا بنا ہوا کاغذی لفافہ پکڑتے ہوئے بوڑھے باپ کی سیاہ و سفید ڈاڑھی اور سلوٹوں والے چہرے پر نظر ڈالی اور جی ابا جی کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ ابے کو بتانا چاہتی تھی کہ اندر سے یہ مٹھائی کتنی کڑوی ہے۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ صدیق حلوائی اس میں مٹھاس نہیں کڑواہٹ ڈالتا ہے۔ جو کوئی بھی کھاتا ہے، اسے پسند کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پتا نہیں اسے کس چیز نے روکا ہوا تھا اور وہ پھر خاموش ہی رہی۔

شریف نے اپنی میلے سے آسمانی رنگ والے کرتے کی بغل والی جیب سے 'کے ٹو' سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ سگریٹ منہ میں رکھ دونوں ہاتھوں سے پیالی بناتے ہوئے ماچس کی تیلی سے سلگایا اور نیم کے نیچے بچھی چارپائی پر بیٹھ کر لمبے لمبے کش لگانے لگا۔

برسوں سے بارش اور دھوپ میں پڑی رہنے والی یہ میلی گھسی چارپائی شریف کا وزن خاموشی سے برداشت نہ کر پائی اور ایک دم شریف کی ہڈیوں کی طرح اس سے بھی چوں چراں کی کئی آوازیں نکلیں۔ شریف کے بیٹھتے ہی اس پر پڑی چڑیوں کی سوکھی بیٹیں اُلٹ بازیاں کھاتی ہوئی اس کے بے ترتیب انگلیوں والے پیروں کے قریب اکٹھی ہو گئیں لیکن شریف ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بے نیاز لمبے لمبے کش لینے اور گرمی دور کرنے میں مصروف رہا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کیا کہا......!

ایک خاتون اپنے شوہر کو ڈاکٹر کے پاس لائی۔ پورا چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اس خاتون کو علیحدہ کمرے میں لیے جا کر بتایا کہ تمھارے شوہر کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ انھیں خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کا بہت خاص خیال رکھا جائے، کسی قسم کی فکر یا پریشانی والی بات جس سے ان کو صدمہ ہو نہ سنائی جائے اور ان کی غذا کا خاص خیال رکھا جائے۔ اچھی غذائیں اور پھل وغیرہ دیں۔ اگر میری صلاح تم مان کر 6 ماہ تک تیارداری کرو گی تو مجھے امید ہے کہ اندرون چھے ماہ میں وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ گھر جاتے وقت شوہر نے بیوی سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب نے تمھیں علیحدہ لے جا کر کیا کہا تھا؟

بیوی: ''کچھ خاص نہیں! یہی کہا کہ آپ بہت جلد مرنے والے ہیں۔''

آج واقعی بڑی گرمی تھی۔ اسے کئی بار کام چھوڑنا پڑا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے یوسف ٹھیکیدار کا، جو یاری بیلی میں کام پر ساتھ لے جاتا، ورنہ آج کل بوڑھوں کو کون کام دیتا ہے؟ ابا کوئلے سے چلنے والی ٹرین کی طرح کبھی ناک اور کبھی منہ سے دھواں نکالتا رہا اور کوثر نیم کے گرے تیکھے نکیلوں والے پتوں کو گم سم دیکھتی رہی۔

کوثر اس دن بڑی خوش تھی، جب پہلی مرتبہ اس کا رشتہ دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ مہمانوں کے آنے سے ایک دن پہلے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ گھر کے بیرونی دروازے کے کلیجی رنگ کے پردے سے لے کر چارپائیاں تک اس نے دھو ڈالی تھیں۔ نلکے اور غسل خانے کی لال رنگ کی اینٹوں والا پکا فرش رگڑ رگڑ کر صاف کیا تھا۔ ٹوٹی نالیوں والی تنگ گلی میں کھلنے والے داخلی دروازے کے سامنے لگی سرکاری اینٹیں بھی باقی گلی کی اینٹوں سے الگ نظر آ رہی تھیں۔

ساری رات خوشی کے مارے اس کی آنکھوں نے ایک پل کے لیے بھی سونا گوارا نہ کیا۔ اس رات اس نے کیا کیا نہیں سوچا تھا۔ میں کل کون سے کپڑے پہنوں گی؟ پچھلی عید پر نیلے رنگ کے پھولوں والا، جو کاٹن کا سوٹ لیا تھا، وہ ٹھیک رہے گا۔ اس پر لیس بھی تو لگی ہے اور ابھی نیا ہی تو لگتا ہے۔ پتا نہیں میرے وہ دیکھنے میں کیسے ہوں گے؟ میں ان کے ساتھ ساتھ چلوں گی تو بھلا کیسی لگوں گی؟ میرا قد بھی تو ان سے بڑا نہیں ہونا چاہیے۔ بھلا لمبی قد والی لڑکیاں چھوٹے قد والے لڑکوں کے ساتھ کہاں جچتی ہیں۔ شادی والے دن لال رنگ کے گوٹے والے سوٹ کے ساتھ سلمہ ستاروں والا دوپٹہ ٹھیک رہے گا اور لال رنگ کی سرخی بھی تو لینی پڑے گی۔

رضیہ کو ساتھ لے کر بازار جاؤں گی۔ مجھے تو کچھ کہتے ہوئے بھی بہت شرم آئے گی۔ وہ مجھے منہ دکھائی پتا نہیں کیا دیں گے؟ اگر دو ماشے کا سونے والا لاکٹ ہوا تو پورے محلے کی لڑکیوں کو بتاؤں گی۔ اگر میرے ہاں بیٹی ہوئی تو میں اسے ضرور فیروزی رنگ کے سوٹ کے ساتھ میچنگ والی چوڑیاں ہی لے کر دوں گی۔ عید پر تو اسے ہیل والی جوتی ضرور لے کر دوں گی۔ یہ پلاسٹک کی چپل بھی بھلا کوئی عید پر پہنتا ہے؟

آغاز اور انجام سے بے نیاز اسی طرح کے ہزاروں خیال اس کے ذہن میں آئے تھے۔ اس روز کوثر کی پکی سہیلی رضیہ خاص طور پر اسے مہندی لگانے آئی تھی۔ اس رات دیر تک وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے کان میں کچھ راز کی باتیں کرتی اور پھر ہنستی رہی تھیں لیکن آج تو رضیہ بھی نہیں تھی، جو اسے مہندی لگاتی اور راز کی وہ باتیں کرتی، جو صرف سہیلیاں ہی ایک دوسرے سے کر سکتی ہیں۔ رضیہ کی شادی کو دو سال گزر چکے تھے لیکن کوثر کی خواہشوں نے ابھی اپنے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

خیالوں اور کیکر کے دروازے کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔

اسے دیکھنے کے لیے درجنوں مہمان آئے لیکن صدیق حلوائی کی مٹھائی کا جادو کسی پر نہ چل سکا۔ کسی کو گھر اچھا نہ لگا تو کسی کو لڑکی پسند نہ آئی، کسی کو برادری میں منہ دکھانے کے لیے جہیز چاہیے تھا تو کسی کو آٹو میٹک واشنگ مشین کی شدید ضرورت تھی، کسی کو ہمسائے اچھے نہ لگے اور کسی کو تنگ گلی میں بارات لانے میں دشواری تھی۔

آج بھی کوثر کو یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح یہی کچھ ہوگا لیکن وہ اُٹھی اور بغیر صابن منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد چٹیا بنا کر واپس آئی اور ایلوں کی جان لے لے کر سیاہ ہو جانے والے مٹی کے چولہے کے سامنے بیٹھ گئی۔

محمد شریف بھی اُٹھا اور نلکے سے پانی نکال ہاتھ منہ دھونے لگا۔ شریف کے ہاتھوں اور بانہوں کے سنہرے بال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ کڑکتی دھوپ میں مستریوں کے ساتھ وہ ایک عرصے سے کام کر رہا ہے۔ اس نے سرمئی رنگ کے میلے کچیلے تہبند کو ایک ہاتھ سے تھوڑا سا اُوپر اُٹھایا اور مٹی سے اَٹے ہوئے پاؤں فرش پر لگی اینٹوں کے ساتھ رگڑ رگڑ کر دھونے لگا۔ اس کی ایڑیوں میں ایسی دراڑیں پڑ چکی تھی، جیسے زلزلہ آنے کے بعد کچے مکانوں کی دیواروں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مغرب کی اذان کے بعد شریف نماز پڑھ رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ سمجھ گیا کہ کون ہو سکتا ہے۔ شریف نے سلام پھیرا اور دروازے کا کواڑ کھولنے بھاگا۔ وہ آدھا کلو مٹھائی لے آیا۔ آدھے گھنٹے بعد مہمان رخصت ہوئے تو شریف ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی چپل پہن کر گلی کے نکڑ تک انھیں چھوڑنے بھی گیا۔

جمیل صاحب آپ کو ہمارا گھر پسند تو آیا؟ شریف کی پُرنم آنکھوں میں اور خشک ہونٹوں پر ایک عجیب سی التجا تھی۔ اسی ایک سوال کے پیچھے وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اپنے نئے مہمانوں کے سامنے وہ ایک ہی وقت میں قیام، رکوع اور سجدہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ شریف کا دل اندر ہی اندر دہائیاں دے رہا تھا، اللہ کے واسطے میری بیٹی کا رشتہ لے لو۔ شریف کے کان ہاں جیسا تین ہندسی لفظ سننے کے لیے کئی برسوں سے ترس رہے تھے۔ روز بروز قوتِ سماعت سے محروم ہوتے ہوئے یہ کان آج بھی یہ لفظ سننے سے محروم ہی رہے۔

چائے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے کوثر کی نظریں ان پر بنے ہوئے رنگ برنگے پھولوں پر جمی رہیں۔

''ابا لوگوں سے کہو کہ وہ اب ہمارے گھر پر نہ آیا کریں۔'' آج کوثر میں اتنی ہمت پتا نہیں کہاں سے آئی تھی۔ وہ تو ابا کے سامنے کبھی بولی ہی نہیں تھی۔ وہ تو اسے بے ادبی اور جہنم کا سامان سمجھتی تھی۔ آج پتا نہیں وہ کیوں یہ بے ادبی کر رہی تھی۔ کیا وہ دوزخی ہونا چاہتی تھی؟ اپنی آخرت کو بھلا ایسے کون خراب کرتا ہے؟

''بیٹے ایسے نہیں کہتے، مہمان تو رب سچے کی رحمت ہوتے ہیں۔ اس طرح کہنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ منہ سے نکلی ہوئی بات کسی وقت بھی قبول ہو سکتی ہے۔'' شاید یہ قبولیت ہی کی گھڑی تھی۔ آج کی رات بھی شریف ڈنر سیٹ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ڈنر سیٹ خرید کر غلطی کی۔ اس کی جگہ چار رضائیاں بن سکتی تھیں۔

کوثر کو بھی آج پتا چل چکا تھا کہ اسے کو نیند کیوں نہیں آتی اور ڈنر سیٹ خرید کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ کوثر کی چارپائی ابا سے تو قریب تھی لیکن وہ باتیں اپنی اماں سے کر رہی تھی۔ وہ اپنی اماں کے گلے لگ کر سارے دکھڑے سنا رہی تھی۔ آج واقعی قبولیت کی گھڑی تھی۔ گھر میں پڑی گندم کی زہریلی گولیاں شاید صدیق حلوائی کی برفی سے زیادہ میٹھی تھیں۔

◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

انشائیہ

ڈاکٹر وزیر آغا

دسترخوان کی مدح میں!

ایک زمانہ تھا کہ اہلِ وطن فرش پر دسترخوان بچھاتے، آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھانا کھاتے۔ پھر جوزمانہ بدلا تو ان کے نیچے کرسیاں اور سامنے میز بچھ گئی، جس پر کھانا چن دیا جاتا۔ پہلے وہ سر جوڑ کر کھاتے تھے، اب سروں کے درمیان فاصلہ نمودار ہوا اور روبرو بیٹھا ہوا شخص مدمقابل نظر آنے لگا۔ مگر زمانہ کبھی ایک حالت میں قیام نہیں کرتا۔ چنانچہ اب کی بار جو اس نے کروٹ لی تو سب سے پہلے پلیٹ کو ہتھیلی پر سجا کر اور سر و قد کھڑے ہو کر طعام سے ہم کلام ہونے کی روایت قائم ہوئی، پھر ٹہل ٹہل کر اس پر طبع آزمائی ہونے لگی۔

انسان اور جنگل کی مخلوق میں جو ایک فرق پیدا ہو گیا تھا کہ انسان ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا جبکہ جنگلی مخلوق چراگاہوں میں چرتی پھرتی تھی اور پرندے دانے دنکے کی تلاش میں پورے کھیت کو تختۂ مشق بناتے تھے، اب باقی نہ رہا اور مدتوں کے بچھڑے ہوئے سینہ چاکانِ چمن ایک بار پھر اپنے عزیزوں سے آملے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا ہماری تہذیب کا گراف نیچے سے اوپر کی طرف گیا ہے؟ تو

ایک دیرینہ ثقافتی ورثے کی داستان الم جس سے ہم عزیزِ مصر جیسا سلوک کرنے لگے ہیں

میں کہوں گا کہ بے شک ایسا ہرگز نہیں ہوا، کیونکہ ہم نے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کی روایت ترک کر کے کھڑے ہو کر اور پھر چل پھر کر کھانا کھانے کے دیرینہ کو اپنا لیا ہے جو چرنے یا دانہ دنکا چگنے ہی کا ایک جدید روپ ہے۔ کسی بھی قوم کے اوپر جانے یا نیچے آنے کا منظر دیکھنا مقصود ہو تو یہ نہ دیکھیے کہ اس کے قبضہ قدرت میں کتنے علاقے اور خزانے آئے یا چلے گئے، فقط یہ دیکھیے کہ اس نے طعام اور شرکائے طعام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

بچپن کی بات ہے، ہمارے گاؤں میں ہر سال کپڑا بیچنے والے پٹھانوں کی ایک ٹولی وارد ہوتی تھی۔ یہ لوگ سارا دن گاؤں گاؤں پھر کر ادھار پر کپڑا بیچنے کے بعد شام کو مسجد کے حجرے میں جمع ہوتے اور پھر حاضر تناول فرماتے۔ وہ زمین پر کپڑا بچھا کر دائرے کے انداز میں بیٹھ جاتے۔ درمیان میں شوربے سے بھری ہوئی ایک پرات بحرالکاہل کا منظر دکھاتی جس میں بڑے گوشت کی بوٹیاں ننھے منے جزیروں کی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ ان بوٹیوں کو احتیاط سے نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر دیتے اور شوربے میں روٹیوں کے ٹکڑے بھگو کر ان کا ملیدہ سا بنانے لگتے۔

جب ملیدہ تیار ہو جاتا تو شرکا پوری دیانت داری کے ساتھ آپس میں بوٹیاں تقسیم کرتے اور پھر اللہ کا پاک نام لے کر کھانے کا آغاز کر دیتے۔ وہ کھانا رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر کھاتے مگر پشتو بغیر رکے بے تکان بولتے۔ مجھے ان کے کھانا کھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ میں ہر شام حجرے کے دروازے میں آ کھڑا ہوتا، انھیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ وہ بھی مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے اور کبھی کبھی برادرانہ اخوت میں لتھڑا ہوا ایک آدھ لقمہ یا گوشت کا ٹکڑا میری طرف بھی بڑھا دیتے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ ان پٹھانوں کی پیشکش کو اگر کوئی مسترد کر دے تو اس کی جان کی خیر نہیں، اس لیے میں بادلِ نخواستہ ان کے عطا کردہ لقمہ تر کو کلّے میں دبا کر آہستہ آہستہ جگالی کرتا اور تادیر انھیں کھانا کھاتے دیکھتا رہتا۔ عجیب منظر ہوتا۔ وہ کھانے کے دوران میں کمال سیر چشمی کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے جب ایک شخص لقمہ مرتب کر لیتا تو پہلے اپنے قریبی ساتھیوں کو پیش کرتا، اور ادھر سے جزاک اللہ کے الفاظ وصول کرنے کے بعد اسے اپنے منہ میں ڈالتا۔

اخوت، محبت اور بھائی چارے کا ایک ایسا لازوال منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا کہ میں حیرت زدہ ہو کر انھیں بس دیکھتا ہی چلا جاتا، اور تب میں دسترخوان پر کھانا کھانے کے اس عمل کا اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل سے موازنہ کرتا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی، کیونکہ ہمارے گھر میں صبح و شام ہانڈی تقسیم کرنے والی بڑی خالہ کے اردگرد بچوں کا ایک ہجوم سا جمع ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے جب بڑی خالہ کھانا تقسیم کر رہی ہوتیں تو ہماری حریص آنکھیں ہانڈی میں ڈوئی کے غوطہ لگانے اور پھر وہاں سے برآمد ہو کر ہمارے کسی سنگی ساتھی کی رکابی میں اترنے کے عمل کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتیں۔ اگر کسی رکابی میں نسبتاً بڑی بوٹی چلی جاتی تو بس قیامت ہی آ جاتی۔ ایسی صورت میں خالہ کی گرج دار آواز کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم بڑی بوٹی والے کی تکا بوٹی کرنے پر تیار ہو جاتے، اور چھینا جھپٹی کی اس روایت کا ایک ننھا سا منظر دکھاتے جو نئے زمانے کے تحت اب عام ہونے لگی تھی۔

اسی زمانے میں کبھی کبھار ایک انگریز افسر بھی والد سے گھوڑے خریدنے کے لیے آ جاتا۔ والد اس کے لیے میز کرسی لگواتے، انگریزی کھانا تیار کرواتے، اور پھر گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ چونکہ ہم بچوں کو انگریز افسر کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی اور ویسے بھی ہمیں اس سے بہت ڈر لگتا تھا، اس لیے ہم اکثر کھڑکی کی جالی کے ساتھ چہرہ لگا کر اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتے اور حیران ہوتے کہ صاحب بہادر کھانا کھا رہا ہے یا آپریشن کر رہا ہے!

وہ اپنی پلیٹ میں ایک ابلا ہوا آلو لے کر بیٹھ جاتا اور پھر چھریوں اور کانٹوں سے گھنٹوں اس کے پرخچے اڑاتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔ آلو اس کا دشمن ہے جسے وہ اپنے اسلحہ کی مدد سے زیر کرنے میں مصروف ہے۔ وہ جو کھانے کے معاملے میں رواداری، مفاہمت اور لطف اندوزی کا رویہ ہوتا ہے، اس انگریز افسر میں مجھے قطعاً نظر نہ آیا۔ بعد ازاں جب انگریز قوم کی عادات واطوار سے آگاہی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کو اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، جنگی مشقیں کرنے کی اشد ضرورت ہے، اس لیے وہ کھانے کی میز پر بھی اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہیں۔ سوان کے لیے کھانا جسم برقرار رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ دشمن کو زیر کرنے کا شاخسانہ ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی روایت ہمارا عزیز ترین ثقافتی ورثہ تھا جس کے ساتھ ہم نے عزیزانِ مصر کا سا سلوک کیا، اور اب یہ روایت اوّل تو کہیں نظر ہی نہیں آتی، اور کہیں نظر آجائے تو مارے شرمندگی کے فی الفور خود میں سمٹ جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ دسترخوان پر بیٹھنا ایک تہذیبی اقدام ہے، جبکہ کھڑے ہو کر کھانا ایک نیم وحشی عمل۔

مثلاً یہی دیکھیے کہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو دائیں بائیں یا سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے آپ کے برادرانہ مراسم فی الفور استوار ہو جاتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں جیسے چند ساعتوں کے لیے آپ دونوں ایک دوسرے کی خوشیوں، غموں اور بوٹیوں میں شریک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے بیٹھا ہوا آپ کا کرم فرما کمالِ دریا دلی اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پلیٹ کا شامی کباب آپ کی رکابی میں رکھ دیتا ہے تو جوابِ آں غزل کے طور پر آپ بھی اپنی پلیٹ سے مرغ کی ٹانگ نکال کر اسے پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھانے کے دوران لین دین کی وہ خوشگوار فضا از خود قائم ہو جاتی ہے جو ہماری ہزار ہا برس کی تہذیبی یافت کی مظہر ہے۔

ایک لحظہ کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ سامنے بیٹھا شخص آپ کا مدمقابل ہے اور اگر آپ نے ذرا بھی آنکھ جھپکی تو وہ آپ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر جائے گا۔ دسترخوان کی یہ خوبی ہے کہ اس پر بیٹھتے ہی اعتماد کی فضا بحال ہو جاتی ہے اور آپ کو اپنا شریکِ طعام حد درجہ معتبر، شریف اور نیک نام دکھائی دینے لگتا ہے۔ دوسری طرف کسی بھی بوفے ضیافت کا تصور کیجیے تو آپ کو نفسا نفسی، خود غرضی اور چھینا جھپٹی کی فضا کا احساس ہوگا، اور ڈارون کا نظریہ جہدِ للبقا آپ کو بالکل سچا اور برحق نظر آنے لگے گا۔

دسترخوان کی ایک اور خوبی اس کی خود کفالت ہے۔ جب آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی جملہ ضروریات کو بے طلب پورا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ سامنے دسترخوان پر ضرورت کی ہر چیز موجود ہے، حتیٰ کہ اچار، چٹنی اور پانی کے علاوہ خلال تک مہیا کر دیے گئے ہیں۔ دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد اگر آپ کسی کو مدد کے لیے بلانے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو میزبان نے حقِ میزبانی ادا نہیں کیا، یا مہمان نے اپنے منصب کو نہیں پہچانا۔

خود کفالت دراصل ہماری ثقافت کا ایک امتیازی وصف ہے اور اس کا ہماری قناعت پسندی بلکہ تقدیر پرستی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اپنے دیہات ہی کو لیجیے جو ہماری ثقافت کی صحیح ترین نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ اب تو خیر ان میں پہلی سی بات نہیں رہی، ورنہ صدیوں تک انھوں نے نمک اور حملہ آور کے سوا شاید ہی کبھی کوئی چیز درآمد کی ہو۔ دلچسپ بات یہ کہ کسان اپنے لیے خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے جو اس کے جسم کی ساخت اور تعمیر میں حصہ لیتی ہے۔ مگر پھر جب اس کا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اپنا بدن زمین کا رزق بن جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد زمین اسے دوبارہ غذا میں منتقل کر کے آئندہ نسلوں کو پیش کر دیتی ہے۔

یہ بات انسان تک ہی محدود نہیں۔ دیہات میں تو پرندوں، حیوانوں، پودوں اور انسانوں کی نسلیں سدا ایک دوسرے میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ یک جانی اور ہم مزاجی کا یہ عالم کہ انھیں محسوس ہوتا ہے جیسے گاؤں بجائے خود ایک دسترخوان ہے جو کھیتوں کے عین درمیان بچھا دیا گیا ہے اور جس پر وہ نسل در نسل بیٹھتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ ایک نسل جب کھانے سے فارغ ہو جاتی ہے تو دوسری نسل دسترخوان پر آ بیٹھتی ہے۔ مزے کی بات یہ کہ گو جانے والی نسل آنے والی نسل کے لیے غذا بن کر دسترخوان پر سج جاتی ہے، مگر آنے والی نسل کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس رغبت سے اپنے ہی بزرگوں کی ہڈیاں چبا رہی ہے۔

دسترخوان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ آپ کو زمین سے قریب کر دیتا ہے، جبکہ میز کرسی پر آتے ہی آپ زمین کے لمس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چرنے چگنے کا عمل تو آپ کو زمین سے بالکل منقطع ہی کر دیتا ہے۔

زمین ایک زندہ، دھڑکتی اور پھڑکتی ہوئی شے ہے جس کی تحویل میں ایک پُراسرار قوت بھی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو نہ صرف اس قوت کی موجودگی کا علم تھا بلکہ وہ قدم قدم پر اس کے لمس سے بھی آشنا ہوتے۔ وہ کہتے کہ یہ قوت زیرِ سطح قوموں، دائروں اور لکیروں کی صورت میں رواں دواں رہتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی انجانے میں بھی ان میں سے کسی لکیر کو چھو لیتا تو اسے زمین کی قوت ایک برقی جھٹکے کی طرح محسوس ہوتی۔

تب وہ زمین کے فیوض و برکات کے حصول کے لیے ان لکیروں اور کھائیوں کی تلاش کرتے، اور جس مقام پر یہ لکیریں یا کھائیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ملتیں وہیں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مقام دراصل زمین کی پُراسرار قوت کے سرچشمے ہیں۔ مگر پھر یوں ہوا کہ انسان بتدریج زمین سے منقطع ہو کر پہلے چوباروں، پھر مندروں پر چڑھ گیا اور زمین سے جو اس کی ماں بھی تھی اور اَن داتا بھی، کٹتا اور دور ہٹتا چلا گیا۔ دسترخوان کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زمین کے سینے سے چمٹا دیتا ہے تاکہ وہ براہِ راست اس کی پُراسرار قوت کو کشید کر سکے۔

دسترخوان دراصل زمین کا لباس ہے۔ دسترخوان پر بنی ہوئی قوسیں، دائرے اور لکیریں زمینی قوت کی گزرگاہوں کے مماثل ہیں۔ چنانچہ جب آپ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں تو اس کی غذائیت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے، جبکہ میز کرسی پر یا چل پھر کر کھانا کھائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کھانے میں وہ برقی رو موجود نہیں جو زمین کی شریانوں سے دسترخوان کی قوسوں اور پھر وہاں سے انسان کی رگوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔

دسترخوان آپ کو زمین کے لمس ہی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ انگلیوں کے لمس سے بھی متعارف کرتا ہے۔ چھری کانٹے یا چمچے سے کھانا کھانے میں وہ لطف کہاں جو ہاتھ سے کھانے میں ہے۔ اس میں دوہرا لطف ہے، ایک تو اس چیز کا لطف جو کھائی جا رہی ہے، دوسرے انگلیوں کے لمس کا لطف! ممکن ہے آپ کہیں کہ میز کرسی پر بیٹھ کر یا چل پھر کر بھی تو انگلیوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔

جی ہاں یہ ممکن تو ہے، مگر ایسے ہوتا نہیں۔ وجہ یہ کہ ہاتھ سے کھانا کھانے کے لیے آپ کے جسم کا ایک جگہ ڈھیر ہونا ضروری ہے اور یہ بات دسترخوان کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈائننگ چیئر پر بیٹھنا سرکس کی رسّی پر کھڑا ہونے کے مترادف ہے، چنانچہ کرسی سے پھسل جانے کا خطرہ ہمہ وقت سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ ایسے میں کوئی انگلیوں کے لمس سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے!

یہی حال بوفے ضیافت کا ہے۔ وہاں دو مسئلے ہوتے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہیں، ایک تو یہ کہ کس طرح ہتھیلی پر بیک وقت پلیٹ، چمچہ، روٹی اور نیپکن کو بیلنس کیا جائے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام ہے بلکہ اسے آرٹ کہنا چاہیے جو ویسے کی سینکڑوں ضیافتوں سے گزرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ٹریفک کا ہے۔ جب آپ بوفے ضیافت کے جملہ مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو ہر قسم کی ٹکروں، دھکوں اور خلاف ورزیوں سے خود کو اور اپنی رکابی کو بچانا ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر آپ انگلیوں کی مدد سے کچھ کھانے کی کوشش کریں بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ اس ہنگامہ دار و گیر میں آپ کو اپنی خوبصورت انگلی بھی ایک مڑا ہوا بدوضع کانٹا ہی نظر آتی ہے۔

دسترخوان لامسہ ہی کو تسکین نہیں دیتا... شامہ، سامعہ اور باصرہ کو بھی سیراب کرتا ہے جب مہمان دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو مختلف کھانوں کی خوشبو آنِ واحد میں ان تک جا پہنچتی ہے، اور اس فراوانی کے ساتھ کہ وہ اسے نہ صرف ایک مشروب کی طرح پیتے ہیں بلکہ اس کی مختلف اقسام میں تمیز بھی کر لیتے ہیں۔

مثلاً نان کی سوندھی سوندھی باس، پلاؤ کی گرم خوشبو سے مختلف شے ہے۔ اور تنجن کی تیز مہکار، فرنی کی ٹھنڈی سگند سے جدا مزاج رکھتی ہے۔ یہ انکشاف دسترخوان پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ بوفے ضیافت میں تو کھانوں، مہمانوں، بیروں اور قناتوں کی ملی جلی خوشبو ایک ایسی بھاری، بوجھل شے بن جاتی ہے کہ اسے خوشبو سے ہم رشتہ کرنا بھی بدمذاقی کی دلیل ہے۔

سامعہ کی تسکین کا پہلو بھی دسترخوان پر ہی ممکن ہے، یہاں کھانے والے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ہر کھانے والے کے دہن سے ہڈیوں کے کڑکڑانے اور لقمے کے دانتوں میں پسنے کی آواز شیریں نغمے کی طرح آپ کے کانوں سے ٹکراتی اور آپ پر کیف و سرور کی بارش کر دیتی ہے۔ دسترخوان پر ہی آپ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہر کھانے والے کی زبان، دانت، تالو اور ہونٹ کھانے کے دوران مل جل کر ایک ایسی مخصوص آواز نکالتے ہیں جو نہ صرف دوسری آوازوں سے مختلف ہے بلکہ جس میں کھانے والے کی ساری شخصیت سمائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کے اصل کردار سے آشنا ہونا ہو تو کھانے کے دوران اس کے منہ سے برآمد ہونے والی آوازوں پر کان دھریں، کیونکہ ہر شخص کے اندر کی ساری شرافت یا خباثت اس کے کھانے کی آواز ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

رہا باصرہ کا معاملہ، تو اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔ دسترخوان پر آرام اور سکون سے بیٹھنا نصیب ہو تو کھانے کو نظر بھر کر دیکھنے کی فرصت بھی ملتی ہے، ورنہ دوسرے موقعوں پر کس بدبخت کو کبھی معلوم ہوا کہ جس شے پر وہ دندانِ طمع تیز کیے ہوئے ہے، وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر پوری دلجمعی سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور بوفے ضیافت میں انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھانا زہر مار کرنے میں وہی فرق ہے جو محبت اور ہوس میں ہے، خوش بو اور بو میں ہے، صبح کی چہل قدمی اور سوگز کی دوڑ میں ہے۔ ◆◆◆

کچھ نہ کچھ!!

ایک آدمی نے اپنے دوست سے کہا: ''ارے یار تم ہمیشہ کچھ نہ کچھ فکر میں لگے رہتے ہو! آخر بات کیا ہے؟''

''کیا کروں یار مجھ پر کافی قرض چڑھ گیا ہے۔

''تو پھر تم قرضداروں کو قرض ادا کیوں نہیں کرتے؟

''وہی سوچ رہا ہوں۔ اگر کوئی نیا قرض دینے والا مل جائے تو میں پرانے قرضداروں کا قرض اتار دوں گا۔'' اس دوست نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem pakistanipoint.com
www.pakistanipoint.com

تبصرۂ کتب

سید عاصم محمود

نام کتاب: زنگار نامہ
مصنف: عامر خاکوانی
ناشر: نئی سوچ، 47، پہلی منزل، ہادیہ حلیمہ سینٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 0300-8475843
قیمت: 700 روپے

یہ 1995ء کا ذکر ہے، صحرائے چولستان کے کنارے آباد احمد پور شرقیہ میں جنم لینے والے ایک تئیس سالہ جوان رعنا نے داتا کی نگری میں قدم دھرے۔ وہ وکیل بن رہا تھا مگر لڑکپن سے علمی و ادبی کتابیں پڑھنے کی لگن اُسے لکھاری بننے پر اکساتی رہتی۔ آخر اس نے صدائے دل پر لبیک کہی اور لاہور چلا آیا جو برصغیر میں علم و ادب کا بڑا مرکز کہلاتا ہے۔

نوارد کی خوش قسمتی کہ جلد اس کے سر پر ہما بیٹھ گیا اور اُسے علمی و ادبی گہوارے، اردو ڈائجسٹ نے اپنے دامن میں سمیٹ ڈالا۔ وہاں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی جیسے نامی گرامی مدیران نے اُسے اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور اس کی تربیت کرنے لگے۔ انھوں نے نوجوان میں لکھنے پڑھنے کی خفتہ صلاحیتوں کو ابھارا اور مانجھ کر کندن بنا دیا۔ ایک پسماندہ شہر کا باسی، عامر ہاشم خاکوانی آج مصروف کالم نگار میں ڈھل چکا۔ وہ جب بھی ماضی کا ذکر کریں، تو محبت و اپنائیت سے اردو ڈائجسٹ میں بیتے دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

عامر خاکوانی کی کالم نگاری کا آغاز 2004ء سے ''ایکسپریس'' میں ہوا۔ پھر ''دنیا'' اور اب ''92 نیوز'' میں قلم کے جوہر دکھانے کا سلسلہ جاری ہے۔ کثیر المطالعہ ہونے کے سبب ان کے کالموں میں معلومات، نظریات، خیالات غرض وہ تمام اجزا ملتے ہیں جو ایک کالم کو دلچسپ اور مفید بناتے ہیں۔ آپ کے کالموں کا پہلا مجموعہ ''زنگار'' 2018ء میں طبع ہوا۔ زیرِ تبصرہ دوسرا مجموعہ ہے۔

مجموعے میں 90 کالم شامل ہیں۔ انھیں دس عنوانات...... موٹیویشنل، عمل خیر، کتابوں کی دنیا، زندگی کے سبق، یادیں، تصوف، نقطۂ نظر، معلومات و شخصیات اور خاندان و تربیت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عنوانات خبر دیتے ہیں کہ یہ کالم رنگا رنگ، متنوع اور قابل مطالعہ ہیں۔

اخلاقیات، علم و ادب، فنون لطیفہ اور مذاہب بیشتر کالموں کے موضوعات ہیں۔ ان سبھی کی معلومات کالموں میں بکھری ملتی ہیں۔ ذاتی زندگی سے کشید کردہ تجربات طرز تحریر جاذب بناتے ہیں۔ مصنف سیاست پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ یہ بھی علم و شعور بڑھانے کا سامان ہیں۔

زنگار نامہ میں شامل اشاعت کئی کالم راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی کو کیریئر راہنمائی درکار ہو تو کوئی غم سے چھٹکارا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.

پانے کا خواہش مند، تاریکی میں پھنسے ہر فرد کو تحریروں میں روشنی نظر آ سکتی ہے۔ مجموعے سے چیدہ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

بچوں میں تین چار ایسی خوبیاں ہیں، جو ہم بڑوں کو ان سے سیکھنی چاہئیں۔ ان میں ہمیشہ زندگی کے لیے ایکسائٹمنٹ رہتی ہے۔ نئی چیزوں کی طرف وہ لپکتے اور تجربات سے گریز نہیں کرتے۔ سب سے بڑھ کر وہ زندگی سے خوشیوں کو کشید کرتے ہیں، اپنے حال میں رہنا انھیں پسند ہے، ماضی کی تلخیوں اور مستقبل کے موہوم خدشات سے بچے کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتے ہیں، ان کے چہروں پر مسکراہٹیں لانے کے لیے بیش قیمت اشیاء کی ضرورت نہیں پڑتی، چند روپوں والی کوئی چیز، معمولی سا واقعہ انھیں کھلکھلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان میں ایک اور اہم بات ایسی ہے جس پر رشک آنا چاہیے۔ ان کا غصہ، نفرت اور بیزاری وقتی ہوتی ہے۔ جس بچے سے لڑیں گے، چند منٹوں یا گھنٹوں بعد اسی سے کھیلتے نظر آئیں گے۔ ان کے معصوم دل کینہ اور بغض سے پاک ہوتے ہیں۔ فوری ردعمل، مگر کچھ ہی دیر میں دل کو صاف کر لینا۔ ایک حدیث مبارکہ میں بچوں کی ایسی بعض خصلتوں کا ذکر کر کے اور اسے ایمان کی صفات سے تشبیہ دی گئی ہے۔

☆☆

زندگی کے سفر میں جو سبک رفتار رہے، بڑی کامیابیاں سمیٹیں، آخری دنوں میں وہ اس پر شاد نہیں ملتے۔ جوانی، ادھیڑ عمر اور جب تک جسم و جاں میں قوت تھی، تب تو ان کا فوکس مالی اعتبار سے مستحکم ہونے میں رہا، بہت سوں کو عبادات یاد رہیں نہ ہی خدا اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یاد آئیں۔ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کی کوشش میں بہت سوں کو کچلا، کسی کے کاندھے اور بعض کی گردن پر کود کر بھی آگے نکل گئے۔ آخری دنوں میں یہ سب محنت اور کوشش بیکار اور فضول نظر آتی ہے۔ یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے دامن میں ٹھیکرے، کنکر تو بہت جمع کر لیے، نگینے موتی کم ہیں۔ یہ سوچ آتی ہے کہ آخر کے لیے کچھ جمع نہیں ہو سکا یا کچھ کیا بھی تو اس کے خالص، کھرے ہونے میں شک لگتا ہے۔ معلوم نہیں وہ رب ذوالجلال والاکرام اسے قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔ ناقص اور عجلت میں کی گئی عبادات کہیں منہ پر نہ ماردی جائیں۔

☆☆

فیس بک کی دنیا میں ابھی نیا تھا، یہ بھی آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ تھا۔ ملائشیا میں مقیم ایک صاحب سے فیس بک چیٹ چلتی رہتی۔ وہ ایک اچھی کمپنی میں ملازمت کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا باس غیر مسلم ہے، مگر پہلے ماہ اس نے نصیحت کی کہ جو بھی کماؤ، اپنی آمدنی میں دے دس فیصد چیریٹی کے لیے الگ کر لو اور صرف نوے فیصد کو اپنے لیے سمجھو۔ بتانے لگے کہ کئی ملائی، چینی کولیگز، دوستوں سے بات ہوتی رہتی ہے، ان میں سے بیشتر غیر مسلم ہونے کے باوجود اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس سے ایک تو ذہنی سکون اور طمانیت میسر ہوتی ہے، دوسرا ہماری طرف سے سوسائٹی کے لیے کنٹری بیوشن ہو جاتا ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ ہر کالم کا سن اشاعت دے دیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس طرح قاری کے لیے اسے سمجھنا آسان ہو جاتا۔ نیز بعض جگہ انگریزی الفاظ کے استعمال پر کچھ حیرت ہوئی۔ ان الفاظ کے خوبصورت اردو ہم معنی موجود ہیں۔ 416 صفحات پر محیط اس ضخیم کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ چھپائی اور پیشکش عمدہ ہے۔ اسے اپنے کتب خانے کی زینت ضرور بنایئے۔

◆◆●

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گلوبل وارمنگ

پوری دنیا میں گلوبل وارمنگ پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں اور ان سے بچاؤ کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اس حوالے سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ بعض این جی اوز کام کر رہی ہیں لیکن حکومتی سطح پر اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں لیا جا رہا۔ ایک وزارت برائے موسمیاتی تبدیلی قائم ہے۔ لیکن قوم ابھی تک لاعلم ہے کہ اس حوالے سے کیا اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔

گلوبل وارمنگ کے باعث صرف سیلاب سے 2011ء تا 2016ء میں ایک لاکھ سے زائد افراد متاثر ہوئے۔ 200/ارب روپے کی معیشت کو نقصان ہوا۔ پاکستان کے دس شہروں میں درجہ حرارت 50 ڈگری تک چلا گیا لیکن ابھی تک کوئی سنجیدہ اقدام دیکھنے کو نہیں ملا۔ ہر سال تقریباً 80 لاکھ کاٹن پلاسٹک سمندر میں پھینکا جا رہا ہے لیکن کوئی پرسان حال نہیں جبکہ نااہلی کا عالم یہ ہے کہ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق غیر ملکی ڈونر ایجنسی نے شمالی علاقہ جات میں گلیشیر کے پگھلنے سے پیدا ہونے والی صورتحال سے نمٹنے کے لیے 10 ملین ڈالر جاری کیے لیکن 6 ماہ گزرنے کے باوجود کام شروع نہیں ہو سکا۔ اکتوبر 2018ء میں 10 ملین جاری ہوئے لیکن وزارت موسمیاتی تبدیلی نے ابھی تک کام کا آغاز تک نہیں کیا۔

اس منصوبے کے تحت گلیشیر پگھلنے سے بننے والی جھیلوں کے پھٹنے کے خطرات کو کم کرنے کے لیے اقدامات کیے جانے تھے۔ شمالی علاقہ جات میں ان جھیلوں سے 71 لاکھ جبکہ گلگت بلتستان کے 26 لاکھ لوگوں کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اس منصوبہ کے تحت لوگوں کو بروقت اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ شجر کاری اور تعمیرات کے منصوبے شامل تھے۔ موسمیاتی تبدیلی کے باعث گلگت بلتستان اور کے پی میں 3 ہزار سے زائد جھیلیں بن چکی ہیں۔ ان میں 33 جھیلوں کے اچانک پھٹنے کے خطرات ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی اور ملکی سطح پر ہونے والی موسمیاتی تبدیلیوں پر نگاہ رکھی جائے اور قوی اقدامات کیے جائیں تاکہ ایک طرف تو انسانی زندگیاں محفوظ ہو سکیں تو دوسری طرف ان تبدیلیوں کے اثرات سے محفوظ رہا جا سکے۔

(پیر فاروق بہاؤالحق شاہ بھیرہ شریف)

''قومی زبان'' اردو کی کسمپرسی

1973ء کے آئین کا آرٹیکل 251 ''اردو کو قومی زبان'' تسلیم کرتا ہے۔ تب نفاذ کے لیے، صرف 15 برس کا عرصہ طے

ہوا تھا اور اب اس تحریری اور بنیادی دستاویز کو نافذ ہوئے نصف صدی کا طویل عرصہ گزر چکا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کا ''نفاذ اردو'' سے متعلق فیصلہ 8 ستمبر 2015ء میں آیا تھا۔ کئی درخواستیں دی گئیں تھیں۔ وکیل کوکب اقبال کی درخواست 2003ء میں دائر کی گئی۔ دوسری اہم درخواست محمود اختر نقوی کی تھی جو 2012ء میں دائر کی گئی۔ مقدمہ 7 ماہ چلتا رہا اور پھر تاریخی فیصلہ سُنا دیا گیا۔ عدلیہ نے بال حکومت کی کورٹ میں پھینک دی۔ تحریک نفاذ اردو والوں کی یہ ایک بڑی فتح تھی۔

یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اٹھارہویں ترمیم اب ایک بڑی رکاوٹ بن چکی۔ تعلیم کا شعبہ مکمل طور پر صوبوں کو دے دیا گیا ہے۔ نصاب تیار اور ذریعہ تعلیم طے کرنے کے اختیارات صوبوں کے پاس آچکے ہیں۔ مرکز میں اب کوئی ادارہ ''اردو'' کے حق میں فیصلہ کرنے کا نہیں رہ گیا۔ سندھ سے قومی اسمبلی کی رکن ماروی میمن نے 2010ء میں ایک بل قومی اسمبلی میں لانے کی کوشش کی تھی جس میں اردو کے ساتھ ساتھ بلوچی، سندھی اور پشتو کو بھی قومی زبانیں تسلیم کرنے کے بارے میں کہا گیا تھا لیکن وہ تحریک ناکام ہو گئی۔ آج کل بھی کچھ عوامی نمائندے ایسی سوچ رکھتے ہیں۔ مزید براں حکومتی نظامِ تعلیم کے باعث بے شمار انگریزی میڈیم اسکول بن چکے ہیں۔

(چوہدری رفاقت علی)

ماؤنٹین چکن کا واقعہ

شمارہ جنوری میں طیب اعجاز قریشی کا نوٹ فکر انگیز تھا۔ انھوں نے صحیح لکھا کہ مصیبت اور پریشانی کے ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی یاد آتی ہے اور اس کے احکامات کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ مگر جس قوم کا اللہ پر یقین ہی نہ ہو وہاں گناہ وثواب کا کیا تصور ہوگا کہ اللہ پر یقین اور آخر میں جواب دہی کا ڈر ہی انسان کو راہِ راست سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ وائرس حضرتِ انسان کو بتا رہا ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ قدرت خورد بینی جانداروں کے ذریعے جب چاہے کرۂ ارض سے زندگی کا صفایا کر سکتی ہے۔ اسلام حلال چیزوں، پاکیزگی اور طہارت کا درس دیتا ہے اور جہاں یہ نہیں ہوگا۔ وہاں چین جیسی صورتحال آسکتی ہے۔

طیب صاحب کی یہ بات پڑھ کر کہ چینی غذا کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتتے۔ ایک مرتبہ تو میرے حلال کھانے کی ہدایات کے باوجود میزبان نے مجھے بچھو کھلا دیا۔ میں اسے کوئی سمندری شے سمجھ کر چٹ کر گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ بچھو تھا تو سخت کراہت آئی۔ جہاں محظوظ ہوئے۔ وہیں 44 سال پہلے پاکستان کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ پاکستان کے مایہ ناز فاسٹ بولر سرفراز نواز 1977ء میں دورۂ ویسٹ انڈیز کے دوران پیش آئے ایک واقعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''جمیکا میں رات کے کھانے میں فہرست طعام پیش کی گئی تو اس میں ''Mountain Chicken'''' کے نام سے بھی ایک ڈش موجود تھی۔ میں اس ڈش کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ مگر جونیئر کھلاڑی مثلاً جاوید میانداد اور ہارون الرشید وغیرہ جو پہلی بار ویسٹ انڈیز کا دورہ کر رہے تھے، انھوں نے سوچا کہ ماؤنٹین چکن تو کافی بڑی ڈش ہوگی اور اس کا آڈر دے دیا۔

جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو میں نے ان سے کہا کہ جانتے ہو تم لوگوں نے کیا کھایا ہے؟ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے تو میں نے بتایا کہ ماؤنٹین چکن تو مینڈک ہوتا ہے اور یہ ادھر کی خاص ڈش ہے۔ اس پر وہ سمجھے کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔ اپنی تسلی کے لیے انھوں نے ویٹر کو بلایا تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور انھیں بتایا کہ ماؤنٹین چکن بہت بڑا مینڈک ہوتا ہے۔ یہ جان کر جاوید میانداد اور ہارون الرشید کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی اور وہ باتھ روم میں جا کر الٹیاں کرنے لگے۔ یوں میانداد اور ہارون الرشید نام کے دھوکے میں مینڈک کھا گئے۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

بھارتی مسلمان کیا کریں؟

بھارت میں 2001 تا 2011 کے عشرے میں مسلمانوں کی آبادی میں 29.52 فیصد جبکہ ہندو آبادی کی 19.92 فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ مسلمان آبادی سارے بھارت میں بکھری ہوئی ہے تاہم بھارتی مسلمانوں کی کل آبادی کا 47 فیصد تین ریاستوں مغربی بنگال، بہار اور اتر پردیش میں آباد ہے۔ مغربی بنگال میں تقسیم ہند کے وقت مسلم آبادی 12 فیصد تھی جبکہ یہ آبادی بڑھ کر 27 فیصد ہو چکی ہے۔ مغربی بنگال کے بعض اضلاع میں مسلم آبادی کا تناسب 63 فیصد تک بھی ہے۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کی بڑی وجہ بنگلہ دیش کے تارکین وطن کو تصور کیا جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً مشرقی بنگال سے مغربی بنگال منتقل ہوتے رہے ہیں اور شاید اسی وجہ سے متنازعہ شہریت کا قانون لایا گیا ہے تاکہ بالخصوص بنگالی مسلمانوں کو حق شہریت سے محروم کیا جا سکے۔

مغربی بنگال سے متصل صوبہ بہار میں مسلمان کل آبادی کا 16.9 فیصد ہیں۔ بہار کے اضلاع کشن گنج میں 85 فیصد، کٹھیار میں 43 فیصد، ارار یا میں 42 فیصد اور پورنیا میں 38 فیصد مسلمان آباد ہیں۔ اسی طرح صوبہ اتر پردیش جو بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہے اس کی کل آبادی پاکستان کی آبادی کے قریب تر یعنی 19,98,12,341 ہے جس میں مسلمان آبادی 4,39,88,561 یعنی 19.3 فیصد ہے۔ ان ریاستوں سے متصل جھاڑ کھنڈ کی 32.96 ملین آبادی میں سے ہندو آبادی 67% جبکہ مسلم آبادی 14.5 فیصد ہے۔ رانچی جو جھاڑ کھنڈ کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے میں مسلمانوں کی آبادی 16.42 یعنی 34.22 فیصد ہے۔ صوبہ آسام کی کل آبادی 31,169,272 ہے جس میں مسلمان 1,06,79,345 ہیں۔ آسام کے 9 اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک ساحلی ریاست کیرالہ ہے جہاں ہندو مسلم اور عیسائی تناسب اس نوعیت کا ہے کہ مسلمان اور مسیحی مل کر ہندو غلبے کے مقابلے میں توازن کی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس ریاست میں ہندو آبادی 54.73 فیصد، مسلم 26.56 فیصد جبکہ مسیحی 18.38 فیصد ہیں۔ قارئین کے لیے یہ امر تعجب کا باعث ہوگا کہ کیرالہ کے ساحل سے دور سمندر میں لکشادیپ جزائر ہیں۔ ان جزائر کی کل آبادی 48473 افراد پر مشتمل ہے جن میں 42268 مسلمان ہیں۔ اس طرح ان جزائر میں مسلمان آبادی کا تناسب 96.59 فیصد ہے۔ ان جزائر کو یونین ٹیریٹری (Union Teritory) کا درجہ حاصل ہے۔

آبادی کے درجہ بالا تجزیے سے عیاں ہوتا ہے کہ مسلمان آبادی ہندوستان بھر میں بکھری ہوئی ہے اور کسی بڑی ریاست میں فی الوقت مسلمانوں کو اکثریت حاصل نہیں ہے۔ اس طرح ہندوستان میں کسی نئے پاکستان یا مسلم ہوم لینڈ کا قیام فی الوقت ناممکن ہے البتہ ایک طویل المعیاد ہدف کے طور پر اس سمت کوششیں شروع کی جا سکتی ہیں جن کے نتائج فوری طور پر برآمد ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور نہ ایسی کوئی مہم جوئی سودمند ہوگی۔ بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں نے متنازعہ شہریت بل کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کر کے اور بھارت بھر میں بڑے پیمانے پر احتجاج کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ کوئی حقیر اقلیت نہیں جنہیں آسانی سے دبا دیا جائے بلکہ وہ ہندوستان کی ایک طاقتور حقیقت اور دوسری بڑی اکثریت ہیں تاہم جس طرح ایک صدی قبل برصغیر کے مسلمانوں نے بغیر کسی منصوبہ بندی اور ہدف کے عظیم الشان و فقید المثال تحریک خلافت چلا کر ہندو اکثریت کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں اور کانگریس نے تحریک خلافت سے خوفزدہ ہو کر مسلمانوں کو دیوار سے لگانے کی حکمت عملی اختیار کی تھی اسی طرح بھارت بھر میں موجودہ احتجاج اگر کسی باقاعدہ اور بامقصد تحریک کی بنیاد نہ بن سکے تو یہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہندو اکثریت کو مزید مسلم دشمنی پر ابھارنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے بھارت کے مسلمانوں کو اس نازک اور فیصلہ کن مرحلے پر اپنی حکمت عملی خوب سوچ سمجھ کر اختیار کرنی چاہیے تاکہ ان کا یہ عظیم احتجاج محض وقتی ابال ثابت نہ ہو بلکہ مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کی بامقصد تحریک میں ڈھل سکے۔

(سید سلیم گردیزی)

اسلامی ریاست کا نظام

قائداعظمؒ نے صحیح قدم اُٹھا کر برعظیم کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن پاکستان دلایا تھا۔ اگر پاکستان کو مدینہ کی اسلامی ریاست بنا دیا جاتا تو پاکستان میں خوش حالی ہوتی اور مضبوط پاکستان بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کا پشتی بان بھی ہوتا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد مسلم لیگ کے کھوٹے سکے یہ کام نہ کر سکے۔ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے لیے قائداعظمؒ نے اپنی زندگی میں ہی اسلامی آئین اور اسلامی فقہ کی تدوین جدید کے لیے ایک ادارہ ریکنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کا سربراہ نومسلم علامہ محمد اسدؒ کو لگایا تھا۔ علامہؒ نے اس پر کافی کام کیا۔ ساتھ ہی ساتھ قائداعظمؒ نے مولانا مودودیؒ سے کہا آئیں اور حکومت پاکستان اور عوام کو بتائیں کہ پاکستان میں کس طرح سے اسلامی نظام حکومت قائم ہوگا۔ مولانا مودودیؒ نے ریڈیو پاکستان سے اپنی تقریروں کے ذریعے حکومت اور عوام کو آگاہ کیا، کہ آج کل کے جدید جمہوری دور میں کیسے بتدریج اسلامی نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے۔ یہ تقریریں اب بھی ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ یہ تقریریں کتابی شکل میں بھی محفوظ ہیں۔

اللہ نے قائداعظمؒ کو 1948ء میں اپنے پاس بلا لیا۔ بیوروکریٹس نے علامہ اسدؒ کو اسلامی آئین اور فقہ کی تدوین جدید سے روک کر بیرون ملک سفیر لگا دیا۔ بعد میں اس پر کیے گئے کام کے سارے ریکارڈ کو ایک قادیانی بیوروکریٹ نے آگ لگا دی۔ قائداعظمؒ کی مسلم لیگ کے کھوٹے سکے اس وقت اقتدار میں تھے جنہوں نے اس کیس پر تحقیق کرنے کے بجائے مٹی ڈال دی۔ اس سارے قصے کو اسلام کے ایک شیدائی، ٹی وی اینکر، صحافی اور ریٹائرڈ بیوروکریٹ، اور یا مقبول جان نے میڈیا میں اُٹھایا۔ وہ اس طرح کہ اور یا مقبول جان کو پاکستان کے پرانے ریکارڈ سے قائداعظمؒ کا ایک خط اُس وقت کی وزارت مالیات کے نام سے ملا۔ قائداعظمؒ نے خود اس خط کے ذریعے ہدایات دی تھیں کہ اس ادارے کے لیے فنڈ مختص کیے جائیں مگر ایک قادیانی نے اس خط کو اپنے پاس روکے رکھا۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد مسلم لیگ کے کھوٹے سکوں نے کہنا شروع کیا کہ اس جدید دور میں اسلام کا چودہ سو سالہ پرانا نظام حکومت نہیں چل سکتا۔

مولانا مودودیؒ اور قائداعظمؒ کے ساتھی، جس نے قائداعظمؒ کا جنازہ بھی پڑھایا تھا، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دین پسند طبقوں کو ملا کر اسلامی نظام حکومت کی پہلی سیڑھی اسلامی آئین کے لیے جاری اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دی گئیں۔ اسی کوشش کے دوران مولانا مودودیؒ پر جو جماعت اسلامی کے امیر بھی تھے، پاکستان کی مخالفت کا الزام لگا کر جیل میں بند کر دیا۔ جس مسلم لیگ نے مسلمانان برعظیم سے پاکستان کے حصول کے بعد اس میں مدینہ کی اسلامی ریاست کا نظام حکومت قائم کرنا تھا، اس نے اپنے اصل مقصد سے روگردانی کی۔ قادیانی، کمیونسٹوں اور جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ نے اسلام کے عملی نفاذ میں روڑے اٹکائے۔ کمیونسٹوں اور قادیانیوں نے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کو ایک سازش کے تحت راولپنڈی لیاقت باغ میں شہید کر دیا۔

(میر افسر امان)

www.paksociety.com

3.	CONST. OF SOLING/DRAIN AT UC-64 [GHUMAN MARI, BSTI ISLAM, DAT LUK, JALAL UPR KAMLANA, KHOKHARA, BHERAN WERAN], UC-61 [KAKI NAU AWAL, DOUM], UC-63 [DAB KALAN, BASTI WARRYAM, MUHAMMAD YAR, JAFAR SHAH, JALALA DAB] & UC-57 [SHORKOT SHUMALI & JANUBI]TEHSIL SHORKOT DISTRICT JHANG. **(REMAINING WORK) (RISK AND COST)**	EE/LG&CD/145 dated 14.03.19	4.101	5% of Estimated Cost	10000	As per Work Order
4.	CONST. OF SOLING/DRAIN AT SHORKOT CITY & SHORKOT CANTT. TEHSIL SHORKOT DISTRICT JHANG. **(REMAINING WORK) (RISK AND COST)**	EE/LG&CD/146 dated 14.03.19	2.234	5% of Estimated Cost	10000	As per Work Order
SUSTAINABLE DEVELOPMENT GOALS ACHIEVEMENT PROGRAMME (SAP) (2018-19)						
5.	Const. of Soling, Drain, Sullage Carrier, Culverts Chaq No.214Gujran. **(REMAINING WORK)**	EE/LG&CD/166 dated 14.03.19	2.400	5% of Estimated Cost		As per Work Order

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

IPL - 2050

Assistant Engineer
LG & CD Civil Division
JHANG

Sr. No.	Name of Scheme	TS. No. & Date	Estimated Cost (Rs. In Million)	Earnest Money	Tender Fee	Completion Period
COMMUNITY DEVELOPMENT PROGRAMME-2018-19						
1.	CONST. OF SOLING/DRAIN/ SULLAGE CARRIER & CULVERTS AT UC-3 [CHAK NO.169, 168, 167, 170,166, 164] & UC-4 [CHAK NO.259, 464, 257, 233, 165, 258, 260]TEHSIL & DISTRICT JHANG. **(REMAINING WORK) (RISK AND COST)**	EE/LG& CD/132 dated 14.03.19	2.583	5% of Estimated Cost	10000	As per Work Order
2	CONSTRUCTIO N OF SOLING/DRAIN/ SULLAGE CARRIER & CULVERTS AT UC-29 [HAVELI LAL, MAGHI SULTAN, GILMALA, JALAL PUR], UC-50 [FOUJA DHARA, HALLA BHARWANA, KAKU WALA, QAIM BHARWANA]TE HSIL SHORKOT & UC-26 [MOLHAANA, KOT KHEERA, BHOJONA]TEH SIL & DISTRICT JHANG. **(REMAINING WORK) (RISK AND COST)**	EE/LG& CD/139 dated 14.03.19	4.673	5% of Estimated Cost	10000	As per Work Order

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

TENDER NOTICE

Sealed tenders are invited from approved Contractors of LG&CD, Jhang who have got their names/enlisted/renewed for the current financial year 2019-20.

Tender documents/bids can be obtained from the office of the Assistant Engineer, LG&CD Jhang immediately after the publication of this advertisement against written application accompanied with CDR 5% of estimated price & attested copies of original letter of enlistment/up to date renewal fees receipt and P.E.C. License 2019-20. Authority letter on stamp paper duly registered, identity card of contractor/managing partner of the firm along with power of attorney.

Tendered rates should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebates on tendered rates will be acceptable.

In any change or cancellation in projects, then contractors will be bound as Administrative Approval. The lowest bidder whose bid will be 5% or more below of sanctioned estimated cost of the work, the contractor will be bound to submit the Additional Performance Security in shape of CDR that will be returned after the completion of Project. In case of failure of performance security within 15 days, the contractor CDR 5% of estimated cost will be forfeited in favour of Government without any notice. The contractor will be responsible for own arrangement of construction, material and machinery. Deal of estimate/documents/bids/specifications can be seen in the office of undersigned on any working day during office hours.

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

The tender/bids will be issued upto 21-03-2020 at **11.00 AM,** also received in the office of undersigned on **same date** and will be open at **03:30 PM** in the presence of intending bidders or their authorized representatives and tender opening committee. Procurement process will be adopted as per PPRA rules.

NOTICE: The Contractor will submit tender fee on 32-A Challan form in State Bank/National Bank and provide this challan for issuance of tender form as per letter No.LG&CD/ADF/1(345)/2017 dated 28th November, 2017 issued by Assistant Director (Finance) Directorate General, Local Govt. & Community Dev: Govt. of the Punjab Lahore.

ممتاز مفتی

جیدا گاؤں نہیں گیا

ہمارا سامان بندھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ٹیکسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آصفہ ٹوکری کے منہ پر رسی باندھ رہی تھی۔ میں اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ میں نے منہ سے اخبار ہٹائے بغیر پوچھا:

''کیوں آصفہ تیاری مکمل ہو گئی نا؟''

''جی ہاں۔'' اس کی مدہم آواز آئی۔

اس کے جی ہاں کے باوجود مجھے پتا تھا کہ وہ شہر چھوڑ کر گاؤں جانا نہیں چاہتی۔ شہر کی رونق چھوڑ کر کس کا جی چاہتا ہے کہ گاؤں میں رہے؟ اگرچہ آصفہ کے لیے شہر کی رونق کبھی پیش منظر میں نہ تھی کہ طبعاً وہ اکیلی تھی۔ پھر بھی پس منظر کی رونق تو تھی اور رونق چاہے پیش منظر میں ہو یا پس منظر میں وہ بہرحال رونق ہوتی ہے۔

پھر ہمارا گاؤں بھی تو برائے نام گاؤں تھا۔ آپ جانتے ہیں پہاڑی علاقوں میں گاؤں نہیں گھر ہوتے ہیں۔ ویڑے ہوتے ہیں۔ دو یہاں، دو وہاں اس ٹیلے پر اور چار نیچے کھڈ میں۔ ان بکھرے گھروں کو گاؤں نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہمارا گاؤں بہت دُور پاکستان کے ایک دُور افتادہ کونے میں

ازدواجی بھول بھلیوں میں پھنسے ایک جوڑے کی عام ڈگر سے ہٹی دلپذیر کتھا

واقع، شہروں سے دور، سڑکوں سے دور، ہنگاموں سے دور جہاں امن ہی امن ہے۔ لوگ امن سے اس قدر بیزار ہیں کہ رونق کے لیے انھوں نے برادری میں باہمی اختلافات کا سہارا لے رکھا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانیوں کو سڑاند سے بچانے کے لیے لہریں پیدا کرنی ہی پڑتی ہیں۔

لیکن نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد میں روز سوچا کرتا تھا کہ اب شہر میں رہنے کا مقصد کیا ہے؟ اس سوچ میں ڈب جھلکیاں کھاتے ہوئے چھے مہینے گزر چکے تھے۔ کیا کروں؟ میں طبعاً سوچنے والا آدمی ہوں، کرنے والا نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ سوچ میں ڈب جھلکیاں کھانے کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ایسا کہ پھر فیصلہ کرنے کو جی نہیں چاہتا اور خود فریبی کے تحت فیصلہ کر ہی لو تو عمل میں لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔

پھر یہ ہوا کہ مالک مکان نے ہمیں نوٹس دے دیا کہ یا تو مکان خالی کر دو۔ نہیں تو اگلے مہینے سے کرایہ دگنا ادا کرنا ہوگا۔ دگنا کرایہ دینے کی توفیق نہ تھی۔ سستا گھر تلاش کرنے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں ایک قابل رہائش مکان بھی تھا۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی۔

''مجھے پتا ہے آصفہ۔'' میں نے کہا۔ ''تو گاؤں جانا نہیں چاہتی۔''

''چپ۔'' اس کی آواز آئی۔

مجھے علم تھا کہ وہ میری بات کا جواب دے گی۔ اس نے کبھی مجھے نہیں جی نہ کہا تھا۔ ایسے موقع پر وہ چپ ہو جایا کرتی تھی۔ چپ اس کا واحد انکار تھا۔ واحد ہتھیار تھا۔ اس کے منہ سے چپ سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے اخبار ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی۔

''وہ۔'' اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''جیدا۔'' وہ بولی۔ ''وہ رو رہا ہے۔''

واقعی باہر سے جیدا کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ حسب معمول سسکیاں بھرتے وہ چلا رہا تھا۔ ''میں نہیں کروں گا، میں نہیں کروں گا۔''

جیدا بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ ساتھ ہی بہت خود سر اور ضدی۔ عمر تین سال ہوگی۔ ماں باپ ایک حادثے میں فوت ہو چکے تھے۔ دُور کے رشتے دار نے ازراہِ ہمدردی اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ یہ ہمدردی دکھاوے کی زیادہ تھی جذبے کی کم کم۔ ان کے اپنے تین بچے جو تھے۔ گھر والی جیدا کو کام پر لگانا چاہتی تھی لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ بڑا ہٹ دھرم تھا۔ صاف انکار کر دیتا۔ ''نہیں کروں گا۔''

جیدا دن میں تین چار مرتبہ ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ سیدھا میرے پاس آتا۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ جان نہ پہچان۔ آتے ہی حکم چلاتا، انکل، آنٹی کو بولو مجھے سویٹ دے۔ آصفہ سے گولیاں ٹافیاں لے کر وہ واپس چلا جاتا۔ آصفہ نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اسے پاس بٹھائے۔ اس سے باتیں کرے۔ آصفہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتی تو وہ چلا کر اسے ڈانٹتا، نہیں۔ آصفہ نے اس کے لیے کھلونے بھی منگوائے لیکن اسے کھلونوں سے کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے جیدا کی آواز سن کر کہا: ''آصفہ! باہر کی کنڈی لگا دو، کہیں جیدا اندر نہ آ جائے۔''

آصفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن جوں کی توں بیٹھی رہی۔ دو ایک دن پہلے میں نے جیدا سے کہا تھا: ''جیدا ہم جا رہے ہیں۔''

''کہاں۔'' وہ چونکا۔

''نہیں'' وہ بولا۔ ''تم نہیں جاؤ گے۔''

''ہم تو جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دھیمی آواز میں بولا: ''تم چلے گئے تو میں سویٹ کس سے لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ سویٹ لیے بغیر باہر نکل گیا۔

www.pakistanidigest.com

وہ چلا گیا تو کمرے پر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پُرنم خاموشی۔

جیدا کے رونے کی آواز ختم ہوئی تو میں نے پھر سے بات چھیڑی۔ میں نے کہا: ’’آصفہ! اگر گاؤں میں تیرا جی نہ لگا تو ہم قصبے میں رہائش کرلیں۔ وہاں ناڑا پل کافی بڑا قصبہ ہے وہاں سو گھر ہوں گے۔ گاؤں سے دس میل دور ہے۔ بڑی سڑک پر ہے۔ دریا پر پل ہے۔ غلے کی منڈی ہے۔ ٹرک آتے ہیں۔ بسیں چلتی ہیں۔ بڑی چہل پہل رہتی ہے۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ آصفہ بولی۔

جی ہاں، جی ہاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔

صاحبو میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے ایک ’جی ہاں‘ سے شادی کررکھی ہے۔ اس بدنصیبی کی تمام تر ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔ میں تین سال جانے اَن جانے میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ یا اللہ میں اپنی بیوی کے منہ سے کبھی جی ہاں بھی سنوں۔ لوگو، کبھی بن سوچے سمجھے دعا نہ مانگنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ دعا منظور کرلے۔

آصفہ میری دوسری بیوی ہے۔ پہلی شہزادی تھی۔ وہ واقعی شہزادی تھی۔ اس نے کبھی کسی بات پر مجھ سے اتفاق نہ کیا تھا۔ میں اسے کہا کرتا تھا، شہزادی کبھی تو میری بات مان لیا کر، لیکن میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ پھر شہزادی ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی۔

آصفہ میرا چناؤ نہیں، یہ احسان مجھ پر خالہ نے کیا۔ کہنے لگی: ’’سلیم، میں نے تیرے لیے ایسی بیوی تلاش کی ہے جو تیرے گھر کو جنت بنادے گی۔‘‘ خالہ سچ کہتی تھی۔ آصفہ کے آنے کے بعد واقعی ہمارا گھر جنت تو بن گیا لیکن گھر نہیں بنا۔ دوستو میں جنت میں رہتا ہوں۔ مجھے گھر نصیب نہیں ہوا اور میں اَن جانے میں چوری چوری دعائیں مانگتا ہوں کہ کوئی سانپ آنکلے۔ مانا کہ نیک خاتون کی سبھی عزت کرتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں لیکن نیک بیوی...... اب میں نے جانا ہے کہ نیک بیوی ایسی ریوڑی ہے کے مصداق ہے جس میں کڑا کا نہیں ہوتا۔ پتا نہیں میاں کڑا کے کا متمنی کیوں ہوتا ہے۔ خالی مٹھاس کیوں اچھی نہیں لگتی۔ آصفہ کی مٹھاس اگر شوگر کوٹنگ جیسی ہوتی تو بھی بات بن جاتی لیکن اس کی نیکی تو شہد کی طرح گاڑھی تھی۔

اللہ نہ کرے آپ کو کسی نیک آدمی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے۔ سیانے کہتے ہیں، خبردار نیکی کے تفاخر سے بچو۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہے مگر ایسا ہوتا ہے نیک لوگ جانے یا اَن جانے میں اپنی نیکی کو تمغہ بنا کر چھاتی پر ٹانک لیتے اور لقہ کبوتر بن جاتے ہیں مگر آصفہ لقہ کبوتری نہ بنی۔ اس نے اپنی نیکی پر کبھی مان نہیں کیا تھا۔

ماہر نفسیات

ایک صاحب نفسیاتی ہسپتال پہنچے اور ماہر نفسیات ڈاکٹر صاحب کے کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے ملازم سے پوچھنے لگے: ’’بھیا یہاں ایک ڈاکٹر صاحب بیٹھتے تھے جو بیوی کو قابو میں کرنے کے کامیاب نسخے بتاتے تھے۔ میں ان سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ پلیز بتایئے وہ کہاں ہے۔‘‘

’’معاف کیجیے!! انھوں نے تو دو سال پہلے اپنی بیویوں سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔‘‘ ملازم نے جواب دیا۔

ابلیس کی پشیمانی

تکبر نے ڈبویا اور قیامت تک میں رسوا ہوں
خدا کے حکم پر سجدے میں سر دیتا تو اچھا تھا
اب انساں کے گناہوں سے مجھے خود شرم آتی ہے
میں آدم کو اسی دن سجدہ کردیتا تو اچھا تھا

(ڈاکٹر معین امر بمبو)

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اتنے اُجلے نہ بنو کہ دوسرے میلے میلے نظر آئیں۔ بے شک آصفہ کو میں کبھی میلا نظر نہ آیا تھا لیکن اس کا کیا کروں کہ آصفہ کے اُجلے پن کو محسوس کر کے میں خود..... خود کو میلا سمجھنے لگا۔ آصفہ کے ساتھ رہ کر میں گنہگار بن گیا..... خواہ مخواہ حالانکہ یقین جانیے میں گنہگار نہیں۔ اچھا نہ سہی لیکن میں بُرا بھی تو نہیں۔ گنہگار بننا کوئی آسان کام نہیں۔ انسان کے خمیر میں ضمیر کا عنصر اس قدر حاوی ہے کہ اس سے جان چھڑانا بڑی مشقت کا کام ہے۔

گھر میں ہم دو جی رہتے ہیں، آصفہ اور میں۔ میں 60 کے لگ بھگ ہوں وہ 50 کی ہوگی لیکن شاید اپنی نیکی کی وجہ سے یوں لگتی ہے جیسے مجھ سے پانچ سال بڑی ہو۔ جب وہ جوان تھی اس وقت بھی اس کے نسائی دیے کی لو اتنی مدہم تھی کہ اس کی چمک کبھی مجھ تک نہیں پہنچی۔ ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس بات نے آصفہ کو بالکل ہی بجھا دیا۔

کہتے ہیں بیویاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو میاں کے لیے جیتی ہیں۔ دوسری وہ جو اولاد کے لیے جیتی ہیں۔ آصفہ دونوں طرف سے محروم تھی۔ میاں کی نہ اسے طلب تھی نہ خواہش۔ جب بھی میں اس کی بانہہ پکڑتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے گناہ کر رہا ہوں۔ اولاد ہمارے نصیب میں نہ تھی۔ بڑے جتن کر دیکھے۔

شادی کے بعد شروع شروع میں آصفہ سے لڑا کرتا تھا۔ محلے والے اپنے اپنے گھر بیٹھے ہماری لڑائی پر رننگ کمنٹری کیا کرتے۔ وہ حیران ہوتے کہ یہ کیسی لڑائی ہے جس میں صرف ایک پارٹی بولے جا رہی ہے۔ دوسری پارٹی جیسے موجود ہی نہیں۔ انھوں نے ہماری لڑائی کو ایک ہاتھ کی تالی کا نام دے رکھا تھا۔ دراصل میں لڑتا نہیں تھا بلکہ آصفہ کو سمجھانے کی کوشش کیا کرتا کہ بی بی کچھ کرو، کچھ بولو، لڑو جھگڑو۔ اس کھڑے پانی میں کوئی حرکت پیدا ہو۔

دوستو ہم مرد بھی کتنے احمق ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دلیل دے کر ہم بیوی کو سمجھا سکتے ہیں۔ اب میں جان گیا ہوں۔ اس لیے میں نے ایک ہاتھ سے تالی بجانا چھوڑ دیا۔

آصفہ کے پاس بیٹھ کر وقت گزارنا بھی مشکل تھا۔ کوئی کب تک جی ہاں جی ہاں کی گردان سنے؟ آصفہ باتیں کرنے والی عورت نہ تھی۔ پڑوسیوں کی غیبت کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ محلے کے اسکینڈل سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا تھا کہ وہ ناعورت ہے۔

باہر سے پام پام کی آواز آئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ ''ٹیکسی آ گئی آصفہ!'' میں نے کہا۔ وہ جواب دیے بغیر بادل ناخواستہ اُٹھی۔ (عین اس وقت جیدا بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا).....

بندھے سامان کی طرف دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ کبھی سامان کی طرف دیکھتا کبھی آصفہ کی طرف۔ وہ اس قدر بوکھلا گیا کہ اسے سویٹ مانگنا بھی یاد نہ رہا۔

''جیدے!'' میں نے کہا۔ ''ہم جا رہے ہیں، گاؤں۔''

''میں بھی جاؤں گا۔'' وہ چیخ کر بولا۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' میں نے کہا۔

''آؤ میں تمہیں سویٹ دوں۔'' آصفہ بولی۔

''جاؤں گا..... جاؤں گا۔'' وہ چلایا۔ اس نے سویٹ کی طرف توجہ نہ دی۔

''تیری آنٹی کیا کہے گی!'' آصفہ بولی۔

''کچھ نہیں کہے گی۔'' وہ رونکھا ہو کر بولا۔

دفعتاً میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

''آصفہ!'' میں چلایا اور دیوانہ وار میں نے آصفہ کی طرف دیکھا۔

پہلی مرتبہ آصفہ کی آنکھ میں چمک لہرائی، ایسی چمک جو صرف گنہگار کی آنکھ میں لہرا سکتی ہے۔

''آصفہ!'' خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔

آصفہ نے بڑھ کر جیدے کو کمبل میں لپیٹ لیا۔

◆◆◆

علامہ شبلی نعمانی

جب مٹھی بھر مسلمانوں نے رومی ٹڈی دل کو پچھاڑا

اسلامی تاریخ کی ایک یادگار جنگ کا ولولہ انگیز اور پُرتاثیر قصّہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

۶۳۶ء (۱۵ ہجری) کی بات ہے، رومی مسلمان لشکروں سے شکست کھا کھا کر دمشق و حمص وغیرہ سے نکلے تو انطاکیہ پہنچے۔ ہرقل سے فریاد کی کہ عرب نے تمام شام کو پامال کر دیا۔ ہرقل نے ان میں سے چند ہوشیار اور معزز آدمیوں کو دربار میں طلب کیا اور کہا کہ عرب تم سے زور اور جمعیت میں سروسامان میں کم ہیں۔ پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟ اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا لیکن ایک تجربہ کار بڈھے نے عرض کی: ''عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے ہیں۔ دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی طرح کا ظلم نہیں کرتے۔ ہر ایک سے برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں، اقرار کی پابندی نہیں کرتے۔ مسلمانوں میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا جو کام ہوتا ہے ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔''

قیصر درحقیقت شام سے نکل جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن ہر شہر اور ضلع سے جوق در جوق عیسائی فریادی چلے آتے تھے۔ قیصر کو سخت غیرت آئی اور نہایت جوش کے ساتھ آمادہ ہوا کہ شہنشاہی کا پورا زور عرب کے مقابلے میں صرف کر دیا جائے۔ روم، قسطنطنیہ، جزیرہ، آرمینیہ، ہر جگہ احکام بھیجے کہ تمام فوجیں پائے تخت انطاکیہ میں ایک تاریخ معین تک حاضر ہو جائیں۔ تمام اضلاع کے افسروں کو لکھ بھیجا کہ جس قدر آدمی جہاں سے مہیا ہو سکیں، روانہ کیے جائیں۔ ان احکام کا پہنچنا تھا کہ فوجوں کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ انطاکیہ کے چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی، فوجوں کا ٹڈی دل پھیلا ہوا تھا۔

اسلامی راہنماؤں کا احتجاج

حضرت ابوعبیدہؓ نے جو مقامات فتح کر لیے تھے، وہاں کے امراء اور رئیس ان کے عدل و انصاف کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ باوجود مخالف مذہب کے خود اپنی طرف سے دشمن کی خبر لانے کے لیے جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے حضرت ابوعبیدہؓ کو تمام واقعات کی اطلاع ہوئی۔ انھوں نے تمام افسروں کو جمع کیا اور کھڑے ہو کر ایک پراثر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا: ''مسلمانو! اللہ نے تم کو بار بار جانچا اور تم اس کی جانچ میں پورے اُترے۔ اس کے صلہ میں اللہ نے ہمیشہ تم کو مظفر و منصور رکھا۔ اب تمہارا دشمن اس سروسامان سے تمہارے مقابلے کے لیے چلا ہے کہ زمین کانپ اُٹھی ہے۔ اب بتاؤ کیا صلاح ہے؟''

یزید بن ابوسفیانؓ (حضرت معاویہؓ کے بھائی) کھڑے ہوئے اور کہا: ''میری رائے ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیں اور ہم خود شہر کے باہر لشکر آراء ہوں۔ اس کے ساتھ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ کو خط لکھا جائے کہ دمشق اور فلسطین سے چل کر مدد کو آئیں۔''

شرجیلؓ بن حسنہ نے کہا کہ اس موقع پر ہر شخص کو آزادانہ رائے دینی چاہیے۔ یزید نے جو رائے دی ہے بلاشبہ خیر خواہی سے دی لیکن میں اس کا مخالف ہوں۔ شہر والے تمام عیسائی ہیں۔ ممکن ہے وہ تعصب سے ہمارے اہل و عیال کو پکڑ کر قیصر کے حوالے کر دیں یا خود مار ڈالیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا، اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں۔ شرجیلؓ نے اُٹھ کر کہا: ''اے امیر! تجھ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں۔ ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں۔ اس لیے نقض عہد کیونکر ہو سکتا ہے؟''

حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کی لیکن یہ بحث طے نہیں ہوئی کہ آخر کیا کیا جائے؟ عام حاضرین نے رائے دی کہ حمص میں ٹھہر کر امدادی فوج کا انتظار کیا جائے۔ ابوعبیدہؓ نے کہا، اتنا وقت کہاں ہے؟ آخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں۔ وہاں خالدؓ موجود ہیں اور عرب کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سرحد قریب ہے۔ یہ ارادہ مصمم ہو چکا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حبیبؓ بن مسلمہ کو جو افسر خزانہ تھے، بلا کر کہا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے، اس معاوضہ میں لیا گیا کہ ہم ان کو ان کے دشمنوں سے بچا سکیں لیکن اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے جو کچھ ان سے وصول ہوا ہے، سب ان کو واپس دے دو اور ان سے کہہ دو کہ ہم کو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا، اب بھی ہے۔ چونکہ اس وقت تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے تم کو واپس کیا جاتا ہے۔

چنانچہ کئی لاکھ رقم جو وصول ہوئی تھی، واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں پر اس واقعہ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے: ''خدا تم کو واپس لائے۔'' یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انھوں نے کہا، توریت کی قسم، جب تک ہم زندہ ہیں، قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے اور ہر جگہ چوکی پر پہرہ بٹھا دیا۔

ابوعبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا بلکہ جس قدر اضلاع فتح ہو چکے تھے، ہر جگہ لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جس قدر رقم وصول ہوئی، واپس کر دی جائے۔

غرض ابوعبیدہؓ دمشق کو روانہ ہوئے اور ان تمام حالات سے خلیفہ اسلام حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر کہ مسلمان، رومیوں کے ڈر سے حمص سے چلے آئے، نہایت رنجیدہ ہوئے لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ کُل فوج اور افسران کا بھی یہی فیصلہ تھا، تو فی جملہ تسلی ہوئی اور فرمایا کہ خدا نے کسی مصلحت سے تمام مسلمانوں کو اس رائے پر متفق کیا ہو گا۔ ابوعبیدہؓ کو جواب لکھا: ''میں مدد کے لیے سعیدؓ بن عامر کو بھیجتا ہوں لیکن فتح و شکست فوج کی قلت و کثرت پر نہیں۔''

ابوعبیدہؓ نے دمشق پہنچ کر تمام افسروں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔ یزیدؓ بن ابوسفیان، شرجیلؓ بن حسنہ، معاذؓ بن جبل سب نے مختلف آراء دیں۔ اسی اثنا میں عمروؓ بن العاص کا قاصد خط لے کر پہنچا جس کا یہ مضمون تھا کہ اردن کے اضلاع میں عام بغاوت پھیل گئی ہے۔ رومیوں کی آمد آمد نے سخت تہلکہ ڈال دیا ہے اور حمص کو چھوڑ کر چلا آنا نہایت بے رعبی کا سبب ہوا ہے۔ ابوعبیدہؓ نے جواب میں لکھا کہ حمص کو ہم نے ڈر کر نہیں چھوڑا، بلکہ مقصود یہ تھا کہ دشمن محفوظ مقامات سے نکل آئے اور اسلامی فوجیں جو جا بجا پھیلی ہوئی ہیں، یکجا ہو جائیں۔ خط میں یہ بھی لکھا کہ تم اپنی جگہ سے نہ ٹلو، میں وہیں آ کر تم سے ملتا ہوں۔

دوسرے دن ابوعبیدہؓ دمشق سے روانہ ہو گئے اور اردن کی حدود میں یرموک پہنچ کر قیام کیا۔ عمروؓ بن العاص بھی یہیں آ کر ملے۔ یہ علاقہ جنگ کی ضرورتوں کے لیے اس لحاظ سے مناسب تھا کہ عرب کی سرحد بہ نسبت اور تمام مقامات کے قریب تھی اور پشت پر عرب کی سرحد تک کھلا میدان تھا۔ جس سے یہ موقع حاصل تھا کہ ضرورت پر جہاں تک چاہیں، پیچھے ہٹتے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے سعیدؓ بن عامر کے ساتھ جو فوج روانہ کی تھی، وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ادھر رومیوں کی آمد اور ان کے سامان کی صورت حال سن سن کر مسلمان گھبرائے جاتے تھے۔ ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک اور قاصد دوڑایا اور لکھا کہ رومی بحر و بر سے اُبل پڑے ہیں۔ راہب اور خانقاہ نشین جنہوں نے کبھی خلوت سے قدم باہر نہیں نکالا تھا، نکل نکل کر فوج کے ساتھ ہوتے جاتے۔

خط پہنچا تو حضرت عمرؓ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور خط پڑھ کر سنایا۔ تمام صحابہ بے اختیار رو پڑے اور نہایت جوش کے ساتھ پکار کر کہا، امیر المومنین! خدا کے لیے ہم کو اجازت دے دیں کہ ہم اپنے بھائیوں پر جا کر نثار ہو جائیں۔ خدانخواستہ ان کا بال بیکا ہوا تو پھر جینا بے سود ہے۔ مہاجرین و انصار کا جوش بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف

نے کہا کہ امیر المومنین! آپ خود سپہ سالار بنیے اور ہم کو ساتھ لے کر چلیے۔ لیکن دوسرے صحابہ نے اس سے اختلاف کیا اور رائے یہ ٹھہری کہ امدادی فوجیں بھیجی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے قاصد سے دریافت کیا کہ دشمن کہاں تک آ گئے ہیں؟ اس نے کہا: ''یرموک سے تین چار منزل کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نہایت غمزدہ ہوئے اور فرمایا کہ افسوس اب کیا ہوسکتا ہے؟ اتنے عرصہ میں کیونکر مدد پہنچ سکتی ہے؟'' پھر ابوعبیدہؓ کے نام نہایت پُرتاثیر الفاظ میں ایک خط لکھا اور قاصد سے کہا کہ خود ایک ایک صف میں جا کر یہ خط سنانا اور زبانی کہنا کہ حوصلہ کسی صورت نہ ہارنا۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہوا کہ جس دن قاصد ابوعبیدہؓ کے پاس آیا اسی دن عامرؓ بھی ہزار آدمی کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسلمانوں کو نہایت تقویت ہوئی اور انھوں نے استقلال کے ساتھ لڑائی کی تیاریاں شروع کیں۔ رومی فوجیں یرموک کے مقابل دیر الجبل میں اُتریں۔ خالدؓ نے لڑائی کی تیاریاں شروع کیں۔ معاذؓ بن جبل بڑے رتبہ کے صحابی تھے، انھیں میمنہ پر مقرر کیا۔ قبات بن اشیم کو میسرہ اور ہاشم بن عتبہ کو پیدل فوج کی افسری دی۔ اپنے رکاب کی فوج کے چار حصے کیے ایک کو اپنی رکاب میں رکھا باقی پر قیس بن ہبیرہ، میسرہ بن مسروق اور عمرو بن الطفیل کو مقرر کیا۔ یہ تینوں بہادر تمام عرب میں انتخاب تھے اور اس وجہ سے فارس العرب کہلاتے تھے۔

رومی بھی بڑے سروسامان سے نکلے۔ دو لاکھ سے زیادہ کی جمعیت تھی اور ۲۴ صفیں تھیں۔ جن کے آگے آگے مذہبی پیشوا ہاتھوں میں صلیبیں لیے جوش دلاتے جاتے تھے۔ فوجیں بالکل مقابل آ گئیں تو ایک بطریق صف چیر کر نکلا اور کہا کہ میں تنہا لڑنا چاہتا ہوں۔ میسرہ بن مسروق نے گھوڑا بڑھایا مگر دشمن چونکہ نہایت تنومند اور جوان تھا، خالد نے روکا اور قیس بن ہبیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

''پردہ نشین عورتوں سے پوچھ لو، کیا میں لڑائی کے دن بہادروں کے کام نہیں کرتا۔''

قیس اس طرح جھپٹ کر پہنچے کہ بطریق ہتھیار بھی نہیں سنبھال سکا تھا کہ ان کا وار چل گیا۔ تلوار سر پر پڑی اور خود کاٹتی ہوئی گردن تک اتر آئی۔ بطریق ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا۔ ساتھ ہی مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ مارا۔ خالدؓ نے کہا آغاز اچھا ہوا اور اب اللہ نے چاہا تو آگے فتح ہے۔ عیسائیوں نے خالدؓ کے ہمرکاب افسروں کے مقابلہ میں فوجیں متعین کی تھیں لیکن سب نے شکست کھائی۔ اس دن یہیں تک نوبت پہنچ کر لڑائی ملتوی رہ گئی۔

رات کو باہان نے سردار جمع کر کے کہا کہ عربوں کو شام کی دولت کا مزہ پڑ چکا۔ بہتر یہ ہے کہ مال و زر کی طمع دلا کر ان کو یہاں سے ٹالا جائے۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ دوسرے دن ابوعبیدہؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ کسی معزز افسر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم اس سے صلح کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ابوعبیدہؓ نے خالدؓ کا انتخاب کیا۔ قاصد، جو پیغام لے کر آیا تھا، اس کا نام جارج تھا۔ جس وقت وہ پہنچا شام ہو چکی تھی۔ ذرا دیر بعد مغرب کی نماز شروع ہو گئی۔ مسلمان جس ذوق و شوق کے ساتھ تکبیر کہہ کر کھڑے ہوئے اور جس محویت، سکون و وقار اور ادب و خشوع سے انھوں نے نماز ادا کی، قاصد نہایت حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔

جب نماز ہو چکی تو اس نے ابوعبیدہؓ سے چند سوالات کیے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ تم عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ ابوعبیدہؓ نے قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ مترجم نے الفاظ کا ترجمہ کیا تو جارج بے اختیار پکار اُٹھا: ''بے شک عیسیٰ کے یہی اوصاف ہیں اور بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کلمۂ توحید پڑھا اور مسلمان ہو گیا وہ اپنی قوم کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا تھا لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے اس خیال سے کہ رومیوں کو بدعہدی کا گمان نہ ہو، مجبور کیا اور کہا کہ یہاں

سے جو سفیر جائے گا، اس کے ساتھ چلے آنا۔

دوسرے دن خالدؓ رومیوں کی لشکر گاہ میں گئے۔ رومیوں نے اپنی شوکت دکھانے کے لیے پہلے سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ راستے کے دونوں جانب دور تک سواروں کی صفیں قائم کی تھیں جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے لیکن خالدؓ اس لاپروائی اور تحقیر کی نگاہ ان پر نظر ڈالتے جاتے جس طرح شیر بکروں کے ریوڑ چیرتا چلا جاتا ہے۔

باہان کے خیمے کے پاس پہنچے تو اس نے نہایت احترام کے ساتھ استقبال کیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ مترجم کے ذریعے گفتگو شروع ہوئی۔ باہان نے معمولی بات چیت کے بعد لیکچر کے طریقے سے تقریر شروع کی۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کے بعد قیصر کا نام لیا اور فخر سے کہا کہ ہمارا بادشاہ تمام بادشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ ترجمان الفاظ کا ابھی پورا ترجمہ نہ کر پایا تھا کہ خالدؓ نے باہان کو روک دیا اور کہا کہ تمہارا بادشاہ ایسا ہی ہوگا لیکن ہم نے جسے سردار بنا رکھا ہے، اس کو ایک لحظہ کے لیے اگر بادشاہی کا خیال آئے تو ہم فوراً اس کو معزول کر دیں۔

باہان نے پھر تقریر شروع کی اور اپنے جاہ و دولت کا فخر بیان کر کے کہا کہ اہلِ عرب! تمہاری قوم کے جو لوگ ہمارے ملک میں آ کر آباد ہوئے، ہم نے ہمیشہ ان کے ساتھ دوستانہ سلوک رکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس مراعات کا تمام عرب ممنون ہوگا لیکن خلاف توقع تم ہمارے ملک پر چڑھ آئے اور چاہتے ہو کہ ہمیں ہمارے ہی ملک سے نکال دو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بہت سی قوموں نے بارہا ایسے ارادے کیے لیکن کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب تم کو کہ تمام دنیا میں تم سے زیادہ کوئی قوم جاہل، وحشی اور بے سروسامان نہیں، یہ حوصلہ ہوا ہے۔ ہم اس پر بھی درگزر کرتے ہیں بلکہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار دینار اور افسروں کو ہزار ہزار اور عام سپاہیوں کو سو سو دینار دلوا دیے جائیں گے۔

باہان اپنی تقریر ختم کر چکا تو خالدؓ اُٹھے اور حمد و نعت کے بعد کہا: ”بے شبہ تم دولت مند اور مالدار ہو، صاحب حکومت ہو۔ تم نے اپنے ہمسایہ عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی ہمیں معلوم ہے، لیکن یہ تمہارا کچھ احسان نہ تھا بلکہ اشاعت مذہب کی ایک تدبیر تھی۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ عیسائی ہو گئے اور آج خود ہمارے مقابلے میں تمہارے ساتھ ہو کر ہم سے لڑتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم نہایت محتاج، تنگدست اور خانہ بدوش تھے۔ ہمارے ظلم و جہالت کا یہ حال تھا کہ قوی کمزور کو پیس ڈالتا تھا۔ قبائل آپس میں لڑ لڑ کر برباد ہوتے جاتے تھے۔ بہت سے خدا بنا رکھے تھے اور ان کو پوجتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بت تراشتے تھے اور اس کی عبادت کرتے تھے، لیکن خدا نے ہم پر رحم کیا اور ایک پیغمبرؐ بھیجا جو خود ہماری قوم سے تھا اور ہم میں سب سے زیادہ شریف، زیادہ فیاض، زیادہ پاک خو تھا۔ اسؐ نے ہمیں توحید سکھائی اور بتا دیا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں۔ وہ بیوی اور اولاد نہیں رکھتا۔ وہ بالکل یکتا و یگانہ ہے۔ اس نے ہم کو یہ بھی حکم دیا کہ ہم ان عقائد کو تمام دنیا کے سامنے پیش کریں۔ جس نے ان کو مانا وہ مسلمان اور ہمارا بھائی ہے۔ جس نے نہ مانا لیکن جزیہ دینا قبول کیا، اس کے ہم حامی اور محافظ ہیں۔ جس کو دونوں سے انکار ہو، اس کے لیے تلوار ہے۔“

باہان نے جزیہ کا نام سن کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے لشکر کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”مر کر بھی جزیہ نہ دیں گے۔ ہم جزیہ لیتے ہیں دیتے نہیں۔“ غرض کوئی معاملہ طے نہیں ہوا اور خالدؓ اُٹھ کر چلے آئے۔ اب اُس تاریخی لڑائی کی تیاریاں شروع ہوئیں جس کے بعد رومی پھر کبھی سنبھل نہ سکے۔ خالدؓ کے چلے آنے کے بعد باہان نے سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ تم نے سنا، اہلِ عرب کو دعویٰ ہے کہ جب تک تم ان کی رعایا نہ بن جاؤ ان کے حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ تم کو ان کی غلامی منظور ہے؟ تمام افسروں نے بڑے جوش سے کہا کہ مر جائیں گے مگر یہ ذلت گوارا نہیں ہو سکتی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

صبح ہوئی تو رومی اس جوش اور سروسامان سے نکلے کہ مسلمانوں کو بھی حیرت ہوگئی۔ خالدؓ نے یہ دیکھ کر عرب کے عام قاعدے کے خلاف نئے طور سے فوج آرائی کی۔ فوج جو تیس پینتیس ہزار تھی، اس کے چھتیس حصے کیے اور آگے پیچھے نہایت ترتیب کے ساتھ اسی قدر صفیں قائم کیں۔ قلب فوج ابوعبیدہؓ کو دیا۔ میمنہ پر عمروؓ بن العاص اور شرجیلؓ مامور ہوئے۔ میسرہ یزید بن ابی سفیان کی کمان میں تھا۔ ان کے علاوہ ہر صف پر الگ الگ جو افسر متعین کیے، چن کر ان لوگوں کو کیا جو بہادری اور فنون جنگ میں شہرت عام رکھتے تھے۔ خطبا جو اپنے زور کلام سے لوگوں میں بل چل ڈال دیتے تھے، اس خدمت پر مامور ہوئے کہ پُرجوش تقریروں سے فوج کو جوش دلائیں۔ انھیں میں ابوسفیان بھی تھے جو فوجوں کے سامنے یہ الفاظ کہتے پھرتے:

''یارو! نگاہیں نیچی رکھو۔ برچھیاں تان لو۔ اپنی جگہ پر جمے رہو پھر جب دشمن حملہ آور ہو تو آنے دو۔ یہاں تک کہ جب برچھیوں کی نوک پر آجائیں تو شیر کی طرح ان پر ٹوٹ پڑو۔

فوج کی تعداد اگرچہ کم تھی یعنی ۳۰، ۳۵ ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے لیکن تمام عرب میں منتخب۔ ان میں سے خاص وہ بزرگ جنھوں نے رسول اللہ کا جمال مبارک دیکھا تھا ایک ہزار تھے، سو بزرگ وہ تھے جو جنگ بدر میں رسول اللہ کے ہمرکاب رہے تھے۔

عرب کے مشہور قبائل میں سے دس ہزار سے زیادہ صرف ازد کے قبیلے کے تھے۔ حمیر کی ایک بڑی جماعت تھی، ہمدان، خولان نجم، جذام وغیرہ کے مشہور سردار تھے۔ اس معرکہ کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ عورتیں بھی اس میں شریک تھیں اور نہایت بہادری سے لڑیں۔ امیر معاویہؓ کی ماں ہندہ حملہ کرتی ہوئی بڑھتیں تو پکارتیں، عضدواغطفان بسیوفکم۔ امیر معاویہؓ کی بہن جویریہ نے بھی بڑی دلیری سے جنگ کی۔

مقدادؓ جو نہایت خوش آواز تھے، فوج کے آگے آگے سورۂ انفال (جس میں جہاد کی ترغیب ہے) تلاوت کرتے جاتے تھے۔

اُدھر رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لیں کہ ہٹنے کا خیال تک نہ آئے۔ جنگ کی ابتدا رومیوں کی طرف سے ہوئی۔ دوا کھ کا ٹڈی دل ایک ساتھ بڑھا۔ ہزاروں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیب لیے آگے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی جے پکارتے آتے۔ یہ سروسامان دیکھ کر ایک شخص کی زبان سے بے اختیار نکلا: ''اللہ اکبر کس قدر بے انتہا فوج ہے۔'' خالدؓ نے جھلا کر کہا، چپ رہ۔ اللہ کی قسم میرے گھوڑے کے سم اچھے ہوتے تو میں کہہ دیتا: ''عیسائی اتنی ہی فوج اور بڑھالیں۔''

اب عیسائیوں نے نہایت زور وشور سے حملہ کیا اور تیروں کا مینہ برساتے بڑھے۔ مسلمان دیر تک ثابت قدم رہے لیکن حملہ اس زور کا تھا کہ مسلمانوں کا میمنہ ٹوٹ کر فوج سے علیحدہ ہوگیا اور نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا۔ ہزیمت یافتہ ہٹتے ہٹتے خواتین کے خیمہ گاہ تک آگئے۔ عورتوں کو یہ حالت دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ انھوں نے خیمہ کی چوبیں اکھاڑ لیں اور پکاریں کہ نامردو! ادھر آئے تو چوبوں سے تمہارا سر توڑ دیں گے۔ یہ حالت دیکھ کر معاذؓ بن جبل جو میمنہ کے ایک حصہ کے سپہ سالار تھے، گھوڑے سے کود پڑے اور کہا کہ میں تو پیدل لڑتا ہوں لیکن کوئی بہادر اس گھوڑے کا حق ادا کر سکے تو گھوڑا حاضر ہے۔ ان کے بیٹے نے کہا: ''ہاں یہ حق میں ادا کروں گا۔ کیونکہ میں سوار ہو کر اچھا لڑ سکتا ہوں۔''

غرض دونوں باپ بیٹے فوج میں گھسے اور اس دلیری سے جنگ کی کہ مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے پاؤں پھر سنبھل گئے۔ ساتھ ہی حجاج جو قبیلۂ زُبدہ کے سردار تھے، پانچ سو آدمی لے کر بڑھے اور عیسائیوں کو روک لیا جو مسلمانوں کا تعاقب

Noor Azeem
www.pakistanipoint.com

کرتے چلے آئے تھے۔ میمنہ میں قبیلہ ازد شروع حملہ سے ثابت قدم رہا تھا۔ عیسائیوں نے لڑائی کا سارا زور ان پر ڈالا لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ جنگ کی یہ شدت تھی کہ فوج میں ہر طرف سر ہاتھ بازو کٹ کٹ کر گرتے جاتے تھے لیکن ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ عمرو بن الطفیل جو قبیلہ کے سردار تھے، تلوار مارتے جاتے اور للکارتے کہ ازدیو! دیکھنا۔ مسلمانوں پر تمہاری وجہ سے داغ نہ آئے۔ نو بڑے بڑے بہادران کے ہاتھ سے مارے گئے اور آخر خود شہادت حاصل کی۔

حضرت خالدؓ نے اپنی فوج کو پیچھے لگا رکھا تھا۔ اچانک وہ صف چیر کر نکلے اور اس زور سے حملہ کیا کہ رومیوں کی صفیں ابتر کر دیں۔ عکرمہ نے جو ابوجہل کے فرزند تھے اور سلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے، گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا: ''عیسائیو! میں کسی زمانے (کفر کی حالت) میں خود رسول اللہؐ سے لڑ چکا ہوں۔ کیا آج تمہارے مقابلہ میں میرا پاؤں پیچھے پڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا، مرنے پر کون بیعت کرتا ہے؟ چار سو اشخاص نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے، مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر میں ملی۔ کچھ کچھ دم باقی تھا۔ خالدؓ نے اپنے زانو پر ان کا سر رکھا اور گلے میں پانی ٹپکا کر کہا: ''خدا کی قسم عمرؓ کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے۔''

غرض عکرمہ اور ان کے ساتھی گو خود شہید ہو گئے لیکن رومیوں کے ہزاروں آدمی برباد کر دیے۔ خالدؓ کے حملوں نے اور بھی ان کی طاقت توڑ دی یہاں تک کہ آخر ان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ خالدؓ ان کو دباتے ہوئے سپہ سالار (ورنجار) تک پہنچ گئے۔ ورنجار اور رومی افسروں نے آنکھوں پر رومال ڈال لیے کہ اگر ان کی آنکھیں فتح کی صورت نہ دیکھ سکیں تو شکست بھی نہ دیکھیں۔ عین اس وقت جب ادھر میمنہ میں بازار اقتال گرم تھا، ابن قطاطیر نے میسرہ پر حملہ کیا۔ بدقسمتی سے اس حصے میں اکثر لخم وغسان کے قبیلہ کے آدمی تھے جو شام کے اطراف میں بود و باش رکھتے تھے۔ ایک مدت سے روم کے باجگزار رہتے آئے تھے۔ رومیوں کا رعب جو دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ پہلے ہی حملے میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اگر افسروں نے بھی بے ہمتی کی ہوتی تو لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ رومی بھگوڑوں کا پیچھا کرتے ہوئے خیموں تک پہنچ گئے۔

عورتیں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار نکل پڑیں اور ان کی پامردی نے عیسائیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ فوج اگرچہ ابتر ہو گئی تھی لیکن افسروں میں سے قباث بن اشیمؓ، سعید بن زید، یزیدؓ بن ابی سفیان، عمروؓ بن شرجیل بن حسنہ داد شجاعت دے رہے تھے۔ قباث کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے جاتے مگر ان کے تیور پر بل نہ آتا۔ نیزہ ٹوٹ کر گرتا تو کہتے کہ کوئی ہے جو اس شخص کو ہتھیار دے جس نے خدا سے اقرار کیا ہے کہ میدان جنگ سے ہٹے گا تو مر کر ہٹے گا۔

لوگ فوراً تلوار یا نیزہ ان کے ہاتھ میں لا کر دے دیتے اور پھر وہ شیر کی طرح جھپٹ کر دشمن پر جا پڑتے۔ ابوالاعور گھوڑے سے کود پڑے اور اپنے رکاب کی فوج سے مخاطب ہو کر کہا کہ صبر و استقلال دنیا میں عزت ہے اور عقبیٰ میں رحمت، دیکھنا یہ دولت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ سعیدؓ بن زید غصہ میں گھٹنے ٹیکے ہوئے کھڑے تھے۔ رومی ان کی طرف بڑھے تو شیر کی طرح جھپٹے اور مقدمہ کے افسر کو مار کر گرا دیا۔ یزیدؓ بن ابی سفیان (حضرت معاویہؓ کے بھائی) بڑی ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے۔

اتفاق سے ان کے والد ابوسفیان جو فوج کو جوش دلاتے پھرتے تھے، ان کی طرف آ نکلے۔ بیٹے کو دیکھ کر کہا، جان پدر

اس وقت میدان میں ایک ایک سپاہی شجاعت کے جوہر دکھا رہا ہے۔ تُو سپہ سالار ہے اور سپاہیوں کی بہ نسبت تجھ پر شجاعت کا زیادہ حق ہے۔ تیری فوج میں سے ایک سپاہی بھی اس میدان میں تجھ سے بازی لے گیا تو تیرے لیے شرم کی جگہ ہے۔

شرجیلؓ کا یہ حال تھا کہ رومیوں کا چاروں طرف سے نرغہ تھا اور یہ درمیان میں پہاڑ کی طرح ڈٹے کھڑے نعرہ مارتے: ''خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں؟'' یہ آواز جس کے کان میں پڑی، بے اختیار لوٹ پڑا یہاں تک کہ اکھڑی ہوئی فوج پھر سنبھل گئی۔ شرجیلؓ نے ان کو لے کر اس بہادری سے جنگ کی کہ رومی جو ٹوٹے چلے آتے تھے، بڑھنے سے رک گئے۔

ادھر عورتیں خیموں سے نکل نکل کر فوج کی پشت پر آ کھڑی ہوئیں اور چلا کر کہتی تھیں کہ میدان سے قدم ہٹایا تو پھر ہمارا منہ نہ دیکھنا۔

لڑائی کے معقول پہلو اب تک برابر تھے بلکہ غلبہ کا پلہ رومیوں کی طرف تھا۔ دفعتاً قیس بن ہبیرہ جن کو خالدؓ نے فوج کا ایک حصہ دے کر میسرہ کی پشت پر متعین کر دیا تھا، عقب سے نکلے اور اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ رومی سرداروں نے بہت سنبھالا مگر ان کی فوج سنبھل نہ سکی تمام صفیں ابتر ہو گئیں اور گھبرا کر پیچھے ہٹیں۔ ساتھ ہی سعیدؓ بن زید نے قلب سے نکل کر حملہ کیا۔ رومی دور تک ہٹتے چلے گئے یہاں تک کہ میدان کے سرے پر جو نالہ تھا، اس کے کنارے تک آ گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کی لاشوں نے وہ نالہ بھر دیا اور میدان خالی ہو گیا۔

اس لڑائی کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، حباش بن قیس جو ایک بہادر سپاہی تھے، بڑی جانبازی سے لڑ رہے تھے۔ اس اثنا میں کسی نے ان کے پاؤں پر تلوار ماری اور ایک پاؤں کٹ کر الگ ہو گیا۔ حباش کو خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ میرا پاؤں کیا ہوا؟ ان کے قبیلے کے لوگ اس واقعہ پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔

رومیوں کے جس قدر آدمی مارے گئے ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ طبری اور ازدی نے لاکھ سے زیادہ بیان کی ہے۔ بلاذری نے ستر ہزار لکھا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے تین ہزار کا نقصان ہوا جن میں ضرارؓ بن ازور، ہاشم بن العاصی ایان، سعیدؓ وغیرہ تھے۔ قیصر انطاکیہ میں تھا کہ شکست کی خبر پہنچی۔ اسی وقت قسطنطنیہ کی تیاری کی۔ چلتے وقت شام کی طرف رُخ کر کے کہا: ''الوداع اے شام'' ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو نامہ فتح لکھا۔ اور ایک مختصر جماعت بھیجی جس میں خدیفہؓ بن الیمان بھی تھے۔ حضرت عمرؓ یرموک کی خبر کے انتظار میں کئی دن سے سوئے نہ تھے۔ فتح کی خبر پہنچی تو دفعتاً سجدہ میں گرے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ابوعبیدہؓ یرموک سے حمص کو واپس گئے اور خالدؓ کو سنیرین روانہ کیا۔ شہر والوں نے اوّل مقابلہ کیا لیکن پھر قلعہ بند ہو کر جزیہ کی شرط پر صلح کر لی۔ یہاں عرب کے قبائل میں سے قبیلہ تنوخ مدت سے آ کر آباد ہو گیا تھا۔ یہ لوگ برسوں تک کمبل کے خیموں میں بسر کرتے رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ تمدن کا یہاں اثر ہوا کہ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنوالی تھیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے ہم قومی کے اتحاد سے ان کو اسلام کی ترغیب دی چنانچہ سب مسلمان ہو گئے۔ صرف بن سلیح کا خاندان عیسائیت پر قائم رہا۔ چند روز کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ قبیلہ طے کے بھی بہت سے لوگ یہاں آباد تھے۔ انھوں نے بھی اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیا۔ جنگِ یرموک ۱۵ تا ۲۰ راگست ۶۳۶ء میں لڑی گئی۔

◆◆◆

www.pakistanipoint.com

اصغر ندیم

بھارت کے ممتاز موسیقار، نوشاد اکثر محمد رفیع کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ سناتے تھے۔ ایک بار مجرم کو پھانسی دی جا رہی تھی۔ اس سے آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے نہ تو اپنے خاندان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ ہی کسی خاص کھانے کی فرمائش۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی جسے سن کر جیل کے ملازم حیران رہ گئے۔ اس نے کہا کہ وہ مرنے سے پہلے رفیع کا فلم ''بیجو باورا'' کا نغمہ ''اے دنیا کے رکھوالے'' سننا چاہتا ہے۔

اس کے بعد ایک ٹیپ ریکارڈر لا کر قیدی کے لیے وہ گانا بجایا گیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس نغمے کو گانے کے لیے محمد رفیع نے پندرہ دن تک ریاض کیا تھا۔ ریکارڈنگ کے بعد ان کی آواز اس حد تک ٹوٹ گئی تھی کہ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، رفیع شاید کبھی اپنی آواز واپس نہیں پا سکیں گے۔ لیکن رفیع نے لوگوں کو غلط ثابت کیا اور انڈیا کے سب سے زیادہ مقبول گلوکار بن گئے۔

چار فروری 1980ء کو سری لنکا کے یوم آزادی پر محمد رفیع کو دارالحکومت کولمبو میں ایک شو کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس دن ان کو سننے 12 لاکھ شہری جمع ہوئے جو اس وقت کا عالمی ریکارڈ

بالی ووڈ کا شریف النفس گلوکار

خدا کی عطا کردہ سحر انگیز آواز نے جسے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہستی بن دیا

تھا۔ سری لنکا کے صدر جے آر جے وردھنے اور وزیر اعظم پریم داسا افتتاح کے فوراً بعد کسی اور پروگرام میں حصہ لینے جانے والے تھے۔ لیکن محمد رفیع کی زبردست گلوکاری نے انھیں رکنے پر مجبور کر دیا اور وہ پروگرام ختم ہونے تک وہاں سے ہلے نہیں۔

محمد رفیع کی بہو اور ان پر ایک کتاب لکھنے والی یاسمین خالد رفیع کہتی ہیں کہ ان کی عادت تھی، جب وہ بیرون ملک کے کسی شو میں جاتے تو وہاں کی زبان میں ایک گیت ضرور سناتے تھے۔ اس دن کولمبو میں بھی انھوں نے سنہالا زبان میں ایک گیت سنایا۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے ہندی گانے سنانے شروع کیے، بھیڑ بے قابو ہوگئی اور ایسا تب ہوا جب ہجوم میں شاید ہی کوئی اردو ہندی سمجھتا تھا۔

اگر کسی نغمے میں اظہار عشق کے 101 طریقے پیش کرنے ہوں تو آپ صرف ایک ہی گلوکار پر اپنا پیسہ لگا سکتے تھے اور وہ ہیں محمد رفیع۔ چاہے وہ نوجوان محبت کا الھڑ پن ہو، دل ٹوٹنے کی صدا، پختہ محبت کا اظہار، گرل فرینڈ سے درخواست یا صرف اس کے حسن کی تعریف، ان جذبوں کو آواز کے سُر دینے میں محمد رفیع کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

محبت کے موضوع سے قطع نظر انسانی جذبات کے جتنے بھی پہلو ہو سکتے ہیں..... دکھ، خوشی، عقیدت یا حب الوطنی یا پھر گانیکی کی کوئی بھی شکل مثلاً بھجن، قوالی، لوک، کلاسیکی موسیقی یا غزل..... محمد رفیع کے ترکش میں تمام تیر موجود تھے۔

رفیع کو پہلا بریک موسیقار شیام سندر نے پنجابی فلم گل بلوچ' میں دیا تھا جبکہ ممبئی میں ان کی پہلی فلم گاؤں کی گوری' تھی۔ نوشاد اور حسن لال بھگت رام نے ان کی صلاحیت کو پہچانا۔ اس زمانے میں شرما جی کے نام سے مشہور آج کے خیام نے بھی فلم بیوی' میں ان سے گیت گوائے۔

خیام یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''سنہ 1949ء میں میری ان کے ساتھ پہلی غزل ریکارڈ ہوئی جسے ولی (دکنی) نے لکھا تھا، 'اکیلے میں وہ گھبراتے تو ہوں گے، مٹا کے مجھ کو پچھتاتے تو ہوں گے۔' رفیع صاحب کی آواز کے کیا کہنے! جس طرح میں نے چاہا انھوں نے اسی طرح گایا۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو یہ گانا ریچ آف دی نیشن ہو گیا۔''

محمد رفیع کے کیریئر کا بہترین دور 1956ء سے 1965ء کے برسوں پر محیط رہا۔ اس دوران انھوں نے کل چھ فلم فیئر ایوارڈ جیتے اور ریڈیو سیلون سے نشر ہونے والے بنا کا گیت مالا' میں دو دہائیوں تک چھائے رہے۔

محمد رفیع کے کیریئر کو 1969ء میں اس وقت جھٹکا لگا جب آرادھنا' فلم ریلیز ہوئی۔ راجیش کھنہ کی چمک نے پورے انڈیا کو چکا چوند کر دیا اور آر ڈی برمن نے بڑا موسیقار بننے کی طرف اپنا پہلا بڑا قدم بڑھایا۔

السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے سابق شریک ایڈیٹر، راجو بھارتن کہتے ہیں: ''آرادھنا کے تمام گیت پہلے رفیع ہی گانے والے تھے۔ اگر ایس ڈی برمن بیمار نہیں پڑتے اور آر ڈی برمن نے ان کا کام نہیں سنبھالا ہوتا تو کشور کمار سامنے آتے ہی نہیں اور ویسے بھی آرادھنا' کے پہلے دو ڈوئٹ رفیع نے ہی گائے۔'' بھارتن مزید بتاتے ہیں کہ آر ڈی برمن نے بہت پہلے واضح کر دیا تھا کہ اگر انھیں موقع ملا تو وہ رفیع کی جگہ نوعمر گلوکار لائیں گے۔

جہاں تک رفیع کی مقبولیت میں کمی کی بات ہے، اس کی کچھ وجوہ تھیں۔ جن اداکاروں کے لیے رفیع گا رہے تھے یعنی دلیپ کمار، راجندر کمار، دیو آنند، دھرمیندر، جیتیندر اور سنجیو کمار، وہ پرانے ہو گئے اور ان کی جگہ نئے اداکار لے رہے تھے۔ ان کو نئی آواز کی ضرورت تھی۔ آر ڈی برمن جیسے موسیقار ابھر کر سامنے آ رہے تھے اور انھیں کچھ نیا کر کے دکھانا تھا۔

70ء کی دہائی کے آغاز میں سوائے لکشمی کانت پیارے لال کے موسیقاروں نے محمد رفیع کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محمد علی کو اپنی ایمانی قوت دکھاتے ہوئے

محمد رفیع، لتا اور لکشمی کانت پیارے لال

لکشمی کانت تو اب رہے نہیں، لیکن پیارے لال زندہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے رفیع کا نہیں، بلکہ رفیع نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

جانے مانے براڈ کاسٹر، امین سیانی محمد رفیع اور لکشمی کانت پیارے لال کے بارے میں دلچسپ کہانی سناتے ہیں:

''ایک بار لکشمی کانت نے مجھے بتایا، جب وہ پہلی بار رفیع کے پاس گانا ریکارڈ کرانے کے لیے گئے تو انھوں نے ان سے کہا، ہم لوگ نئے ہیں، اس لیے ہمیں کوئی پروڈیوسر بہت زیادہ پیسے بھی نہیں دے گا۔ ہم نے آپ کے لیے ایک گیت بنایا ہے۔ اگر آپ اسے کم پیسوں میں گا دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

''رفیع نے دھن سنی۔ انھیں بہت پسند آئی اور وہ اسے گانے تیار ہو گئے۔ ریکارڈنگ کے بعد وہ رفیع کے پاس تھوڑے پیسے لے کر گئے۔ رفیع نے پیسے یہ کہتے ہوئے واپس لوٹا دیے کہ یہ پیسے تم آپس میں بانٹ لو اور اسی طرح بانٹ کر کھاتے رہو۔ لکشمی کانت نے مجھے بتایا کہ اس دن کے بعد سے انھوں نے رفیع کی وہ بات ہمیشہ یاد رکھی اور ہمیشہ بانٹ کر کھایا۔''

رفیع بہت کم بولنے والے، ضرورت سے زیادہ شائستہ اور شیریں زبان انسان تھے۔ ان کی بہو یاسمین خورشید بتاتی ہیں کہ نہ تو وہ شراب یا سگریٹ پیتے تھے اور نہ ہی پان کھاتے تھے۔ بالی وڈ کی پارٹیوں میں بھی جانے کا انھیں کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر پر وہ صرف لنگی کرتا ہی پہنتے تھے لیکن جب ریکارڈنگ پر جاتے تو ہمیشہ سفید قمیص اور پتلون پہنا کرتے۔

انھیں اچھی گھڑیوں اور فینسی کاروں کا بہت شوق تھا۔ لندن کی گاڑیوں کے رنگوں سے وہ بہت متاثر رہتے۔ لہٰذا ایک بار انھوں نے اپنی فیئٹ گاڑی کو طوطے کے رنگ میں رنگوا دیا تھا۔ انھوں نے ایک بار مذاق میں کہا کہ وہ اپنی کار کو اس طرح سجاتے ہیں جیسے دسہرے (ہندو تہوار) میں بیل کو سجایا جاتا ہے۔

رفیع کبھی کبھی پتنگ بھی اڑاتے تھے۔ اکثر ان کے پڑوسی، مناڈے ان کی پتنگ کاٹ دیا کرتے۔ وہ بہت اچھے مہمان نواز بھی تھے۔ دعوت دینے کا انھیں بہت شوق تھا۔ خیام بتاتے ہیں کہ رفیع صاحب نے کئی بار انھیں اور ان کی بیوی جگجیت کور کو کھانے پر بلایا۔ ان کے یہاں کا کھانا بہت عمدہ ہوا کرتا تھا۔

یاسمین خالد بتاتی ہیں کہ ایک بار وہ برطانیہ کی کاؤنٹی میں شوکر رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر خالد کے ساتھ ان سے ملنے گئیں تو وہ تھوڑے خراب موڈ میں تھے کیونکہ انھیں وہاں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ڈھنگ کا کھانا نہیں مل پا رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہاں سے لندن جانے میں کتنا وقت لگے گا؟ خورشید نے جواب دیا ،یہی کوئی تین گھنٹے۔

وہ یاسمین کی طرف مڑے اور پوچھا کیا تم ایک گھنٹے میں دال، چاول اور چٹنی بنا سکتی ہو؟ یاسمین نے جی ہاں کہا تو رفیع بولے، "چلو لندن چلتے ہیں۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سات بجے شو شروع ہونے سے پہلے واپس لوٹ آئیں گے۔"

رفیع، خالد اور یاسمین بغیر کسی کو بتائے لندن گئے۔ یاسمین نے ان کے لیے فوری دال، چاول اور چٹنی اور پیاز ٹماٹر کی ترکاریاں بنائی۔ رفیع نے کھانا کھا کر یاسمین کو بہت دعائیں دیں اور ایسا لگا جیسے کسی بچے کو اس کی پسند کا کھلونا مل گیا ہو۔ جب انھوں نے لوٹ کر منتظمین کو بتایا کہ وہ صرف کھانا کھانے لندن گئے تھے تو سب حیران رہ گئے۔

محمد رفیع مکے محمد علی کے بڑے پرستار تھے۔ رفیع کو باکسنگ کے مقابلے دیکھنے کا بہت شوق تھا اور محمد علی ان کے پسندیدہ باکسر تھے۔ 1977ء میں جب وہ ایک شو کے سلسلے میں ٹوکا گو گئے تو منتظمین کو رفیع کے اس شوق کے بارے میں پتا چلا۔ انھوں نے رفیع اور علی کی ملاقات کرانے کی کوشش کی لیکن یہ اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔

جب علی کو بتایا گیا کہ رفیع بھی گلوکار کے طور پر اتنے ہی مشہور ہیں جتنا کہ وہ ایک باکسر کے طور پر تو علی ان سے ملنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور رفیع نے باکسنگ پوز میں محمد علی کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔

موسیقار نوشاد اور لتا منگیشکر، دونوں کے ساتھ رفیع نے کافی کام کیا۔ میں نے مشہور فلمی صحافی، راجو بھارتن سے پوچھا کہ کیا رفیع کو ان کے زندہ رہتے وہ احترام مل پایا جس کے کہ وہ حق دار تھے؟ بھارتن کا جواب تھا: "شاید نہیں لیکن رفیع نے اعزاز حاصل کرنے کے لیے کبھی لابنگ نہیں کی۔ یہ دیکھ کر کہ انھیں محض پدم شری ہی مل سکا، میں مانتا ہوں کہ انھیں ان کا حق نہیں ملا۔ انھیں اس سے کہیں زیادہ ملنا چاہیے تھا۔"

1967ء میں جب انھیں پدم شری ملا تو انھوں نے کچھ وقت تک سوچا کہ اسے مسترد کر دیں۔ لیکن پھر ان کو مشورہ دیا گیا کہ آپ ایک خاص کمیونٹی سے آئے ہیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ کو غلط سمجھا جائے گا۔ انھوں نے مشورے کو مان لیا لیکن انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ پدم بھوشن کا انتظار کرتے تو وہ ان کو ضرور ملتا اور وہ یقینی طور پر اس حق دار بھی تھے۔

اس سال محمد رفیع کے انتقال کو چالیس سال ہو جائیں گے۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 1944ء میں کیا تھا۔ موسیقار نوشاد کے ساتھ ان کا قریبی تعلق تھا۔ وہ لاہور سے نوشاد کے ہی والد کا خط لے کر ان کے پاس ممبئی آئے تھے۔ 1948ء میں نوشاد نے فلم میلہ کا ایک گانا رفیع صاحب کو دیا..... 'یہ زندگی کے میلے' جو سپر ہٹ ہو گیا۔ اس کے بعد رفیع نوشاد ہی نہیں کئی موسیقاروں کے فیورٹ بن گئے۔ لیکن نوشاد کے ساتھ انہوں جو کلاسیکی نغمے گائے، ان کی کوئی مثال آج بھی نہیں ملتی۔

اس کے بعد مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے'، 'کوئی ساغر دل کو بہلاتا نہیں' اور 'آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے'، ان ڈیڑھ سو نغموں میں شامل ہیں جو انھوں نے نوشاد کے لیے گائے۔ فلم 'بیجو باورا' کے گانوں نے انھیں نئی بلندیوں پر پہنچایا۔

1977ء کے بعد محمد رفیع نے بے شمار ہٹ گانے دیے جس میں فلم 'ہم کسی سے کم نہیں' کا گانا 'کیا ہوا تیرا وعدہ' کے لیے انھیں عظیم پلے بیک سنگر کا ایوارڈ دیا گیا اور ساتھ ہی چھٹی بار فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔ اس کے بعد انھوں نے فلم یادوں کی بارات، ایمان، بیراگ، لوفر، دوستانہ، امر اکبر انتھونی جیسی مشہور فلموں میں یادگار گانے گائے۔ ◆◆◆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

زیر سرپرستی حافظ محمد شریف — قاری محمد ابراہیم میر محمدی — چیئرمین میاں محمد کاشف — مدیر سید محمد علی ہاشمی — نائب مدیر مفتی عطاء الرحمن علوی

قدیم وجدید علوم کی عظیم دینی دانش گاہ

جامعہ بلال الاسلامیہ

کے تعلیمی شعبوں میں

داخلہ جاری ہے

تعلیمی شعبے

اصولِ شریعت پروگرام

8 سالہ درسِ نظامی مع ایم اے (علومِ اسلامیہ وعربیہ)

شرائطِ داخلہ — امیدوار

1. حافظ اور پرائمری پاس ہو / مڈل یا میٹرک پاس ہو
2. ناظرہ قرآن اور لکھنے پڑھنے اور سمجھنے کی بنیادی اہلیت رکھتا ہو۔

ایڈمیشن ٹیسٹ: 18 سے 30 مارچ صبح 9 سے 2 بجے

نوٹ: میرٹ پر آنے والے طلبہ دوسری، تیسری اور چوتھی کلاس میں بھی داخل ہوسکتے ہیں۔

حفظ الکتاب سپر سیکشن

2 سے 3 سالہ حفظِ قرآن پروگرام

شرائطِ داخلہ — امیدوار

1. کم از کم پرائمری پاس ہو
2. ناظرہ قرآن اور لکھنے پڑھنے اور سمجھنے کی بنیادی اہلیت رکھتا ہو۔

ایڈمیشن ٹیسٹ: 16 مارچ صبح 9 بجے

تفصیلات کے لیے رابطہ کیجیے | صبح 8 سے 2 بجے تک

0304-5440986
0300-4603593
042-37338851

جامعہ بلال الاسلامیہ یو کے سنٹر چونا منڈی چوک اعظم کلاتھ مارکیٹ لاہور